قلمی چہرے

شورش کاشمیری

قلمی چہرے

رشحاتِ قلم

آغا شورش کاشمیری (مرحوم)

○

جمع و تدوین

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

یکے از مطبوعات

مجلس یادگارِ شورش پاکستان (کراچی)

مجلسِ یادگارِ شورش

آغا شورش کاشمیری مرحوم (۱۹۱۷ء۔ ۱۹۷۵ء) کی یاد میں ایک علمی جلسہ

کتاب : قلمی چہرے

مصنف : شورش کاشمیری

مرتب : ابو سلمان شاہ جہان پوری

ناشر : مجلسِ یادگارِ شورش۔ کراچی

طابع : الحزن پرنٹرز۔ کراچی

اشاعت : ۱۹۹۹ء

قیمت : .... روپے

ملنے کا پتا

مکتبۂ شاہد
۱/۹ علی گڑھ کالونی۔
کراچی ۷۵۸۰۰

دار الکتاب
عزیز مارکیٹ (سیکنڈ فلور)
اُردو بازار لاہور
فون نمبر: ۷۲۳۱۱۸۰

فہرست

چہرے

(آزاد ہند فوج کے آفیسروں اور نوجوانوں کے)

﴿ ۷ ﴾

انتساب

آغا شورش کاشمیری مرحوم فاران کلب انٹر نیشنل کی تاریخ

کے ابتدائی برسوں کے جلسوں کے بہترین خطیب تھے

مرحوم کی یہ تصنیف

فاران کلب انٹر نیشنل

کے اصحابِ عزم اور اہلِ ہمّت

کے نام معنون کرتا ہوں

اس قافلۂ خدمت گزارانِ اسلام وملت کے

بانی ونگرانِ اعلیٰ

محترم عبدالرحمان چھاپرا صاحب

اور

صدر نشین

محترم غلام احمد اسماعیل صاحب ہیں

نیاز مند وخدمت گزار

ابو سلمان

۲۱ر جولائی ۱۹۹۹ء

حرفِ چند

آغا شورش کاشمیری (۱۹۱۷ء۔ ۱۹۷۵ء) کا نام عبدالکریم اور ان کے والد ماجد کا اسمِ گرامی میاں نظام الدین تھا۔ ان کے بزرگ کسی زمانے میں کشمیر سے آئے تھے اور امرتسر کو انھوں نے اپنا وطن بنالیا تھا۔ ان کے والد نے لاہور میں بود و باش اختیار کرلی تھی۔ اس لیے شورش مرحوم کا پہلا آبائی وطن کشمیر اور دوسرا امرتسر اور مولد و منشائے طفولیت لاہور تھا، لیکن وہ لاہوری ہو کر بھی مشہور کشمیر کی نسبت سے ہوئے۔

شورش کاشمیری کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا، جسے بہ مشکل آذوقہ، زندگی فراہم ہوتا تھا۔ معاشی حالات کی ابتری نے انھیں میٹرک کے کمرۂ امتحان تک نہ پہنچنے دیا۔ ان کے چھوٹے بھائی یورش کاشمیری دق کے موذی مرض میں مبتلا ہوئے اور علاج کا سروسامان فراہم نہ ہونے کی وجہ سے نوجوانی تک پہنچتے پہنچتے موت سے ہم کنار ہوگئے۔ شورش مرحوم نے اپنی مکتبی تعلیم کی کمی کو اپنے شوقِ مطالعہ سے پورا کرلیا لیکن بھائی کی بے کسی اور لاچاری کی موت اور اس کی دائمی مفارقت کا داغ اپنے دل سے کبھی نہ مٹا سکے۔

شورش کاشمیری غربت میں پیدا ہوئے، مصائب و شدائد میں پلے، تحریکوں میں پروان چڑھے، ہنگاموں میں زندگی گزاری، طوق و سلاسل سے کھیلے، قید و بند کی آزمائشوں سے گزرے اور بالآخر ذوق و مزاج اور سیرت کے ایک خاص سانچے میں ڈھل کر ایک ستودہ صفات شخصیت بن گئے۔ ان میں عقیدہ و فکر اور اخلاق و سیرت کی بہت سی خوبیاں جمع ہوگئی تھیں۔ شورش مرحوم نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اس کے نشیب و فراز سے گزرے تھے، اس کے سرد و گرم سے متاثر ہوئے تھے۔ ان کی حساس طبیعت اور اخاذ ذہن نے ہر دورِ حیات اور ہر دائرۂ فکر و عمل کے اثرات کو قبول کیا تھا۔ افکار و تجربات نے ان کی زندگی کو حسین اور سیرت کو پختہ بنادیا تھا۔ ان کی زندگی بہت سی خوبیوں کا مجموعہ تھی لیکن ان میں کمزوریاں بھی تھیں۔ تضادات سے خالی نہ تھی۔ وہ کوئی واعظ و مصلح، صوفیِ صافی، صاحبِ سجادہ اور خانقاہ نشیں نہ تھے۔ وہ زاہد شب زندہ دار نہ تھے۔ ان کا شمار متقی اور پرہیزگار لوگوں کی

صف میں بھی نہ ہوتا تھا لیکن ان کی ذات ان عیوب سے یقیناً پاک تھی جن میں بہت سے دین دار مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کا کارنامہ ان سب لوگوں سے بڑا ہے۔ انھوں نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لیا، برٹش استعمار کا مقابلہ کیا اور قیامِ پاکستان تک اپنی تیس سالہ زندگی کا ایک تہائی اور عملی زندگی کا دو تہائی (اگر پندرہ برس کی عمر کو عملی زندگی سر آغاز مان لیا جائے تو) تقریباً دس برس قید یا نظر بندی کی نذر کر چکے تھے۔ صوفیہ ومشائخ اور ان کی عیش کوش اولاد کو یہ شرف کہاں حاصل ہوا تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد اٹھائیس سالہ زندگی کا دور بھی آزمائشوں سے خالی نہ تھا۔ انھوں نے پوری استقامت کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اور خواہ انھوں نے زندگی کے کسی مقام و مرحلے میں ٹھوکر کھائی ہو، لیکن انھوں نے سیاہ کو سفید کہنے سے ہمیشہ انکار کیا۔ ان کا دامن لوٹ و لالچ اور ہوس کی آلودگی سے پاک رہا۔ انھوں نے اپنے ذوق کے مطابق صحافت کو خدمت کا ذریعہ بنایا تھا اور اپنے ذہن و فکر اور قلم کی بہترین صلاحیتوں کو ملت کی تعمیر و اصلاح کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں خطابت کے جوہر سے نوازا تھا۔ وہ اپنے وقت کے بہت بڑے خطیب تھے۔ ان کی یہ صلاحیت بھی ہمیشہ ملت کی تعمیر اور اصلاح کے کام آئی۔

ایک صحافی کسی خاص علم و فن کا ماہر ہو یا نہ ہو، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسے لکھنے کا فن آجاتا ہے۔ اس کے لیے کسی موضوع کا ہونا نہ ہونا یکساں ہے۔ وہ کسی موضوع کے بغیر اور کچھ نہ آنے کے باوجود بھی لکھ سکتا ہے۔ شورش مرحوم کو صرف لکھنا ہی نہیں آتا تھا۔ تاریخ ادب، تنقید، صحافت، سوانح، شعر و شاعری وغیرہ میں مطالعہ بھی وسیع تھا اور عملی زندگی کا تجربہ بھی بہت تھا۔ وہ سرد و گرم چشیدہ تھے۔ ان کے لیے لکھنا اور بامعنی لکھنا کوئی مشکل نہ تھا۔ تصنیف و تالیف صحافت ہی کی طرح ان کا شوق اور زندگی کا ایک مستقل مشغلہ تھا۔ انھوں نے تقریباً دو درجن تصنیفات کا ذخیرہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ جو اپنی تعداد و مقدار، موضوعات کے تنوع اور تحریر و انشا کے خصائص کے لحاظ سے بہت قابلِ قدر ہے۔

سوانح و شخصیات میں اقبال، ابوالکلام، ظفر علی خاں، عطاء اللہ شاہ بخاری، حسین شہید سہروردی، میاں افتخار الدین اور دیگر شخصیات پر ان کی تصانیف، ادب میں ان کی خود نوشت اور آپ بیتی، قومی تاریخ میں آزادِ ہند فوج کی سرگزشت، تحریکِ ملی میں تحریک ختم نبوت، فنون میں "فن خطابت"، "قلمی چہرے" سیر و سیاحت میں "یورپ میں چار ہفتے"۔ اور

"شب جائے کہ من بودم" سماجیات میں "اُس بازار میں" اور شاعری میں ان کے مجموعہ ہائے کلام ادب و شعر کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ جب کوئی مورخ اور نقاد قلم اٹھائے گا تو وہ سوانح، سماجیات اور ادب کے اس سرمائے کو نظر انداز نہیں کر دے گا۔

شورش مرحوم کی بے شمار تحریریں ابھی تک ہماری دسترس سے باہر ہیں۔ یہ تحریریں روزنامہ آزاد، زمیندار، چٹان اور اس کی بندش کے زمانوں میں نکلنے والے قائم مقام جریدوں میں اور معاصر اخبارات و رسائل میں نظروں سے اوجھل ہیں۔ سب سے بڑا ماخذ ہفت روزہ چٹان ہے۔ اگر کوئی صاحب ہمت اسکالر توجہ فرمائیں تو مختلف موضوعات پر ہزاروں صفحات کا ایک عظیم الشان ذخیرہ فراہم ہو سکتا ہے۔ جس سے قومی و ملی تاریخ و تحریکات میں، سماجی، معاشرتی، تہذیبی، تعلیمی مسائل و افکار میں، سوانح و شخصیات، ادب و تنقید اور مختلف علوم و فنون میں متعدد مجموعہ ہائے مضامین مرتب کیے جا سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ "ہندوستان میں ابنِ تیمیہ" کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ کیسے کیسے ادبی جواہر پارے اور علمی فکری اور تہذیبی نادر مباحث چٹان کے صفحوں میں منتشر اور نظروں سے اوجھل تھے۔ اس کی ایک جھلک "قلمی چہرے" میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ادب کا یہ نہایت قیمتی سرمایہ ہے، جو چٹان کے اوراق ہی سے فراہم کیا گیا ہے۔ کون اندازہ کر سکتا تھا کہ اردو میں تاریخ و فن چہرہ نویسی اور خاکہ نگاری کا یہ سب سے بڑا اور نادر الوجود مجموعہ بن جائے گا۔

"چہرے" کے نام سے ایک کتاب ۱۹۶۵ء میں ہمارے دوست انور عارف نے مکتبۂ ماحول، کراچی سے شائع کی تھی۔ اس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی ترانوے (۹۳) شخصیات کے چہرے تھے۔ وہ اس کتاب کا نقشِ اوّل تھا۔ اب یہ کتاب بیاسی (۸۲) چہروں کے اضافے کے ساتھ "قلمی چہرے" کے نام سے آپ کے زیرِ مطالعہ ہے، اس کا نقشِ ثانی ہے۔

انور عارف ان چند لوگوں میں سے تھے، جنھیں شورش مرحوم کا اعتماد حاصل تھا۔ وہ اُن سے محبت کرتے تھے۔ انور عارف کو شورش سے عقیدت تھی۔ وہ شورش کے سامنے بہت کم بولتے تھے۔ ان کی رائے اور جذبات کا احترام کرتے تھے۔ لیکن وہ معاش کی طرف سے بہت پریشان تھے۔ سرمایے کی کمی نے ماحول (ہفت روزہ۔ کراچی) بند کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مکتبۂ ماحول سے چند کتابیں چھاپی تھیں۔ لیکن وہ بھی ان کے لیے کوئی اطمینان بخش ذریعہ

معاش ثابت نہ ہوا۔ بالآخر انھوں نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور انگلینڈ چلے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے اپنی بیوی اور بچوں کو بھی وہیں بلا لیا تھا۔ اب ایک مدت سے ان کی کوئی خبر نہیں ملی۔ دعا ہے کہ وہ جہاں بھی ہوں اللہ تعالیٰ انھیں بخیر و عافیت رکھے۔

انور عارف نے "چہرے" مرتب کی تھی تو راجندر پرشاد، راج گوپال اچاریہ، رادھا کرشنن، ڈاکٹر ذاکر حسین، مرزا محمد حسین وغیرہ کے چہرے اور خاکے ان کی دست رس میں نہ آسکے تھے۔ اور ایک چہرہ انھوں نے جان بوجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ یہ مولانا عبدالماجد دریابادی کا چہرہ تھا اور اس زمانے کی یادگار تھا جب مولانا سے شورش کے تعلقات خوش گوار تھے، لیکن بعد میں انھیں مولانا موصوف سے متعدد شکایات پیدا ہو گئیں تھیں۔ انور عارف نے شورش کے جذبات کے احترام میں خاموشی سے وہ چہرہ کتاب سے نکال دیا تھا۔ اس مجموعے میں نہ صرف ان تمام چہروں کو شامل کر لیا ہے، بلکہ ان کے علاوہ شورش مرحوم نے ۱۹۶۴ء کے بعد سے اپنی وفات تک جو مزید چہرے لکھے تھے اور بارہ (۱۲) چہرے جو انھوں نے آزاد ہند فوج کے آفیسرز کے ۱۹۴۶ء میں لکھے تھے، انھیں بھی شامل کر لیا ہے۔ اس طرح اس مجموعے میں ایک ایک سو پچھتر (۱۷۵) چہرے اور خاکے شامل ہیں۔ ۱۹۶۱ء کے بعد جو چہرے اور خاکے لکھے گئے تھے، وہ "قلمی چہرے" کے نام سے چھپتے رہے تھے۔ اس لیے اس مجموعے کا نام بھی "قلمی چہرے" قرار دیا ہے۔ نامور اہلِ قلم چہرہ نویسوں اور خاکہ نگاروں کے جو مجموعے چھپے ہیں، ان میں تعداد کے لحاظ سے یہ سب سے بڑا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے مطالعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ چہرہ نویسی سے شورش مرحوم کو ۱۹۴۶ء ہی میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور اس فن میں ان کی تحریر کی وہ خصوصیات جو آخری دور کی اس قسم کی تحریروں میں خاص طور سے نمایاں ہوئیں، وہ ان میں شروع ہی سے موجود تھیں۔

شورش کاشمیری ایک باریک بین صحافی تھے۔ ان کی نگاہ بہت تیز تھی۔ کسی شخص کی خوبیاں اور خامیاں ایک نظر میں بھانپ لینے کی ان میں صلاحیت تھی۔ وہ کسی شخص سے ایک دو ملاقاتوں ہی میں اس کے ذوق و مزاج اور نفسیات سے پوری طرح واقف ہو جاتے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو حسن کے مطالبے کا جواب دینا جانتے تھے۔ یہ حسن خواہ انسانی چہرے میں ہو یا سنگ تراش کے مجسمے میں، خواہ تاج محل یا شالامار باغ میں ہو۔ خواہ یہ حسنِ علم کا ہو، خواہ فکر میں یا کسی انسانی اور اسلامی سیرت میں ہو۔ وہ نگاہِ جمال آشنا اور دیدۂ حسن پرست

رکھتے تھے۔ وہ اس باب میں خویش و بے گانہ کی تفریق کے قائل نہ تھے۔ مختلف و متضاد شخصیات سے ان کی عقیدت اور ان کے لیے دل کے احترام کا راز اسی میں تھا۔ حسن جہاں اور جس میں انھیں نظر آتا تھا، اس کے اعتراف و تحسین میں ان کے قلم سے کوتاہی نہ ہوتی تھی۔ اسی طرح بدصورتی اور قبح خواہ کسی شکل میں ہو اس کے اظہار اور اس سے نفرت سے وہ اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکتے تھے۔ وہ اپنی محبت اور نفرت دونوں کے اظہار میں ایک حد تک انتہا پسند واقع ہوئے تھے۔ ان کے احساسات نہایت شدید ہوتے تھے۔

شورش کاشمیری کو زبان پر عبور تھا۔ الفاظ کا وافر ذخیرہ ان کے ذہن میں نہ صرف موجود بلکہ مستحضر تھا۔ وہ نئے نئے الفاظ کے اختراع و ایجاد کی قابلیت رکھتے تھے۔ نئی تراکیب کی تخلیق و وضع کی صلاحیت ان میں موجود تھی۔ ان کی تحریروں میں بہت سے ایسے الفاظ، تراکیب بھی ملتی ہیں، جن کی صحت کے فیصلے میں عام لغات ہماری کوئی مدد نہیں کرتے۔ ان کی صحت کا پیمانہ خود شورش کا اختیار ہے۔ ان کے قلم میں ایک بانک پن تھا۔ وہ پھول بھی برساتا تھا اور بجلیاں بھی گراتا تھا۔ وہ شگفتہ نگار بھی تھا اور شعلہ بار بھی، اس میں قوت و اثر تھا۔ وہ بے پناہ تھا۔

شورش کاشمیری ایک صاحبِ طرز ادیب اور انشا پرداز تھے۔ وہ ایک بدیہہ گو قادر الکلام اور اپنے وقت کے عظیم طنز نگار شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں طنز ہجو کا ردیف معلوم ہوتا ہے۔ بعض مقام پر یہ فرق بھی مٹ گیا ہے۔ غزل کی شاعری سے ان کا ذوق آشنا نہ تھا، لیکن نظم گوئی میں خصوصاً سیاسی شاعری میں ان کا جواب نہ تھا۔ وہ ظفر علی خاں کے بعد اس عہد کے سب سے بڑے سیاسی شاعر تھے۔ ظفر علی خاں نے انھیں اپنی رستمی کے مقابلے میں سہراب صفت تسلیم کیا ہے۔ چہرہ نویسی کے فن میں شورش کاشمیری سے قبل صرف خواجہ حسن نظامی کا نام لیا جاسکتا ہے خاکہ نگاری میں چراغ حسن حسرت، رئیس احمد جعفری اور دوسرے بہت سے نام آتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو نہ صرف سبقت کا مقام حاصل ہے، بلکہ وہ خصائص و محاسن میں بھی امتیاز کے مالک ہیں۔ شورش مرحوم کے قلمی چہرے اور خاکے ان میں اپنا خاص امتیاز اور روایت و فن کے ارتقا میں ایک مقام رکھتے ہیں۔

چند مستثنیات کے سوا تمام چہرے اپنے خدوخال کی موزونیت، نقش نگار کے تناسب، قامتِ تحریر کی زیبائی، زبان کی سادگی طرزِ نگارش کی شگفتگی، محاسن کے اظہار،

معائب کی نکتہ چینی، سراپا کی جامعیت کی مثال ہیں۔ ان میں علم و سیرت کی خوبیوں کا اعتراف بھی ہے اور کمزوریوں اور طبیعت کے کھوٹ پر چٹکیاں بھی لی گئی ہیں۔ کتاب کا ہر چہرہ اپنی شخصیت کے ظاہر کا عکس اور باطن کا آئینہ ہے۔ کوئی چہرہ نہ اپنی فرشتگی کا مدعی ہے، نہ کوئی محض شیطنت ہے۔ کوئی شخصیت معصوم نہیں۔ اپنے علم و عمل اور ذوق و سیرت میں اپنے اقران و امثال میں امتیاز رکھتی ہے۔ کوئی شخصیت حروف معائب کا مجموعہ بھی نہیں۔

مصنف کے ہاتھ میں کوئی ترازو نہ تھی کہ ہر شخصیت کے معائب و محاسن تول تول کر ان کا وزن بتادیا جاتا۔ نہ یہ ریاضی کا مسئلہ ہیں کہ حسن و قبح کی جمع تفریق سے ان کی واقعی قیمت دریافت کرلی جاتی اور نہ سائنس کا کوئی نظریہ کہ لیبارٹری کے عمل سے اس کی سچائی کو دریافت کرلیا جاتا۔ مصنف نے ہر شخصیت کو اپنے نقطۂ نظر سے پرکھا ہے۔ یہ اس کے محض احساسات اور مطالعے کے تاثرات ہیں جو کسی ایک "محبت میں یا مدت کے راہ و رسم اور مشاہدے سے ذہن پر نقش ہو گئے تھے۔ انھیں کسی ترازو میں نہ تولا جاسکتا ہے، نہ کسی پیمانے سے ان کو ناپا جاسکتا ہے۔ ان میں اگر کہیں اونچ نیچ پیدا ہو گئی ہے اور قلم نے کہیں حدود سے تجاوز کیا ہے تو یہ صاحبِ تحریر کا نقص نہیں، اس کا تاثر ہے۔ اس کے کم و بیش پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔ آپ اپنے ذوق و نظر اور مطالعہ و رائے کے مطابق اس سے اتفاق کر سکتے ہیں اور کلیتاً رد کر دینے کا حق بھی رکھتے ہیں۔

چہرہ نویسی اور خاکہ نگاری نہ تاریخ ہے، نہ تذکرہ اور نہ شمائل نویسی۔ ہم کسی خاکے یا چہرے کے مطالعے سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، خاکے کے حسن و قبح پر بحث کر سکتے ہیں، صاحبِ تحریر کے ذوق و نظر اور اس کے تاثرات کے بارے میں رائے قائم کر سکتے ہیں، لیکن کسی چہرے یا خاکے کی شخصیت کے اخلاق و سیرت اور شمائل کے بارے میں صرف خاکے کی روشنی میں یا اس کے چہرے کو پڑھ کر خوب و زشت کا فیصلہ نہیں کر دے سکتے۔

چہرہ خاکہ نگاری میں کسی شخصیت کے علمی و فنی مطالعے اور اخلاق و سیرت کے تحقیقی مشاہدے سے زیادہ موڈ اور جذبات کے وقتی جوش و ہیجان کو دخل ہوتا ہے۔ بعض اوقات شاعرانہ اور صحافیانہ مزاج کی کمزوریاں بھی جو رفتہ رفتہ خاکہ نگار کی طبیعت ثانیہ بن چکی ہوتی ہیں، کسی خاکے کے لیے سر و سامان مہیا کرتی ہیں۔ اس وقت صاحبِ تحریر کے ہاتھ میں متوازی ذہن کے مصنف، منصب مزاج نقاد اور حقیقت پسند اور قطعاً غیر جانب دار مورخ کا

قلم نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک مخالف، نکتہ چین، عیب جو یا محض عقیدت کیش بلکہ پرستش کرنے والے شخص کا قلم ہوتا۔ بعض اوقات تعلقات تعصبات اور مصالح بھی غیر محسوس طور پر تحریر میں اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر کا قلم افراط و تفریط، انتہا پسندی، تعصب جذبہ داری یا محبت و عقیدت کے الزام سے بچ نہیں سکتا۔ بعض اوقات مطالعے کی کمی، معلومات کا نقص، مشاہدے کی کوتاہی یا کسی خاص علم و فن سے عدم دلچسپی اور بے ذوقی بھی صاحبِ قلم کو جاء حق و اعتدال سے دور کر دیتی ہے۔ یہ باتیں صاحبِ قلم کی رائے کے نقص اخلاص کی کمی یا نیت کے فتور کو ظاہر کرتی ہیں، خاکے کی خامی کو نہیں: ایک چہرہ یا خاکہ حقیقت کے خلاف، واقعات کے بر عکس اور جھوٹ ہو کر بھی عمدہ چہرہ یا خاکہ ہو سکتا ہے۔ اور کوئی چہرہ اور خاکہ صحیح معلومات پر مبنی ہو کر بھی ضروری نہیں کہ فن کے لحاظ سے وہ ایک اچھا چہرہ یا خاکہ ہو! کسی چہرہ یا خاکے کی عمدگی کا معیار معلومات کی صحت، رائے کی صباحت، فیصلے کی درستگی، قلب کا اخلاص نہیں ہوتا۔ بلا شبہ یہ اس کی اضافی خوبی تسلیم کی جائے گی۔ چہرہ نویسی اور خاکہ نگاری الگ الگ فن ہیں ان کے اصول و مقتضیات الگ ہیں۔ کوئی موضوع شخصیت جو چھریرے بدن یا گداز جسم کی مالک ہے، وہ موٹی ہے یا دبلی اس کا قد چھوٹا ہے یا لمبا، اس کا چہرہ کتابی ہے یا بیضوی، اس کی پیشانی کشادہ ہے یا تنگ، آنکھیں بڑی ہیں یا چھوٹی، آواز باریک یا بلند، وہ کم گو ہے یا باتونی، وہ سنجیدگی کی تصویر ہے یا تیز و طرار؟ یہ اس کی خوبیاں ہیں نہ خامیاں! ان سب کے نقص و خوبی کا مدار ان کے لیے صفات و متعلقات کے استعمال پر ہوتا ہے۔ یہ صاحبِ قلم کا کمال ہے کہ وہ عیب کو ہنر اور ہنر کو عیب بنا دے۔

شورش مرحوم کے قلمی چہروں سے عیب و ہنر اور اس کے برعکس کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ بعض دوستوں نے ان پر انتہا پسندی، تعصب، حدود سے تجاوز اور تعلقات اور وقت کے بعض حالات سے متاثر ہو جانے کا الزام بھی لگایا ہے۔ بعض افراط و تفریط کی طرف پروفیسر محمد سرور مرحوم نے بھی اشارہ کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا: شورش مرحوم نے کوئی تاریخ کسی کے سوانح یا تذکرہ و شمائل نہیں لکھے تھے، خاکہ لکھا تھا۔ خاکے کے حسن و قبح کا معیار تاریخ و سوانح اور تذکرہ و شمائل سے الگ ہوتا ہے۔ مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ایک بات مجھے عرض کر دینی چاہیے، تاکہ غلط فہمی نہ ہو۔ وہ یہ ہے کہ چہرہ کشی، خاکہ نویسی اور مضمون نگاری الگ الگ فن اور جدا جدا ان کے اصول و مقتضیات ہیں۔ شورش مرحوم کی

تمام تحریریں جو "قلمی چہرے" میں شامل ہیں، قلمی چہرے کے ذیل میں نہیں آتیں۔ بعض چہرے قلمی خاکے بھی ہیں اور بعض خاکے چہرہ صفت! کچھ خاکے مضمون کی حد تک طویل اور تفصیلات کے جامع ہیں۔ "چہرہ" ان مضامین کی ایک مزید خوبی ہے۔ گویا اس مجموعے میں تینوں قسم کی تحریریں نہیں، بلکہ تینوں صفات کی حامل تحریریں ہیں۔ ادب و تنقید میرا موضوع نہیں ہے۔ یہاں جو کچھ لکھا گیا، وہ سب کچھ لکھنے کا میرا کوئی ارادہ نہ تھا، لیکن لکھتے ہوئے جو خیالات دل میں موج زن ہوئے، انھیں لکھنے سے قلم روک بھی نہ سکا۔ یہ فیصلہ میں نہیں کر سکتا کہ جو کچھ قلم سے نکلا ہے، اس کی کوئی قیمت بھی ہے؟ اگر اس میں کام کی کوئی بات ہو اور قارئینِ محترم کو پسند آئے تو میں ان کا شکر گذار ہوں گا اور اگر بے معنی خیالات نے سوادِ تحریر کی شکل اختیار کر لی ہے تو اسے نظر انداز کر دینا چاہیے۔ ان کی لطف اندوزی اور ذوق کی تسکین کے لیے "قلمی چہرے" ہیں۔ ان کی خصوصیات اور بعض حسن و قبح کے بیان میں، نیز شورش مرحوم کے ذہن اور ذوق و فکر کے کمال اور ان کی تحریر کے خصائص و محاسن کے تعارف میں پروفیسر محمد سرور مرحوم کا "پیش لفظ" کفایت کرتا ہے۔ یہ پیش لفظ "چہرے" کے لیے لکھا گیا تھا، لیکن قلمی چہروں؏ کے اِس مجموعے پر بھی اُسی طرح منطبق ہوتا ہے۔ اس لیے جو امور "پیش لفظ" میں زیرِ بحث آچکے تھے، ان تک بحث کو دراز نہیں کیا ہے۔

امید ہے کہ آغا شورش کاشمیری مرحوم سے عقیدت کا رشتہ رکھنے والوں میں اور شائقینِ ادب میں اس مجموعے کو پسند کیا جائے گا۔

ابو سلمان شاہ جہان پوری

پیش لفظ

پروفیسر محمد سرور

شورش صاحب بحیثیت ایک صاحبِ طرز ادیب، ایک شعلہ بیان خطیب، ایک نکتہ داں شاعر اور ایک شاندار ماضی رکھنے والے سیاست داں اتنے مشہور و معروف ہیں کہ ان کی کسی کتاب پر مجھ جیسے گمنام کا بطور تعارف کے کچھ لکھنا، بڑا عجیب سا لگتا ہے، لیکن ایک چیز جس کی وجہ سے میں اپنے آپ کو اُن پر کچھ لکھنے پر آمادہ پاتا ہوں، وہ یہ ہے کہ میں شورش صاحب کو اس زمانے سے جانتا ہوں جب پہلے پہل انھوں نے سیاسیات کی عملی زندگی میں قدم رکھا تھا اور آج جب کہ اس واقعے کو تقریباً ستائیس اٹھائیس سال ہو رہے ہیں، میں اس تمام عرصے میں نہ صرف اُن کی اس سیاست کا معترف و مداح رہا ہوں، بلکہ اس سیاست کے ساتھ ساتھ خطابت و شعر میں ان کو جو ممتاز مقام ہے، میں اس کا بھی دل سے قدر داں ہوں۔ پھر میری یہ بھی خوش قسمتی ہے کہ اپنی بے بضاعتی کی وجہ سے اُن کی اس طویل ادبی و سیاسی زندگی میں میں کبھی اُن کا حریف نہیں رہا۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ میں بہت حد تک شورش صاحب کو بہ لحاظ ایک انسان، سیاست دان، ادیب و خطیب اور شاعر کے غیر جانب دار رہ کر دیکھ سکتا ہوں۔ اُن کی خوبیاں اور کوتاہیوں کا صحیح تجزیہ کر سکتا ہوں اور صدق دل سے انھیں خراج تحسین بھی پیش کر سکتا ہوں۔

پنجاب کے جس تاریخی عہد میں شورش صاحب نے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کیا، آج ہم میں سے اکثر اس کا تصور تک نہیں کر سکتے بے شک! دور میں اس سرزمین میں جسے ایک دفعہ قائداعظم مرحوم نے برصغیر ہندوپاک کا سب سے بڑا افسر زدہ صوبہ کہا تھا سیاسی ہماہمی ضرور پائی جاتی تھی۔ لیکن عملاً سیاسی وقار صرف انھی کو نصیب ہوتا تھا جو تقربِ سلطان کی

نعمت سے سرفراز ہوتے۔ چناں چہ بارگاہ سلطانی سے جو زیادہ قریب ہوتا، عوام خواہ نہ سہی۔ لیکن بااثر رائے عامہ کے نزدیک اسے ہی زیادہ معتبر سمجھا جاتا اور اسی کی صحیح معنوں میں عزت ہوتی اور یاد رہے کہ ان دنوں اس سرزمین کا "سلطان" انگریز تھا۔ اس کی بارگاہ کے مقربین کا سلسلہ سروں سے شروع ہوکر

"خان صاحبوں اور سفید پوشوں"۔

پر ختم ہوتا تھا اور "باوقار" سیاست انہی کی اجارہ داری تھی۔

اس دور میں ہمارے اونچے طبقوں قبلہ مقصود اکثر و بیشتر "تقرب سلطان" تھا۔ وہ خلوص دل سے اسے نہ صرف اپنی اغراض بلکہ قوم کے مفادات کی تکمیل کے لیے بھی ایک مؤثر ذریعہ سمجھتے تھے۔ اعلیٰ متوسط طبقے کے لیے برطانوی حکومت نے ترقی کے کافی مواقع فراہم کررکھے تھے اور وہ تعلیم پاکر افسریاں اور مناصب حاصل کرنے کی تگ و دو میں بڑی مستعدی سے لگا ہوا تھا۔ دیہات کے عوام برادریوں کے شکنجے میں گرفتار بڑے زمینداروں اور پولیس کے مظالم سہہ سہہ کر بے حس ہوگئے تھے۔ لے دے کے شہروں کا ایک مختصر سا نچلا متوسط طبقہ تھا جس میں مذہب کا اجتماعی و سیاسی شعور [illegible] تا تھا۔ اس نے اسے برطانیہ کے سامراج کا جذباتی طور پر شدید ترین دشمن بنادیا تھا۔

شورش صاحب جب سیاست میں آئے تو یہی طبقہ ان کا اولین مخ[illegible]ب تھا [illegible] کے حوصلہ مند اور جوشیلے نوجوان اُن کے دست و بازو اور اُن [illegible] کہنے والے تھے۔ اس طبقے کے عزم و ہمت، اس کے دل خلوص و ایقان۔ اس کی جرات و جواں مردی [illegible] آتشِ نمرود میں اس کے بے دھڑک کود جانے کے جذبے کی شورش صاحب کے اس زمانے کی سیاست اور آج کے ادب و شعر و خطابت پر ایک گہری چھاپ لگی ہے،

جو شورش صاحب کی شخصیت کے لیے ایک لازمہ بن گئی ہے۔ اب وہ خواہ کتنی بھی کوشش کریں اُن کا قلم اور ان کی زبان اس چھاپ کے اثر سے نہیں نکل سکتی۔

شورش صاحب کے ہفت روزہ "چٹان" کو اُن کی موجودہ سیاسیات سے اختلاف رکھنے کے باوجود لوگ اس چھاپ کی وجہ سے اس ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور اُن کی خطابت اور اُن کے اسلوبِ تحریر جس میں اس بنا پر آج بھی اتنی قوت اور جان ہے۔ بلکہ اگر کوئی بُرا نہ

مانے تو میں یہ کہوں گا کہ وہ شورشِ جس کی تقریر و تحریر آج بھی ہم میں سے اکثر کے دلوں کو گرماتی اور سننے اور پڑھنے پر مجبور کرتی ہے اسی چھاپ والا شورش ہے کہ خواہ وہ کتنی بار بھی "مرحوم" ہو، وہ کبھی مرحوم نہیں ہوگا اور اسی چھاپ کے اثرات اسے اپنے تسلط سے کبھی باہر نہیں نکلنے دیں گے۔

آج سامراج مردہ باد کے نعرے لگانا بڑا آسان ہے، لیکن جس زمانے میں شورش صاحب نے اس صوبے کی مشہور سامراج دشمن سیاسی پارٹی کا ساتھ دیا، اس وقت سامراج

☆ مردہ باد کہنے والے کو

☆ قید و بند میں جانا پڑتا تھا۔

☆ اپنے اس پر ہنستے تھے۔

☆ اس کی بے مائیگی اور سبک سری کا مذاق اڑاتے تھے۔

☆ اسے فرومایہ اور بے وقار سمجھا جاتا تھا۔

☆ اور اچھی محفلوں میں اس کا نام لینا گھٹیا پن کی دلیل تھی۔

اس کے علاوہ چوں کہ یہ سامراج دشمنی ایک طرح سے اس صوبے میں بنیاد دشمنی بھی ہو جاتی تھی اس لیے غیر مسلم "قوم پرست" طبقے مسلمانوں کی اس سامراج دشمنی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور ان کے بجائے وہ مسلمان "سرکار پرستوں" کی طرف عموماً زیادہ مائل رہتے تھے کیوں کہ باوجود آپس کے سیاسی اختلافات کے ان دونوں کے معاشی و سماجی مفادات ایک سے تھے۔ چناں چہ جب بھی وہ باہم مل بیٹھتے تھے، ان میں فرق کرنا بڑا دشوار ہوتا۔

شورش صاحب کی سیاست، خطابت، ادب اور انشا نے پنجاب کے اس عجیب و غریب ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ طبعاً اقتدار دشمن تھے۔ اسی نے ان کو سامراج دشمن بنایا، اُن کے اندر جذبات کا "ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا، قدرتاً اس سامراج دشمن ...جدوجہد میں وہ بروئے کار آیا اور پہلے پہل خطابت اور اس کے بعد نثر و نظم میں اسے اپنا زور تموج دکھانے کا موقع ملا۔ آپ میں سے بہتوں نے سنگلاخ چٹانوں کے ساتھ سمندر کی ...کو ٹکراتے دیکھا اور اس سے جو ہیبت ناک آوازیں نکلتی ہیں، وہ بھی سنی ہونگی۔ شورش ...حب کے اندر جذبات کا جو ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا، جب وہ سیاسی زندگی میں آئے اور اس

سمندر میں زبردست تموج پیدا ہوا تو اس سے اٹھنے والی لہروں کو بھی تاریخِ پنجاب کے اس دور میں کچھ اسی قسم کی سنگلاخ چٹانوں سے واسطہ پڑا۔

شورش صاحب کی خطابت اور نثر و نظم میں ایک طرح کی جو انتہا پسندی، تیزی اور کٹاؤ ہے وہ اسی دور کی یادگار ہے، لیکن چوں کہ وہ محض سیاسی خطیب نہ تھے، بلکہ ادب و شعر سے انھیں فطری لگاؤ تھا اور دوسرے شعرا و ادبا سے کہیں زیادہ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کو پڑھا اور ان کے اثرات کو اپنے اندر سمویا تھا اس سے اُن کی اس انتہا پسندی، تیزی اور کٹاؤ میں ادبی چاشنی بھی آگئی ہے اور ان کی گالیاں بھی پڑھنے والوں کو زیادہ بے مزا نہیں کرتیں کیوں کہ وہ ان سے ادبی لحاظ سے ایک حد تک محفوظ ہو سکتے ہیں۔

شورش صاحب کی شاعری کے بارے میں میں کچھ زیادہ نہیں کہہ سکتا۔ جہاں تک خطیب شورش کا تعلق ہے آج بھی ان کی خطابت میں یہ کشش ہے کہ مغربی پاکستان کے کسی شہر میں اس امر کی اطلاع ملنے پر کہ جلسے میں شورش صاحب تقریر کریں گے ہزارہا ہزار آدمی جمع ہو جاتے ہیں اور پھر شورش صاحب ہوتے ہیں اور یہ مجمع!

☆ چاہیں تو اسے ہنسائیں

☆ چاہیں تو اسے رلادیں

اگر اسے جوش میں لانا مقصود ہو تو ان کے الفاظ تلوار سے بھی زیادہ تیز اور سہ آتشہ شراب سے بھی بڑھ تلخ ہو جاتے ہیں۔ اور جب وہ مخالفین کا خاکہ اڑانے پر اتر آتے ہیں تو گویا لطیفوں، چٹکلوں، طنزیات اور تعریضات کا ایک سیلاب پھٹ پڑتا ہے، جس میں پورا مجمع بہہ جاتا ہے۔ شورش صاحب نے اپنی خطابت میں مولانا ابوالکلام آزادؒ اور مولانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری دونوں کی خطابت کی روایات اور اسالیب کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ کامیاب ہیں۔

اب رہی شورش صاحب کی نثر نگاری۔ اس میں جس چیز نے انھیں اپنی ایک خاص طرز کا مالک بنایا ہے، وہ اُن کا خطیبانہ اسلوب بیان ہے۔ اُن کی تحریر میں ان کی خطابت کی سی روانی، تیزی اور زور ہے اسے پڑھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کو لکھتے وقت الفاظ کے لیے مطلق کاوش نہیں پڑتی۔ بس قلم سے اس طرح حروف نکلتے آتے ہیں جیسے زبان سے

الفاظ! ان کی تحریر میں بلا کی آمد ہے اور اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے لیے جب وہ قلم ہاتھ میں لیتے ہیں تو گویا بہتر سے بہتر الفاظ از خود صف بستہ ہوتے جاتے ہیں۔ شورش صاحب جس طرح بے تکان بولتے ہیں اسی طرح وہ بے تکان لکھتے ہیں۔ اُن کی خطابت کی طرح اُن کی تحریر میں بھی کہیں جھول یا آورد نہیں۔ ان کے پاس الفاظ کا ایک وسیع ذخیرہ ہے۔ بے شک ایک ادیب کے لیے یہ ایک بڑی خوبی ہے، لیکن شورش صاحب میں اس کے علاوہ ایک اور خوبی یہ بھی ہے تو وہ ہر موقع و محل کے لیے مناسب اور موزوں الفاظ انتخاب کرنے کا بڑا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں۔ یعنی اُن کے ہاں فصاحت بھی ہے اور بلاغت بھی، اور وہ دونوں سے کام لینا بھی جانتے ہیں۔

شورش صاحب کی تحریروں کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان میں جو مواد ملتا ہے وہ انھوں نے اپنی طویل سیاسی زندگی کے گوناگوں تجربات سے جمع کیا ہے۔ آج ہمارے ہاں شاید ہی کوئی ایسا صاحبِ قلم ادیب ہو جسے اپنی سیاسی زندگی میں اس طرح کے گھمبیر سیاسی تجربات سے سابقہ پڑا ہو، وہ سیاسی زندگی میں اتنی بلندیوں اور پستیوں سے گزرا ہو۔ اور اس کا اس قدر مختلف الخیال اور کثیر التعداد سیاسی زعما اور کارکنوں سے اتنا قریب ترین رابطہ رہا ہو یہ عجیب و غریب تجربات اور پھر شورش صاحب کا قلم! چناں چہ جب وہ انھیں بیان کرتے ہیں تو اس میں وہ تمام تلخیاں اور مایوسیاں دل شکنیاں اور ساتھ ہی رنگینیاں اور دل بستگیاں بھی آجاتی ہیں جو خود ان تجربات میں موجود تھیں۔ اور اس پر مستزاد ان سب شخصیتوں کے بارے میں وہ خصوصی معلومات بھی جو ان کے قریبی رفیق کار ہونے سے ہی ہو سکتی تھیں۔

اس مختصر کتاب میں قارئین کو شورش صاحب کے ادب و انشا کی جملہ خوبیاں ملیں گی۔ چھوٹے چھوٹے فقرے صاف و سلجھا ہوا انداز بیان کسی قسم کی رورعایت اور پیچیدگی کے بغیر ایک عظیم سے عظیم شخصیت کے بارے میں اپنے اچھے یا برے تاثرات کا صاف اظہار پھر چبھتے ہوئے جملے اور چند نپے تلے الفاظ میں پوری شخصیت کا ظاہری اور معنوی حدود اربعہ کا بیان!

شورش صاحب کے ان شخصیتوں کے متعلق یہ تاثرات کہاں تک مبنی بر حقیقت

ہیں، یہاں اس بارے میں مجھے کچھ نہیں کہنا۔ شورش صاحب غیر جانبدار اور معروضی بہت کم ہی ہوتے ہیں۔ یہ چہرے دراصل ان شخصیتوں کے متعلق شورش صاحب کے ذاتی تاثرات ہیں اور بس ان میں آپ حقیقت واقعی کو زیادہ تلاش نہ کریں۔ ایک فن کار نے ان شخصیتوں کو اپنے مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھا اور اسے وہ جیسی نظر آئیں اس نے اپنے موئے قلم سے ان کے خاکے کھینچ دیے۔ ان خاکوں کی حقیقت پسندی سے آپ کو اختلاف ہو سکتا ہے اور لازماً ہوگا لیکن یہ چہرے ہیں بڑے دل کش! اس سے آپ انکار نہیں کریں گے۔

مولانا ابوالکلام آزاد، شورش صاحب کے ممدوح بلکہ ایک لحاظ سے اُن کے آئیڈیل ہیں اور بقول اُن کے انھوں نے قلم وزبان کے سیاسی سفر میں جو کچھ بھی حاصل کیا وہ رہنماؤں میں 'ابوالکلام آزاد' اور کتابوں میں 'ترجمان القرآن' سے حاصل کیا ہے وہ یہ تسلیم کرتے ہیں۔

"جب میں نے ہوش سنبھالا ہے۔ مولانا ابوالکلام سے میری عقیدت کا رشتہ استوار ہے، اور اس میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی ہے"۔

لیکن ان تمام باتون کے باوجود، شورش صاحب کی طبقاتی حس پر مولانا ابوالکلام آزاد کی طبیعت کا وہ انداز جس نے انھیں بہت حد تک خلوت پسند اور عوام سے احتراز کرنے والا بنادیا ہے، گراں گزرتا ہے، اور وہ مولانا سے اپنی تمام پر خلوص اور غیر متزلزل عقیدتوں کے ساتھ ساتھ اُن کے بارے میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے:

"مزاج کے اعتبار سے تاناشاہ، یعنی اُن کے قالین پر بال ہو، اور وہ اُن کو چھو جائے، یا آپ کی آواز میں حسن نہ ہو اور آپ الفاظ کی نوک پلک کا خیال کیے بغیر اُن کے سامنے بولنے لگیں تو انھیں فوراً نزلہ ہونے لگتا ہے"۔

واقعہ یہ ہے کہ شورش صاحب اس طبقے کے جس میں وہ پیدا ہوئے اور جس کی سماجی اور ذہنی فضاؤں میں انھوں نے ہوش سنبھالا، اس کے سچے نمایندے ہیں اور اس کا اظہار ان کے اسلوب تحریر میں ہر جگہ ہوتا ہے، چناں چہ اسی بنا پر وہ اپنے ممدوح اور آئیڈیل کی بالانشینی معاف نہیں کرتے اور اس کے متعلق ایک آدھ چبھتا ہوا جملہ کہنے سے باز نہیں رہتے۔

عنفوانِ شباب میں شورش صاحب پر ایک خاص طرح کی جو گہری چھاپ لگی، اس

کا ذکر کا اوپر آچکا ہے۔ اس چھاپ کے اجزا میں سے ایک تو پنجاب کے شہروں کے نچلے متوسط طبقے کی عوامیت تھی، دوسرے برطانوی استعمار سے غلو کی حد تک دشمنی اور حسن اتفاق سے ملونی ملی مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا ظفر علی خان کی روایات ادب وانشا کی۔ اس کے علاوہ اس چھاپ کا ایک اہم جز قریب قریب منطقی قسم کی مبازنت پسندی اور مبارزت طلبی بھی تھا جس کا وقتاً فوقتاً بھی شورش صاحب کی تحریروں میں کہیں کہیں اظہار ہو جایا کرتا ہے۔

شورش صاحب ایک زمانے میں سیاسیات کے جس مکتبہ خیال سے وابستہ رہے ہیں، وہ علامہ اقبال کی اسلامیت، علیت اور ان کی شاعری کا دل سے ہمیشہ مداح رہا۔ لیکن ان کا عمل یا صحیح الفاظ میں ان کی "بے عملی" اس مکتبِ خیال کو برابر کھلتی رہی۔ شورش صاحب "اقبال پرستی" سے اس دور میں ہی علامہ کے بارے میں اس زمانے میں ان کا جو تاثر تھا اسے بیان کرنے سے نہیں جھجکتے۔ اور سید عطاء اور شاہ صاحب کی زبان سے انھوں نے اپنے دل کی بات صاف صاف یوں کہہ دی:

"اقبال کا قلم تمام عمر صحیح رہا۔ اور قدم اکثر و بیشتر غلط۔"

اب شاہ صاحب قبلہ کی اس رائے پر شورش صاحب کا حاشیہ ملاحظہ ہو:

"لیکن ان کا یہ خیال کچھ جچتا نہیں۔ کیوں کہ اقبال نے کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ وہ یا تو پکارتا رہا یا للکارتا یا پھر پھریرے کی طرح لہراتا رہا"۔

بے شک شورش صاحب نے قائد اعظم کو بھی بڑے صدق دل سے خراج تحسین پیش کیا، ہے لیکن محترمہ فاطمہ جناح پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا شمار اُن کے بہترین ادبی شہ پاروں میں کروں گا۔ اس میں خلوص، عقیدت اور ادبیت سب کچھ ہے۔

اسی طرح شورش صاحب نے علامہ اقبال کے "ذہنی رفیق" "جگری دوست اور علمی بازو چودھری محمد حسین سے بھی اپنے عقیدت مندانہ خلوص کا اظہار بڑے پر جوش طریقے سے کیا ہے۔ اصل سے بڑھ کر اصل سے نسبت رکھنے والی شخصیت کے بارے میں اس طرح لکھنا ظاہر ہے اس رجحان کی آئینہ داری کرتا ہے جس کا تعلق شورش صاحب کے سیاسی ماضی سے ہے۔

ان چہروں میں شورش صاحب نے بعض شخصیتوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔

اور اس سلسلے میں میرے خیال میں سب سے زیادہ بے انصافی "بابائے اردو" مولوی عبدالحق سے کی گئی ہے۔ جو اس وقت جب ان کا "چہرہ" لکھا گیا زندہ تھے اور اب مرحوم ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب کی بعض مخصوص پسندیدگیوں اور ناپسندیدگیوں کی وجہ سے نہ صرف غیر منقسم ہندوستان میں بلکہ آزادی کے بعد خود پاکستان میں بھی اردو کے "کاز" کو بڑا نقصان پہنچا، لیکن ان کوتاہیوں کے ساتھ ساتھ مولوی صاحب کی اردو زبان سے غیر معمولی لگن اور اس کی نشر و اشاعت اور ترقی کے لیے ان کا عمر بھر "جتی ستی" رہنا اور شبانہ روز محنت کرنا اس ضمن میں بھی شورش صاحب اس کا ذکر کر دیتے تو ان کی بے انصافی کم ہو جاتی۔

ایک "چہرہ" خان عبدالقیوم خاں کا ہے اور اس کا خاکہ شاید اس وقت تیار ہوا جب موصوف اپنے عروج پر تھے۔ دیکھیے شورش صاحب نے ایک مختصر سے جملے میں ان کی "عظیم" شخصیت کا کتنا اچھا تجزیہ کر دیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"وہ ایک کوہستانی ڈھول ہے۔ اور دور کے ڈھول ہمیشہ سہانے ہوتے ہیں"۔

یہ تجزیہ نہیں بلکہ مصنف کی پیشین گوئی بھی ہے جو بعد میں کسی قدر سچی ثابت ہوئی۔ مولانا ظفر علی خاں پر شورش صاحب ایک سند کی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے ان کے چہرے میں اجمالاً وہ تمام رنگ آگئے ہیں جو مولانا مرحوم کی شخصیت میں خاص طور پر نمایاں تھے۔ مولانا کے بارے میں شورش صاحب کا یہ جملہ کتنا صحیح ہے کہ

"ہمارے ماضی کے خلاف سامراج تاریخ کا نام ظفر علی خان ہے، اور پھر جو کچھ بھی ہے وہ اپنی تمام وسعت و قوت کے باوجود حد کی چیز ہے" پنجاب کی کتنی بڑی خوش قسمتی ہوتی اگر یہ تاریخ مسلسل ارتقاپذیر رہتی"۔

یقیناً مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا "چہرہ" بڑا جامع ہے، لیکن اس کی ترتیب میں ایک آدھ جگہ افراط و تفریط جھلکتی ہے۔ مثلاً شورش صاحب کا یہ کہنا کہ

"(ان کا) دماغ بھی متوازن ہے۔ دل بھی متوازن اور قلم بھی متوازن ہے"۔

محل کلام ہے۔ اگر اس توازن سے مراد محض ظاہری استدلال منطقی کا توازن ہے تو یہ بہت حد تک صحیح ہے۔ دماغ اور دل کے متوازن ہونے کے لیے ایک لازمی شرط ہے کہ دونوں میں ماضی کی روایات، حال کی ضروریات اور مستقبل کی توقعات میں صحیح توازن ہو اور

ان کی نظر میں یہ ایک [illegible] راستے کی مسلسل منزلیں ہوں۔ میرے نزدیک مولانا کے ہاں ایک حد تک اس انداز فکر و قلبی کی کمی ہے۔ اور شورش صاحب نے بھی [illegible] ایک جگہ یہ اعتراف کیا ہے کہ [illegible] اپنے نظریات میں انتہا پسند ہیں دوسرے شورش صاحب کا یہ ارشاد کہ۔

"جو عجز ان (مولانا ابو الاعلیٰ مودودی) میں ہے، وہ ان کے ساتھیوں نہیں"۔

اس میں بھی قدرے مبالغہ ہے۔ بے شک مولانا موصوف میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ لیکن اگر شورش صاحب کے نزدیک "عجز" کا ہونا بھی ان کی ایک خوبی ہے،۔ تو آپ یقین کریں کہ یہ خوبی ان میں سرے سے موجود نہیں ہے۔ باقی مولانا کے بارے میں شورش صاحب کی یہ رائے کہ

اگر وہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نہ ہوتے تو یہ ہوتے، وہ ہوتے وغیرہ

مجھے اس حصے سے بھی اختلاف ہے۔ مولانا موصوف میں سید حسن سے کہیں زیادہ طبیعت کی سنجیدگی اور اپنے مقاصد سے وابستگی، مولانا مہر سے بڑھ کر اپنے معتقداتِ دینی و سیاسی سے وفاداری اور استواری اور پریم چند سے کہیں زیادہ وسعتِ علم و نظر ہے۔ اور شورش صاحب کا اس تقابلی شخصیات میں مولانا مودودی کے ساتھ نسیم حجازی کا بھی ذکر کرنا ان کی کھلی زیادتی ہے۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی شخصیت میں ان سب سے کہیں زیادہ عمق اور وسعت ہے۔ اور اس سے بڑھ کر ان کی جرأتِ گفتار اور جرأتِ کردار کا تو کیا کہنا، اس معاملے میں تو شاید ہی ہماری کوئی دینی و سیاسی شخصیت ان کے مقابلے میں لائی جا سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

ابو الکلام آزاد

"میرا خیال ہے جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے مولانا ابو الکلام آزاد سے میری عقیدت کا رشتہ استوار ہے اور اس میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے راہنماؤں میں سب سے زیادہ محبت انھی سے کی ہے۔ قید خانے میں مجھ سے یوسف مہر علی نے پوچھا اگر تمھیں راہنماؤں میں سے ایک رہنما منتخب کرنے کے لیے کہا جائے اور کتابوں میں سے کوئی ایک کتاب، تو تم کس کا انتخاب کرو گے ؟ میں نے لحظہ توقف کیے بغیر جواباً کہا تھا : "رہنماؤں میں ابو الکلام آزاد اور کتابوں میں "ترجمان القرآن"! میری زندگی ان دونوں سے متاثر ہے اور میں نے قلم وزبان کے سیاسی سفر میں جو کچھ بھی حاصل کیا وہ انھی کی بدولت ہے"۔

مجھے اپنی بست سالہ سیاسی زندگی میں ہر مکتبِ خیال کے رہنما کی معیت میں کچھ عرصہ رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ بعضوں کو میں نے نزدیک سے دیکھا ہے اور بعض کو قریب سے سنا ہے۔ لیکن ابو الکلام آزاد سب میں آگے اور سب سے الگ ہیں۔ اُن کی بات چیت اتنی شستہ ورفتہ ہوتی ہے کہ کوثر و تسنیم کی لہریں نچھاور ہوتی ہیں۔ اور لہجہ اتنا پیارا کہ الفاظ اس کی تاثیر بیان کرنے سے معذور ہیں۔ وہ واقعی ابو الکلام ہیں، جو کچھ بولتے اور جو کچھ لکھتے ہیں اس سے انسان کا ذہن پرسش کی طرف نہیں بلکہ پرستش کی طرف جاتا ہے وہ الفاظ کو رشید احمد صدیقی کے الفاظ میں الوہیت کا جامعہ پہناتے ہیں۔

حالات سازگار ہوتے تو وہ جمہوریۂ ہندوستان کے پہلے صدر ہوتے۔ لیکن اب وہ کوثر و تسنیم کی ایک ایسی لہر ہیں جو گنگ و جمن کی لہروں کے ساتھ بہہ رہی ہے۔ عربوں میں ہوتے تو ابن تیمیہ ہوتے، ہندوؤں میں ہوتے تو اب تک اُن کے بت پجتے ہوتے لیکن وہ مسلمانوں میں تھے اس لیے ان کے حصے میں وہ سب کچھ نہیں آیا ہے جس سے علمائے امت کی جبینیں لبریز ہیں۔

مسلمانوں میں جتنی گالیاں ابو الکلام کو دی گئی ہیں، غالباً تاریخِ انسانی میں اتنی گالیاں

سی اور کو نہیں ملی ہیں۔ لیکن ان سب معرکوں میں اُن کا ایک جواب تھا:

"میرے بھائی! کوئی انسان خواہ وہ کسی درجے میں کیوں نہ ہو، گالی دے کر اپنی عزت میں اضافہ نہیں کر سکتا ہے۔ البتہ احوال کا جو نقشہ ہے آپ انھیں موسمی ہوائیں سمجھیے جو بہر حال گذر جاتی ہیں"۔

اور پھر اس کے بعد ایک آہ سرد جو ہونٹوں تک آ کر رک جاتی ہے۔

قامت میانہ، بدن اکہرا، رنگ سرخ و سپید آنکھیں ____ اس عمر میں بھی آہوانِ صحرا دیکھ لیں تو چوکڑی بھول جائیں۔ نجیب الطرفین، ذات سیدّ، پیشہ وزارتِ ان کا مجسمہ بے نیازی کی تصویر، انجمن آرائیوں سے محترز، خلوت آرائیوں کا شیدائی، خطابت میں یگانہ، صحافت میں منفرد، سیاست میں یکتا، عالم متبحر، زبر دست مجتہد، حسن چہرہ میں یا آواز میں، اس کی دِل پذیری پر جی جان سے فدا۔

دماغ یورپی، طبیعت عجمی، دل عربی، وجود ہندوستانی، مزاج کے اعتبار سے تانا شاہ، یعنی ان کے قالین پر بال ہو اور وہ ان کو چھو جائے یا آپ کی آواز میں حُسن نہ ہو اور آپ الفاظ کی نوک پلک کا خیال کیے بغیر ان کے سامنے بولنے لگیں تو انھیں فورا نزلہ ہونے لگتا ہے۔ آپ ان کی ایک آدھ کروٹ ہی سے محسوس کر لیں گے۔ کہ اُن کی طبیعت منغض ہو گئی ہے۔ ان کے سامنے بولنا بڑے جی گردے کا کام ہے۔ وہ بولتے ہیں کہ آبشار کی طرح بہتے ہیں۔

ابوالکلام ابوالکلام نہ ہوتے تو تاج محل ہوتے اور اگر تاج محل انسانی پیکر میں ڈھل جائے تو وہ ہر گز ہر گز ابوالکلام نہیں ہو سکتا ہے۔

آفاقہا گردیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

☆☆☆☆☆

آصف علی

آصف علی مرحوم دہلی کی تصویروں میں سے ایک تصویر تھے۔ ادیب کا قلم، خطیب کی زبان، قد کے اعتبار سے نہ بالا تھے، نہ پست، بیچوں بیچ تھے۔ پہناوا تھا چوڑی دار پاجامہ، نیچی شیروانی، سر پر کشتی نما ٹوپی، آنکھوں پہ چشمہ، پاؤں میں سلیم شاہی جوتی۔ جسم منحنی، اعضا میں لچک، ریشم کی چال چلتے اور حریر کے لہجے میں بولتے تھے چہرے مہرے میں قیاس ہوتا تھا کہ جوانی میں ضرور کوئی چیز تھے۔

کچھ تو وضع دار تھے۔ لیکن قدرے تصنع بھی تھا۔ عموماً لیے دیے رہتے۔ اُن کی ارونا سے شادی، قومی سیاست میں "ایک حادثہ" تھا۔ بالخصوص ہندو نیشنلسٹ اس پر بہت جزبز ہوئے۔ لیکن ارونا آصف علی ایک دوسرے میں گتھ چکے تھے۔ ایک طوفان اٹھا اور نکل گیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد سہارا نہ دیتے۔ تو گردوپیش کی مایوسیوں نے انھیں، بہت زیادہ دل برداشتہ کر دیا تھا۔ اکثر ہندو لیڈر اُن سے بہمہ وجوہ بیزار تھے۔ اور مولانا محمد علی مرحوم نے تو انھیں، ایک بھرپور وار سے ٹھکانے لگا دیا تھا۔ لیکن مولانا ابوالکلام کی مخالفت آڑے آئی۔ اور پھر رام گڑھ کانگریس کے بعد بڑھتے ہی گئے۔

مولانا ابوالکلام کی وزارتی مشن اور وائسرائے سے گفتگوؤں میں ان کے ترجمان رہے۔ بالآخر معتمد علیہ بن گئے، اور پھر انھی کی بدولت عبوری حکومت میں وزیر مواصلات بنائے گئے، پہلے ہندوستانی سفیر کی حیثیت سے امریکہ گئے۔ اڑیسہ میں گورنری کی، وہاں سے سوئٹزر لینڈ کے سفیر ہو کر چلے گئے۔ وہیں موت نے آلیا اور ہمیشہ کے لیے، ملک عدم کو سدھار گئے۔ اب "غالب علی کل غالب" کے پہلو میں دفن ہیں۔

۱۹۴۲ء کی تحریک کے بعد ان میں اور ارونا میں خاصے اختلاف ہو گئے دونوں ذہنی اعتبار سے ایک دوسرے کے خلاف تھے گاندھی جی نے اختلاف کی خلیج کو پاٹنا چاہا اور کسی حد تک کامیاب ہو گئے۔ لیکن ان کے دماغ پھر بھی متحد العمل نہ ہو سکے۔ صرف دل کا رشتہ باقی رہا۔

مرحوم اردونا کی سیاسی مفارقت کو بُری طرح محسوس کرتے تھے۔ اسی صدمے نے ان کی صحت کو ایک گرتی ہوئی دیوار بنا دیا اور آخر ازونا کی موجودگی ہی میں یہ دیوار ہمیشہ کے لیے بیٹھ گئی۔

سچ ہے۔ وقت ہماری محبتوں کو معاہدے اور معاہدوں کو قبریں بنا دیتا ہے۔

☆☆☆☆☆

مولانا احتشام الحق تھانوی

حضرت مولانا سے بالمشافہ گفتگو کا موقع آج تک نہیں ملا لیکن دیوبند کی تھانوی شاخ کے نامور خطیب ہیں۔ عروس البلاد کراچی میں نوشہ کی طرح رہتے ہیں۔ پہلے صرف شیوا بیان مقرر تھے آواز، دبنگ لہجہ میں آہنگ، خطابت میں ترنگ، ذکر و وعظ میں رنگ۔ اب مہ صیام کے آغاز سے انجام کے صفحۂ اول کی زینت ہو گئے ہیں۔ تصویر بھی چھپتی ہے اور تحریر بھی۔ تقریر میں اُردو کا لوچ اور عربی کا غلغلہ بدرجہ اتم ہوتا ہے، تحریر میں وہ چیز نہیں جو ہونی چاہیے، چہرے مہرے سے گمشدہ بغداد کے طبیب معلوم ہوتے ہیں، سر پہ سفید ململ کی تھانوی ٹوپی، ماتھے پہ محراب، بھنویں تنی ہوئیں، آنکھیں غلافی، ریش و بروت کی رو سے شرع پیمبر کی روایتوں کا صحیح نمونہ، خود بھی اُجلے، لباس بھی اُجلا، بڑھاپے میں قدو قامت تن قیامت سے کم نہیں، خدا جانے عالم شباب میں کیا ہوں گے؟ کراچی کئی حلقوں میں تقسیم ہے، آپ تھانوی سلطنت کی ایک بڑی جاگیر کے تمندار ہیں، آپ کے "حریف" مولانا عبدالحامد بدایونی ہیں، جو آپ کے مقابلہ میں علم دین سے تو واجبی سی شناسائی رکھتے ہیں لیکن علم دربار کے زیادہ ماہر ہیں۔

تھانوی گروپ دیوبند کے انتہا پسندوں میں ماڈریٹ خیال کیا جاتا رہا ہے احتشام الحق ماڈریٹوں کی اس جماعت کے بھگت کبیر ہیں۔

حضرت تھانوی علیہ الرحمتہ نے تصویر کھنچوانا، خلاف قرآن و سنت قرار دیا ہے، لیکن ان کی تصویروں سے معلوم ہوتا ہے کہ تصویریں چھپوانا خلافِ قرآن و سنت نہیں ا[illegible] نگاہیں جھکی ہوں تو کھنچوانا بھی شاید منافی اسلام نہیں، واللہ اعلم بالصواب، کیا فرماتے ہیں [illegible] المدارس ملتان کے حضرت مولانا خیر محمد صاحب اس مسئلہ کے؟ سنا تھا علماء امرا کے دروازے پر جائیں تو حضور کی حدیث کے مطابق ان کے ایمان میں خلل واقع ہوتا ہے۔ لیکن

اب اس میں بھی غالباً ترمیم کرلی گئی ہے ہوائی اڈے پر جانا گرفت میں نہیں آتا۔ دروازے میں اور اڈے میں ہر لحاظ سے فرق بھی ہے اور فاصلہ بھی چونکہ ہر شخص اپنے نام کی تصویر ہوتا ہے اس لیے مولانا کے نام میں جو طنطنہ ہے، وہ ان کے کام میں بھی ہے اور اسلام میں جبھی کبھی صمصام تھے۔ اب قیام ہیں بہر حال نیک نام ہیں، خوش خرام ہیں اور اپنی چمکتی دمکتی خوبیوں کے باعث خوش مقام ہیں۔

☆☆☆☆☆

احسان دانش

رنگ سنگ اسود کی طرح، آنکھیں چیتے کی، ماتھا شیر کا، ناک سقراط کی، زندگی بنانے، گزارنے اور اجلانے کی جیتی جاگتی مجلّی تصویر، ایک ایسا انسان جو بوریے سے اٹھا، لیکن ... کا اعتراف قالینوں پر ہوتا ہے۔ عوام کا شاعر اور ایسا بدیہہ گو، پُر وقار تاریخی شاعر کہ الفاظ اس کی داشتہ ہیں، مطالب اس کی لونڈی، تخیل اس کا یارِ غار، فکر اس کے ہمرکاب، جوش کے ساتھ کاندھا ملا کے چلنے والا شاعر، لیکن جوش کی شاعرانہ چھلوں سے ہٹ کر مسلمان قسم کا ... عقیدۃ مسلمان اور کٹر قسم کا مسلمان، پانچوں وقت کا نمازی، شرعی زبان میں پابند صوم و صلوٰۃ، سیکڑوں شاعروں کا خالق، دوستوں پر جان دینے والا، خوبرؤوں پر دیوانہ ... والا، ہر کہ و مہ کے کام آنے و... اپنے سوا ہر ضرورت مند کا سفارشی، ... تک ... چاہے نشہ میں غرق، شراب کو چھوا تک نہیں، رسول اللہ ﷺ کا شیدائی، اللہ کے ... سر جھکا دینے والا، آبائی وطن قصبہ کیرانہ، ضلع مظفر نگر، سابق یوپی، حال ... نشوونما کا وطن لاہور، یہیں اس کی شاعری نے آنکھیں کھولیں، یہیں عنفوان شباب آیا، یہیں شباب اور یہیں اپنی زندگی کے موجودہ دن گزار رہا ہے۔

اس کی تصویر بعض ''محاسن و قبائح'' کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتی۔ مثلاً قباحت تو یہ ہے کہ فاقوں میں بھی اپنے ساتھ دو چار مہمان رکھتا ہے اور حسن یہ ہے کہ اس کے قلم سے لے کر اس کی زبان تک، یا اس کے بول سے لے کر اس کی چال تک کسی کو ضرر یا نقصان نہیں پہنچا۔ فقیر انسان جو اپنے ساتھ غیرت کا رنگ و روغن رکھتا ہے۔ آپ اسے پہلے سے نہ جانتے ہوں تو محسوس ہوگا کہ شاعر نہیں، منیم جی ہیں۔ طبیعت قلندرانہ، مزاج سکندرانہ، زبان شاعرانہ، بیان فقیہانہ، سرمایہ دارانہ نظام کے منہ پر طمانچہ، زمانے کا تھپیڑ، رائٹرز گلڈ کا ممبر لیکن اس کے قصائیوں کی چھری سے مجروح، حلقۂ ارباب ذوق کے خداوندوں کی منوسمرتی کے نزدیک اچھوت، ترقی پسندوں کی انجمن ستائش باہمی کا راندۂ درگاہ، لیکن اس مقاطعۂ عام کے باوجود ہر لحاظ سے عظیم، شاعر کے لحاظ سے بھی اور انسان کے لحاظ سے بھی۔

احمد شاہ بخاری

ہمہ صفت موصوف۔ اگر یو این او تمام اقوام کی نمائندہ ہے تو پروفیسر احمد شاہ بخاری تمام علوم کے نمائندے ہیں۔ پاکستان میں شاید اتنا پڑھا لکھا آدمی کوئی نہیں اور اگر کوئی ہے تو سمجھیے کہ یا تو وہ گور کنارے لگا ہے، اوریا قلم بیچتا ہے، ہنر بیچتا ہے۔

پطرس ان کا نثری تخلص ہے۔ کبھی کبھار شعر بھی کہتے رہے ہیں۔ لیکن ان شعروں کی بیاض غالباً مسئلہ کشمیر کی کسی دستاویز کے ساتھ منسلک ہے۔ جہاں کہیں ۰۰ ں وہاں طاؤس کی طرح اپنی انجمن خود ہی آراستہ کر لیتے ہیں پنجابی بولیں تو فضل شاہ کے ہم نشیں معلوم ہوتے ہیں اُردو بولیں تو خواجہ حسن نظامی بھی چوکڑی بھول جاتے ہیں۔ فارسی میں بھی طبیعت بند نہیں، رہا انگریزی کا معاملہ، تو برناڈ شا کے بھی کان کترتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کی ذہانت ہر دور اور ہر عہد میں ضرورت کے طور پر تسلیم کی گئی ہے۔

راقم الحروف کو ان سے کچھ زیادہ نیاز نہیں رہا، یہی دو چار دفعہ کی ملاقات ہے۔ وہ مجھے بارودی طبیعت کا نوجوان کہتے ہیں اور میں انھیں شبنمی طبیعت کا فولادی انسان سمجھتا ہوں۔

ایک دفعہ ایک مشہور اخبار نویس ان سے کسی بات پر الجھ گیا۔ آپ پہلے تو چپ ہو رہے۔ پھر جب دیکھا کہ پانی سر سے گزر رہا ہے تو سیدھے اس کے دفتر میں پہنچے۔ سلام عرض کیا۔ وہ سمجھے معافی مانگنے کے لئے آئے ہیں۔ کواڑ بند کر دیا اور کنڈی لگالی۔ جوتا اتارا اور پھر دھڑا دھڑ دے جوتے پہ جوتا۔ جب ان کی فرق مبارک کی تواضع کر چکے تو مصافحہ کو ہاتھ بڑھایا اور کہا۔

یار زندہ صحبت باقی ان شاء اللہ پھر کبھی ملاقات ہو گی۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور عبدالمجید سالک میں ایک مدت سے تعلقات کا انقطاع تھا۔ ایک دن دفتر احرار میں تشریف لائے۔ شاہ جی کو "اغوا" کر کے کوٹھی میں لے گئے وہاں سالک موجود تھے، دونوں کے دلوں کا غبار دھو ڈالا۔ چاندنی رات تھی، نہر کے کنارے کار میں بیٹھ کر کھلی ہوا اور دلفریب چاندنی کا لطف اٹھایا۔ خود کار چلا رہے تھے۔ شاہ جی داد و بخش

میں مگن تھے اور سالک گا رہا تھا۔

دریں زمانہ رفیقے کہ خالی از خلل است
صراحیِ مے ناب و سفینہ غزل است

بالا بلند، سرخ و سپید، لمبوترا چہرہ، آنکھیں دکھاتے بھی ہیں دیکھتے بھی ہیں۔ طبیعت باغ و بہار پائی ہے اور ان کے مزاج میں پچھلے پہر کے آنسوؤں کی آنچ ہے۔

☆☆☆☆☆
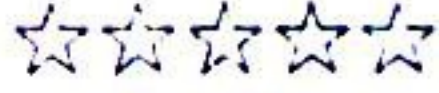
احمد ندیم قاسمی

ایک متحرک شرافت، گاؤں سے اٹھا، کچھ روحانی وادیاں قطع کیں، شہر میں پہنچا، دلِ لخت کو شعر وانشا میں ڈھالنا شروع کیا، رفتہ رفتہ ابھرتا گیا، حتیٰ کہ نصف النہار کو پہنچ گیا۔ پہلے رومانی شاعر تھا، اب اشتمالی شاعر ہے۔ پہلے ادیب تھا، آج صحافی ہے۔ اس کی متاع صرف اس کا قلم ہے، جو شاید اس کو تلوار سے بھی زیادہ عزیز ہے، وہ اپنے قلم کو جمہور کی امانت سمجھا ہے، اور اسی لیے اب اس کے فکر کی جولان گاہ نہ توانگہ کے کھیت ہیں، نہ گاؤں کی شہزادیاں، بلکہ اس کے مخاطب ہیں عالمی انسان اور مثالی معاشرہ، جس میں مزدور پھاوڑہ اٹھائے اور کسان کدالیں تانے "پرویزی" کی دستاویز پر کوہ کنی کی مہریں چھاپتے ہیں۔

میانہ قامت، سنجیدہ چہرہ، آنکھوں میں فلسفیانہ تفکر، لہجے میں انکساری طبیعت میں سادگی۔ پاکستان کے ترقی پسند مصنفوں کا راہنما۔

زبان مشرقی، دل مسلمان، دماغ اشتراکی، نامور شاعر، نامور ادیب اور نووارد صحافی۔

اور یہ ہے احمد ندیم قاسمی۔

☆☆☆☆☆
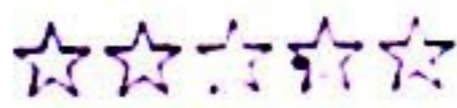
اختر شیرانی

نام داؤد خاں، تخلص اختر، قوم شیرانی الافغانی۔ علامہ محمود شیرانی کے اکلوتے بیٹے۔ آبائی وطن ٹونک تھا، لیکن لاہور میں پروان چڑھے، افق شعر پر آفتاب کی طرح چمکے اور یہیں ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ اختر کو موت نے نہیں مارا۔ بلکہ وہ خود مرے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ہاتھوں زندگی کے بخیے ادھیڑ ڈالے۔ شراب کے بغیر ان کا کوئی تصور قائم نہیں ہو سکتا۔ وہ شراب پیتے نہیں بلکہ حلق کے نیچے غٹاغٹ اتارتے تھے۔ ان کا وجود سمٹ سمٹا کے شراب ہو گیا تھا۔ اخیر عمر میں یہ عالم تھا کہ شراب میں پانی ملانا شرک سمجھتے تھے۔ بوتل خریدی، کاگ اڑایا اور بے روک ہو کر پی گئے۔ کسی نے ٹوکا تو اس کو قہقہوں میں اڑا دیا۔

ان کی زندگی کا حرف آغاز سلمٰی ہے، جو ان کے کلام میں روح کی طرح رچا ہوا ہے اور حرفِ آخر شراب، جس میں تبکدے سے میکدے تک کی سیکڑوں رسوائیاں چھپی ہوئی ہیں۔

انھوں نے جوانی میں بیسیوں آنچلوں سے راز و نیاز بڑھائے اور کئی دروازوں پر دستک دے کر لوٹ آئے۔ لیکن سلمٰی سے ان کا لگاؤ کبھی ختم نہیں ہوا۔ وہ سلمٰی ہی کے لیے جیتے تھے اور سلمٰی ہی کے لیے داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔

شاعری میں انھوں نے جو نئے تجربے کیے وہ نہ صرف ہمیشہ کے لیے زندہ ہیں بلکہ ان کی کسک آج بھی تنہائی کے لمحوں میں دلوں کے اندر محسوس ہوتی ہے اور جب تک انسان گوشت پوست کا انسان ہے۔ اختر شیرانی کی شاعری کا روپ کبھی محو نہیں ہو سکتا۔

میانہ قامت، دوہرا بدن، کتابی چہرہ، روشن آنکھیں لیکن، رندی کے باوجود پلکیں حیا سے جھکی ہوئیں، ستواں ناک، سڈول جسم، چلتے ہوئے لڑکھڑاتے تھے۔ کبھی کسی بھلے وقت میں اچکن بھی پہن لیتے، ورنہ عام لباس کھلے گلے کی قمیص اور سندھی طرز کا پاجامہ ہوتا تھا۔ کوئی شخص انھیں چہرے مہرے کے اعتبار سے اختر شیرانی نہیں کہہ سکتا تھا۔ بلکہ حلیے سے تو بمبئی کے دادا ہی نظر آتے تھے۔

انہیں دیکھنے سے نہ دیکھنا زیادہ بہتر تھا۔ وہ اپنے کلام میں ایک یونانی مجسمہ معلوم ہوتے۔
لیکن حقیقۃً وہ معذرت کی ایک صدا تھے۔

مرفوع القلم اختر شیرانی

☆☆☆☆☆

اختر علی خاں

جس طرح ولایت علی خاں موروثی نواب ہیں۔ اسی طرح اختر علی خاں موروثی مولانا ہیں۔ ان کی ایڈیٹری بھی موروثی ہے۔ بڑے باپ کے چھوٹے بیٹے ہیں۔ جو کچھ وصولتے ہیں اس کا اشتہار نہیں دیتے، جو کچھ بانٹتے ہیں اس کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ کان کے کچے، دل کے نرم، ہاتھ کے سخی ہیں۔ طبیعت میں اتار چڑھاؤ رہتا ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ خیالات میں ثبات نہیں ہے۔ ان کے گرد و پیش جو درباری بیٹھتے ہیں۔ انھیں چھانٹ دیا جائے تو اختر علی خاں واقعی "ان کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا" قسم کے بزرگ ہیں۔ وہ نہ تو کسی کو نقصان پہنچانے کے اہل ہیں اور نہ کسی کو فائدہ پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ان کا سراپا ایک لطیفہ ہے۔ خود لکھنا نہیں چاہتے یا لکھنا نہیں جانتے، اس لیے جو کچھ ان کے نام سے چھپتا ہے وہ ایڈیٹروں کے قلم سے ہوتا ہے، جو بڑی حد تک ان کے مزاج میں دخیل ہیں۔

ان تمام اختلافات کے باوجود جو راقم الحراف کو ان کی ذات ستودہ صفات سے ہیں۔ یہ کہنا بڑی حد تک درست ہے کہ اختر علی خاں ہر کہ دمہ سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ وہ اپنے مفاد کے معاملے میں دس فیصد اور دوسروں کے لیے نوے فی صد ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ ان کا یادگار تعمیری کارنامہ کرم آباد کی مسجد ہے۔ اور شہرۂ آفاق تخریبی کارنامہ "چٹان کی یک سالہ بندش" جس سے ان کے نامۂ اعمال کی سج دھج دگنی ہو گئی ہے۔

قد زمیندار کے جدید سائز پر ہے۔ جثہ بابو مولاداد کو دو سے ضرب دیں تو پھر بھی عشاریہ پانچ سے اوپر ہوتا ہے۔ رنگ گندمی ہے۔ آنکھیں دیکھے مدت ہو گئی ہے۔ لیکن میاں محمد ممتاز دولتانہ سے ملتی جلتی ہیں۔ گفتگو میں رکھ رکھاؤ ہے۔ ہمیشہ کار میں ہوتے ہیں اس لیے رفتار کے متعلق کچھ کہنا محال ہے۔ زمیندار ان کی اسٹیٹ ہے۔ خود اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ، ہیں۔ صاحبزادہ منصور علی خاں ولیِ عہد سلطنت ہیں۔ بابو مولاداد فنانس منسٹر ہیں۔ محمد اشرف عطا وزیرِ داخلہ، تبلی ٹی کام وزیرِ اعظم اور مولوی نور الحق وزیرِ دربار ہیں۔

الغرض مولانا اختر علی خاں، ولیِ عہد صحافت ہیں۔

میرزا ادیب

احساسِ کمتری کا عجیب و غریب شاہکار، نام دلاور علی، ذات مغل تعلیم بی اے تک۔ تخلص ادیب، پیشہ "ادبِ لطیف" کی ادارت۔ پہلے شعر و شاعری کا شوق فرماتے تھے۔ اور اختر شیرانی سے تلمذ تھا۔ ساقی کے مدیر شاہد احمد دہلوی نے حوصلہ دلایا تو افسانہ نویسی کے میدان میں کود پڑے اس وقت سے اب تک اسی راہ پر گامزن ہیں۔

مغلوں کے عہد میں ہوتے تو روز نامچہ نویس ہوتے۔ چونکہ انگریزوں کے عہد میں پروان چڑھے ہیں اس لیے صحرا نورد کے خطوط تصنیف کیے ہیں، جس سے ان کی ادبی عزت قائم ہوئی ہے۔

ایک اچھا مصنف ہونے کے باوجود خود کسی رائے کے مالک نہیں۔ ہمیشہ مستعار خیالات پر جیتے ہیں، ان کی حیثیت ترقی پسندوں میں وہی ہے، جو کمیونسٹوں میں افتخار الدین کی ہے۔ میرے نزدیک وہ جدید افسانہ نویسی کی نوجوان پود کے راہنما ہیں۔ شریف النفس، مرنجان مرنج، کمزور دوست کمزور دشمن، جب تک آپ ان سے متعارف نہ ہوں، ان کا چہرہ ان کے ادیب ہونے کی نفی کرتا ہے۔ کسی چونگی کے محرر نظر آتے ہیں۔ ایک زمانے میں ایک نوجوان سے عشق کیا تھا۔ اور وہ بھی عجائب خانہ کے پاس بھنگیوں کی توپ پر رات کا ایک حصہ بسر ہوتا تھا۔ لیکن رزق کی پریشانی نے پریشان کیا تو عشق کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ اور پھر کبھی سننے میں نہیں آیا کہ مرزا ادیب اور حضرتِ عشق کہیں یکجا ہوئے ہیں۔

رنگ مغلی ہے، چال تیموری، ڈھال لاہوری۔ آنکھیں کچھ مدھم ہیں کچھ روشن، ناک ستواں اور چہرہ لمبوترا ہے۔ شارٹ ہینڈ میں بولتے اور لٹو کی طرح گھومتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی بہت بڑی خوبی یہ ہے۔ ان کے قلم اور ان کے سخن سے کسی کو کوئی ضرر نہیں پہنچا۔

☆☆☆☆☆

بشیر احمد ارشد

اچھا آپ یہ جانتے ہیں کہ حمید نظامی حیات تھے تو ہفتہ میں دو دن یا ان کی غیر حاضری میں اداریے اور ہر صبح "نوائے وقت" کے شذرات کون لکھتا تھا؟ اور اب ان کی موت کے بعد اکثر و بیشتر یعنی ہفتہ میں پانچ دن تو ضرور ہی یہ اداریے کس کے قلم سے ہوتے ہیں؟ ان کا نام ہے بشیر احمد ارشد، شاعر کے خیال کی طرح نازک ہیں۔ چہرہ دورکنی غزل کا مطلع ہے۔ اس کو باوقار بنانے کے لیے اس طرح عینک چڑھا رکھی ہے جس طرح ایک اچھی کتاب پر ڈسٹ کور ہوتا ہے۔ دبتے دباتے کسی سے نہیں، نظامی ہی کی طرح اکل کھرے ہیں۔ جو دل میں ہے وہی زباں و قلم پر، زندہ ایڈیٹروں میں ایک ہی ہیں، جنھیں یہ بھی یاد ہے کہ جو کچھ ان کے قلم سے نکل رہا ہے، اس کے لیے وہ روز قیامت حاکم الحاکمین کے سامنے جوابدہ ہیں۔ ارشد سچے مسلمان ہیں۔ ان کا تخلص ان کی فطرت سے مناسبت رکھتا ہے، ان کے ایک بھائی سی، ایس، پی ہیں، ایک غالباً فوج میں ہیں، خود ایم اے کیا تو اعزہ زور دیتے رہے کہ سی، ایس، پی ہو جائیں، لیکن ان کی طبیعت ہی اس طرف راجع نہ ہوئی۔ انھوں نے اپنے لیے قلم کی وادی کو منتخب کر لیا۔ "تسنیم" سے نکلے۔ نوائے وقت" میں پہنچے، اور "نوائے وقت" ہی کے ہو گئے۔ مدۃ العمر حمید نظامی کے ہمزاد رہے۔ اب حمید نظامی تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ ان کے معنوی جانشین ہیں، قلم بھی وہی ہے زبان بھی وہی، طرزِ تحریر بھی وہی۔ خیالات مستعار نہیں لیتے سوچتے اور نکالتے ہیں۔ ان کے اداریوں میں اگر مگر نہیں ہوتا، صاف لکھتے، ستھرا لکھتے، سیدھا لکھتے اور بے لاگ لکھتے ہیں کوئی بات پردہ میں نہیں ہوتی، البتہ کنایہ ضرور مخفی ہوتا ہے ایک ایڈیٹر کا کمال یہی ہے کہ وہ زخم لگاتا جائے اور محسوس نہ ہونے دے کہ مخاطب پر وار ہو رہا ہے۔ مخاطب عام آدمی ہو تو اصلاح پر آمادہ ہو جائے۔ حکمران ہو تو خوفزدہ ہو کر جھنجھلاتا ہے۔ مبداء فیاض نے ان کے قلم میں یہی حسن رکھا ہے اور وہ اس میدان میں یکہ و تنہا ہیں۔ نوائے وقت سے ان کا تعلق ردیف و قافیہ سا ہے۔ ان میں اور اس میں گل و بلبل کا

عروضی لازمہ ہے۔ قلمکار تو ہیں ہی، لیکن صحیح معنوں میں دانشور بھی ہیں۔ ان کے فکر و نظر پر یمین ویسار کے تذبذب کا سایہ تک نہیں۔ صحیح سوچتے، صحیح پڑھتے، صحیح لکھتے اور صحیح چلتے ہیں۔ قامت مختصر سی ہے۔ قد حالی کے مسدس کا ایک بند ہے۔ پنجابی میں کہتے ہیں کہ "گورا رنگ تے شربتی اکھیاں" ان دونوں سے معریٰ ہیں۔ لیکن وہ جو دوسرا مصرع ہے کہ "سارا پنڈ ویرپے گیا۔" تو ان کے اداریوں کی چال ڈھال پر خوب کھلتا ہے دل و دماغ دونوں مسلمان ہیں۔ ظاہر میں بھی میزان ہیں باطن میں بھی ..زان، آپ ان سے مل کر خوش نہیں ہو سکتے۔ ترشرو ہیں نہ خوبرو، بس روکھے پھیکے سے انسان ہیں کچھ دیر ان کے پاس بیٹھئے تو آپ کو احساس ہوگا جیسے ان کے بشرے پر لکھا ہوا ہے وقت بڑا قیمتی ہے۔ بات مختصر کیجیے اور اسی کا نام بشیر احمد ارشدؔ ہے۔

☆☆☆☆☆

اے۔ڈی۔اظہر

اظہر صاحب کی ہر بات سمجھ میں آتی ہے۔ مثلاً وہ اکل کھرے ہیں، عربی زبان میں غالباً اسی کا نام مومن قانت ہے، جو منہ میں سو دل میں، کھوٹ سے اس طرح بھاگتے ہیں جس طرح بھارتی سینک چوٹ سے، نقصان پہنچانا ان کا شیوہ نہیں اور نہ نقصان اٹھانا ان کی عادت ہے۔ ادیب و شاعر ہونے کے باوجود ریاضی کے معاملے میں پکے حسابی ہیں، کروڑوں سے لے کر کوڑیوں تک کا حساب رکھتے اور انھیں خرچ کرنے کی ادائیں جانتے ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ان کا اپنا اثاثہ کروڑوں تک کبھی نہیں پہنچا پنجاب کی سرکار میں معتمد مالیات رہے۔ مرکزی حکومت میں بڑی بُری آسامیوں پر مقرر ہوئے، مثلاً ریلوے کے فنانشل ایڈوائزر رہے، انگلستان میں ہائی کمشنر کے دفتر میں مالیات کے مشیر ہو کر چلے گئے، مدتوں وہاں رہے۔ غرض اس فنِ شریفہ میں انھیں مہارت تامہ حاصل ہے۔ حساب اُن کا ہمزاد ثانی ہے اور ریاضی کی نسبت سے ان کا خفی تخلص بھی کہا جاسکتا ہے، لیکن ضرب و تقسیم اور جمع و تفریق کے عناصر اربعہ کا یہ انسان ادب سے اس طرح آشنا ہے کہ نثر اس کے ساتھ وہی رشتہ رکھتی ہے جو ناتا لکھنؤ کے سجیلے میر تقی میر کے ساتھ رکھتے تھے، شاعری ان کی ممتوعہ یاداشتہ ہے۔ ہم منکوحہ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن ہمیں اپنی چھوٹی بھالی سے پٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ جو بات سمجھ میں نہیں آتی وہ اے، ڈی ہے۔ اُردو کا مجنوں، مرکزی اُردو بورڈ کا ڈائریکٹر، اوڑھنا اُردو، بچھونا اُردو، بلکہ سر تا قدم اُردو، ہی اُردو پنجاب کا اکبر الہ آبادی، لیکن نام پر انگریزی کا خول!! خود اظہر صاحب کو معلوم نہیں کہ اس اے ڈی نے کیا کیا فتنے برپا کیے ہیں اور یار لوگوں نے کیسے کیسے حاشیے باندھے ہیں۔ احمد دین چنگا بھلا نام ہے۔ اس میں حسن بھی ہے اور ثواب بھی، پھر نام بھی موحدوں والا ہے۔ شرک کی پھانس نہیں، قیاس یہ ہے کہ انگریزی عہد میں احمدؐ کے تقدس کو ملحوظ رکھتے ہوئے برطانوی حاکموں کی بد تمیزی سے بچنے کے لیے اے ڈی اختیار کیا، پھر اس میں دستخط پک گئے اور یہی نوکِ زبان ہو کر اُردو ہو گیا۔

اظہر صاحب کو ملے بغیر شبہ یہ ہوتا ہے کہ فوج کے جنرل ہیں۔ یوں بھی نظر بہ ظاہر خشک معلوم ہوتے ہے۔ تصویر کے چہرے پر جو ہنسی ہے وہ کسی کتاب کا گرد پوش ہے جس کو چغتائی نے تیار کیا ہے۔ بال کھچڑی ہو گئے ہیں غالباً وسمہ لگاتے ہیں۔ عمر پنیتیس سے آگے جا چکی ہے، لیکن پچاس اور پچپن کے لگ بھگ معلوم ہوتے ہیں۔ پنجابی اس طرح بولتے ہیں جس طرح آہنی تلوار کا گھاؤ ہوتا ہے، اردو کا لہجہ راوی اور چناب کا ہے، لیکن نوک پلک کا ٹانکہ ٹانکہ بولتا ہے کہ اس میں گنگا و جمنا کی دھاریں بھی ہیں، الفاظ کی صحت کا شدت سے خیال رکھتے ہیں کہ کوئی بیکار لفظ قلم کی زبان پر آنے نہیں دیتے بات چیت ان کی بڑی شاہانہ ہوتی ہے۔ مجال ہے کسی موضوع پر رک سکیں، بس سیلاب کی طرح بولتے چلے جاتے ہیں لطائف ان کے جیب و داماں کے سکے ہیں، ہر زبان اور ہر ملک کے لطائف انھیں ازبر ہیں۔ اس معاملے میں مذاق انتہائی شستہ و رفتہ پایا ہے۔ شاید ہی کوئی ادبی شہ پارہ ان کی نگاہ سے نہ گزرا ہو۔ غالب سے لے کر ناصر کاظمی تک ہر نغز گو شاعر کا کلام، تیر و نشتر کی حد تک ان کے حافظے میں ہے، فطر تاباغ و بہار انسان ہیں۔ قدرت نے ان میں بے شمار خوبیاں رکھ دی ہیں، طبیعت کا ہر ٹکڑا مشرقی ہے۔ کسی حد تک معاشرت کے اعتبار سے مغربی ہیں لیکن وہ بھی جہاں تک لباس یا رہائش کا تعلق ہے۔

چہرہ کتابی ہے، پیشانی اس کتاب کا طغریٰ، آنکھیں کبھی قیامت ہوں گی، اب اس کی علامت ہیں، کان ہر وقت کھلے رکھتے ہیں، لیکن عصمت انونو کی طرح جس بات کو چاہا سن لیا، باقی باتوں کو ان سنی کر دیا۔ مونچھیں معری، داڑھی آزاد یعنی دونوں غفرلہ، رنگ گندمی رخسار اس عمر میں بھی ڈھلے نہیں، بلکہ سعدی کی غزل کے دو مصرعے معلوم ہوتے ہیں۔ افسر نہ ہوتے تو ادیب ہوتے یا خطیب، یا معروف شاعر، لیکن اب ان سب کا مجموعہ ہیں، ان سے بعض نامور شعرا اس طرح بھاگتے ہیں، جس طرح قمار خانوں میں سے ہارے ہوئے جواری نوک دم ہو جاتے ہیں بعض نکتہ سنجان ادب، محمد علی چودھری، ممتاز حسن اور احمد دین اظہر کو سہ غزلہ کہتے ہیں۔ اس غزل کا ہر مطلع اظہر اور ہر مقطع محمد علی چودھری ہے۔ ممتاز حسن مصرع طرح پر گرہ لگانے والے ہیں۔ ادب و انتظام کی اس خوبروئی کا نام ہی اے ڈی اظہر ہے۔

☆☆☆☆☆

مولانا اظہر حسن زیدی

جو مزہ محمد حسین آزاد کی تحریر میں ہے، وہی ان کی تقریر میں ہے۔ الفاظ نہیں ہوتے، شہد کے قطرے ٹپکاتے اور غنچے چٹکاتے ہیں۔ انھیں سن کر واہ وا کرنے کو جی چاہتا ہے، لیکن معاً واہ وا کا تصور غائب غلہ ہو جاتا اور زبان آہ آہ کرنے لگتی ہے۔ زلاتا ان سے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ پھر اپنے ہی دامنِ گفتار سے اشکبار چہروں کے آنسو پونچھتے اور انھیں قہقہوں کی چاپ لگا دیتے ہیں۔ الفاظ ان کے ہاں اس طرح آتے ہیں جس طرح شاہی دستر خوان پر انواع و اقسام کی نعمتیں! خطابت کے صنائع ہیں۔ چھوٹے چھوٹے فقرے جیسے بچوں کی معصوم مسکراہٹ ہو، ان فقروں میں برنائی اور رعنائی جیسے دوشیزاؤں کو شب عروسی کا سامنا ہو۔ تسلسل ایسا جیسے مروارید کی لڑیاں پرو دی گئی ہوں، ہر تقریر کہکشاں معلوم ہوتی ہے۔ الفاظ قوسِ قزح، مطالب عقدِ ثریا، سامعین کو سوچنے کی اجازت ہی نہیں دیتے، جس تیزی سے خود بہتے اسی تیزی سے سامعین کو ساتھ لیے جاتے ہیں۔ وہ دماغوں کو پرستش سکھاتے ہیں پرسش نہیں، ان کے ہاں عقیدہ ہے اور اس عقیدے ہی کے زور پر وہ دلوں کو شکار کرتے اور شہسوار کی طرح اڑے چلے جاتے ہیں۔

زبان ادیب کی، لہجہ خطیب کا، اور اسلوب شاعر کا ہے۔ خطیب آل محمد ﷺ ان کا لقب ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا یہ خطاب انھیں کس نے دیا، کب دیا اور کہاں دیا، لیکن جس نے بھی انھیں یہ لقب یا خطاب دیا وہ حق بجانب تھا۔ اپنے کارواں کے وہ ایک ہی حدی خواں ہیں، جن کی آواز میں قرون اولیٰ کے حدی خوانوں کا ہمہمہ پایا جاتا ہے۔ ان کی زبان میں اثر بھی ہے اور گداز بھی، ان کی لے میں سوز بھی ہے اور ساز بھی، ان کے زمزموں میں عشق بھی ہے اور پرواز بھی اور بہ قول شخصے نیاز بھی ہے اور ناز بھی!

ان کی مجلس سن کر احساس ہوتا ہے ہم تیرہ سو برس پیچھے لوٹ گئے ہیں۔ کربلا کے مسافروں کا قافلہ لشکر یزید کے نیزوں کی "پذیرائی" کو جا رہا ہے۔ اظہر حسن زیدی اس قافلہ

ے حدی خواں ہیں اور اپنی دل گداز لے میں الاپ رہے ہیں۔

یہ قافلہ اہل بیت کا ہے............!

اس قافلے کے سردار حسینؑ ہیں..........!

یہ قافلہ شہادت کی شاہراہ ہے..........!

ان محملوں میں سیدانیاں بیٹھی ہیں..........!

نقاب نے سوءِ ادب کے خوف سے نگاہیں نیچی کر رکھی ہیں مین لوفیوں سے بیز ے،

ات کے کناروں پر انھیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں۔

او ماہ کائنات سے زیادہ مقدس خون اور تمام حیاؤں کا سرچشمہ خاندان نبوت نہ

اظہر حسن زیدی اس خاندان ہی کا حدی خواں ہوں۔

جوانی میں بالا بلند تھے اب کمر گردش ایام کے صدموں نے جھکا دی ہے۔ البتہ نمر نے

رباب دے کر تھام رکھا ہے۔ چہرے پر جھریاں آنکھوں میں شوخیاں، تمام چہرہ اردو کے

بعد دور کی غزل، ناک اسی غزل کا مطلع ثانی، داڑھی کھچڑی، عمر کی اس سرحد پر جہاں

نوجوانی صرف خلش کے طور پر رہ جاتی ہے۔ مزاج فقیرانہ، طبیعت شاعرانہ، ذوق عارفانہ،

... برس کے پیٹے میں ہوں گے، لیکن ان کے لیے لیل و نہار کی یہ گردشیں کوئی معنی نہیں

رکھتیں۔ خود لیل و نہار سے کھیلنے کے عادی ہیں اقبال کے اس شعر کی ہو بہو تصویر:

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں

نہ گلا ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ

☆☆☆☆☆

اقبالؒ

میرا یہ عقیدہ ہے کہ مسلمانوں نے پچھلی صدی میں دو عظیم علمی وجود پیدا کیے ہیں، علامہ اقبال اور مولانا ابوالکلام آزاد، اول الذکر کو مسلمانوں کی بے پناہ عقیدت لے ڈوبی ہے اور ثانی الذکر کو مسلمانوں کی بے پناہ نفرت!

مسلمانوں نے علامہ اقبال سے جو عقیدت استوار کی ہے اس کا رشتہ دماغی نہیں قلبی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ دل کی محبت ہمیشہ اندھی ہوتی ہے۔ مسلمان اقبال کے نام سے محبت کرتے ہیں، لیکن اقبال کے کلام کو صرف گاتے یا گواتے ہیں۔

میر ایاراں غزل خوانے شمرند

اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال نے ہندوستانی مسلمانوں کی فکری زندگی پر سرسید کے بعد سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے۔ وہ اپنے فکری خطوط کی بنیاد پر جس انقلاب کی بنیاد رکھنا چاہتے تھے اگر وہ برپا ہو تو مسلمانوں کی جدید صورت حالات کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی عملی زندگی اس کے فہم ہی سے معذور ہے!

ان کے برعکس مولانا ابوالکلام آزاد کا تبحر علمی مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے نتھے چڑھ گیا۔ اور نتیجہ معلوم کہ مسلمانوں نے من حیث الجماعت ان کے افکار کو بھی متہم ٹھہرایا۔ دونوں ایک دوسرے کے معاصر تھے، لیکن دونوں ایک دوسرے سے دور۔ دونوں میں معاصر ہونے کا بعد تھا۔ لیکن دونوں میں بعض باتیں قدرے مشترک کا درجہ رکھتی تھیں۔ مثلاً۔

۱۔ دونوں تخلیہ پسند تھے اور دونوں کو کبھی ہجوم کی معیت پسند نہیں آئی۔

۲۔ دونوں کے گرد و پیش ایک خاص ڈھب کے عقیدت مند جمع ہوتے تھے۔

۳۔ دونوں کے ذہنی خطوط دو مختلف تحریکوں اور دو مختلف راہنماؤں کی طرف راجع تھے۔ اقبال، قائداعظمؒ کو دیکھتے تھے اور خود گوشہ نشین تھے یعنی عمل سے الگ تھلگ رہ

ان کا فکر ہی ایک عمل تھا۔ ابوالکلام، گاندھی جی کے ہمقدم تھے اور اقبال کے برعکس اپنے نظریات کے لیے صعوبتیں بھی جھلتے تھے۔

۴۔ دونوں عوام میں گھلنے ملنے کی بہ نسبت عوام سے پرے رہنے میں ذہنی مسرت محسوس کرتے تھے۔

۵۔ دونوں "انا" کے سدرۃ المنتہیٰ پر تھے۔

۶۔ دونوں کی ذاتی زندگی کے اعمال وافعال میں شروع سے آخر تک، عجیب وغریب یکسانیت پائی جاتی ہے جس نے (INTE LECTUAL) کی سیرت کے برگ وبار سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔

راقم الحروف کو حضرت علامہ سے ذاتی نیاز حاصل نہ تھا۔ ایک دفعہ اسکول لائف میں ہم دوچار دوست اُن کے ہاں سلام عقیدت کے لیے گئے تو حضرت علامہ نے جو کوٹھی کے برآمدے ہی میں کھڑے تھے۔ ملنے سے انکار کر دیا، بلکہ نہایت درشت لہجہ میں فرمایا: واپس جاؤ!

۱۹۳۶ء میں مولانا ظفر علی خان کی معرفت ان سے تعارف ہوگیا، مگر ان سے میل ملاپ میرے خیال میں چنداں آسان نہ تھا۔ وہ اپنی زندگی میں بڑے ہی سخت مزاج تھے۔

آزاد ہند فوج میں جس خاتون نے رانی جھانسی کا لقب پایا غالباً اس کی والدہ ۱۹۳۷ء میں مختلف شہروں کا دورہ کر رہی تھیں۔ مدراس سے لاہور پہنچیں، علامہ اقبال کے ہاں گئیں، اتفاق سے مولانا ظفر علی خاں اور راقم الحروف علامہ کے ہاں موجود تھے؛ اور حضرت علامہ ہمیں صحن میں بٹھا کر خود اندر کھانا کھانے تشریف لے گئے تھے۔ وہ خاتون جلدی میں اندر ہی چلی گئیں، لیکن الٹے پاؤں منہ بسورے واپس آئیں۔ مولانا ظفر علی خان نے دریافت کیا تو پتہ چلا حضرت علامہ نے سخت الفاظ میں ڈانٹا ہے۔ اتنے میں علامہ بھی باہر تشریف لے آئے، ان کا غصہ اور تیز ہوگیا۔ بڑے ہی تیز جملے کہے اور جب وہ بیک بینی دوگوش نکل گئی۔ تو فرمایا دیکھئے نا یہ بڑھیا جوان لڑکی ساتھ لیے پھرتی ہے اور اس پر کتنا متنزاد ہے۔ اس کو خبر نہیں کہ یہ مسلمان کا مکان ہے۔

سوءِ اتفاق سمجھیے کہ حضرت علامہ کو مزید ایک دوبار اسی مزاج میں پایا۔ آج تک میرا ذہن عقیدت مندی کے باوجود اس خیال میں پکا ہے کہ وہ مزاجاً "نسیم سحر" نہ تھے......،

خود مولانا ابوالکلام آزاد اسی مزاج کے بزرگ ہیں ۔ اُن کی طبیعت میں بھی استغنا، مزاج میں انا اور چہرے پر بے نیازی مسلط ہے۔ وہ عقیدت مندوں کو ہمیشہ کھیت کی کھاد سمجھتے ہیں۔

سیدّ عطاء اللہ شاہ جو علامہ اقبال کے مخلصین میں سے تھے۔ عموماً کہا کرتے ہیں:

اقبال کا قلم تمام عمر صحیح رہا اور قدم اکثر و بیشتر غلط۔

لیکن اُن کا یہ خیال کچھ جچتا نہیں۔ کیوں کہ اقبال نے کبھی کوئی قدم نہیں اٹھایا، وہ یا تو پکا رتا رہا یا للکارتا رہا یا پھریرے کی طرح لہراتا رہا!

وہ اک مردِ تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا۔

میں اقبال کو مشرق کا کارل مارکس سمجھتا ہوں اور کارل مارکس کو مغرب کا اقبال۔ اور جب مجھ سے میرے دوست اس کی توجیہہ چاہتے ہیں تو میرا وجدان الفاظ کو گنگ پاتا ہے!

☆☆☆☆☆

اقبال زبیری

روزنامہ "مشرق" کے ایڈیٹر ابو صالح اصلاحی مرحوم کے جانشین!

ابو صالح بڑے ہی گفتگو طراز تھے۔ زبان اُن کی قینچی کی طرح چلتی تھی۔ ان کا لکھنا بولنا یکساں تھا۔ زبیری چُپ چاپ انسان ہیں لمبی چوڑی گفتگو نہیں کرتے، زبان قابو میں رکھتے اور قلم کو ناپ تول کے اُٹھاتے ہیں لکھنا ایڈیٹروں کی لونڈی ہوتا ہے۔ اقبال زبیری کے لیے لکھنا ایسا ہے، جیسا نُور جہاں کے لیے گا لینا۔ جب سے ہوش سنبھالا ہے، اسی وادی میں گھوم رہے ہیں اور روزنامہ کی روح کو سمجھتے ہیں۔ ان میں ایک ایڈیٹر کی ادائیں بکمال و تمام موجود ہیں۔ نقص اتنا ہے کہ بولتے نہیں، یا ہمارا اُن سے تعلق خاطر اتنا محدود ہے کہ ہم نے انھیں بولتے نہیں دیکھا، مسکراتے دیکھا، سُرخیاں جماتے دیکھا، خبریں بناتے دیکھا، اخبار کو سجاتے دیکھا، غرض دستر خوان سے لے کر قلمدان تک کے معرکوں میں دیکھا، لیکن چہچہاتے نہیں دیکھا! بُری عادتیں ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ مثلاً میری بُری عادت یہ ہے کہ میں اپنے ملاقاتیوں کے نام نہیں پوچھتا اور نہ باہمی تعارف ہی ضروری سمجھتا ہوں۔ میرے سیکڑوں ملنے والے بلکہ دوست ایسے ہیں، جن سے مدتوں کی شناسائی ہے کھانا پینا بھی ہفتوں اکٹھا رہا، مگر میں ان کے نام سے واقف نہیں، اور نہ میں نے اپنی عادت کی کمزوری کے باعث اُن سے کبھی اُن کا نام پوچھا ہے۔ اقبال زبیری نوجوان ہیں، پُرانے صحافی ہیں۔ کوہستان کے شعبۂ مخابرات کو کہاں سے کہاں لے گئے۔ اس کی اشاعت کو بھی مشترکہ مساعی میں شریک ہو کر وسیع سے وسیع کر تر دیا۔ پھر "مشرق" کی نیو رکھی گئی تو اپنے احباب کے ساتھ اس میں آ گئے۔ چیف نیوز ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ لیکن ان برسوں میں یعنی "کوہستان" کے مولود مسعود سے لے کر ابو صالح اصلاحی کی وفاتِ حسرت آیات تک بیسیوں دفعہ ان سے ملاقات ہوئی، میں سمجھتا رہا عنایت صاحب کے ملاقاتی ہیں۔ اصلاحی صاحب سے رسم و راہ ہے، حمید اللہ کے حلقہ احباب میں ہوں گے وغیرہ، کبھی غور کیا تو نیوز پرنٹ کا بیوپاری قیاس کر لیا۔ ایک

جلسے میں انھیں نوٹ لیتے دیکھا، تو کچھ زیادہ توجہ نہ کی، پھر جب وہ اصلاحی کی گدی پر بیٹھ گئے۔
تو میں ایک اور نوجوان کو جس کی زبان کترنی کی طرح چلتی ہے اقبال زبیری سمجھتا رہا۔ یہ عقدہ
تو دو ماہ پہلے سید منیر حسین انفرمیشن سیکرٹری مغربی پاکستان کے دفتر میں کھلا کہ اقبال زبیری
آپ ہیں! جو دل پر گزری، خدا ہی جانتا ہے۔ اچھا اب ذرا آپ ان سے ملیے آپ ہیں اقبال
زبیری!

قد ہفتہ وار، یعنی بالا بلند روزناموں کا نصف، بدن ماہنامہ یعنی دوہرا، چہرہ سانولا لیکن
شرافت کی دستاویز کا حاصل مطالعہ، آنکھوں میں تبسم قصیدے کی تشبیب، ماتھا پُر رونق
مثنوی میں حمد، چال نستعلیق، ڈھال نسخ میں، میر مجلس نہ محفل آرا، اپنے ہی تخلیہ کے شیدائی،
فراغتے وکتابے وگوشۂ چمنے کی تُرت پھرت تصویر، قلم ان کا دوست، کتابیں ان کی رفیق،
"مشرق" ان کا بادہ خانہ، جہاں پیر مغاں سے لے کر رندانِ دُرد آشام تک ایک ہی لَے میں
الاپتے ہیں اور اس لَے ہی کا نام ہے جہد للبقا، یا پھر قطروں ہی سے دریا بنتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

الطاف حُسین

کچھ زیادہ ملاقات نہیں۔ ویسے کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ ان کی صحافت میں خطابت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ وہ لکھتے نہیں بولتے ہیں۔ ان کی تحریر میں تقریر ہوتی ہے۔ اپنی دھن کے پکے ہیں۔ خود جھکتے نہیں جھکاتے ضرور ہیں۔ اُلجھیں تو سلجھتے نہیں اور سلجھ جائیں تو الجھتے نہیں۔ ان کی نفرت بھی شدید ہے، محبت بھی شدید، لکھنے میں آندھی ہیں بولنے میں جھکڑ۔ یوں کہہ لیجیے کہ مسلم لیگ کی سیاست کا صحیح شاہکار ہیں۔ ان کے ممدوحین "خواجہ بھائی" ہیں اور معتوبین...... ؟

"قلم ایں جا رسید و سر بشکست

الطاف حسین پنجاب میں ہوتے تو حمید نظامی ہوتے اور حمید نظامی بنگال میں ہوتے تو الطاف حسین ہوتے۔ لیکن دونوں کی طبیعتوں میں بنیادی فرق ہے۔ یعنی ایک حزبِ اقتدار ہے اور دوسرا حزبِ اختلاف!

الطاف کے قلم کا فیصلہ تو انگریزی زبان کے ماہر ہی کر سکتے ہیں۔ لیکن علم کوتاہ نہیں ہے۔ چوں کہ انھیں ابھی کسی دولتانہ سے واسطہ نہیں پڑا اس لیے یہ کہنا محال ہے کہ وہ کہاں تک مردِ میدان ہیں۔

قد بلند و پست کے بیچوں بیچ ہے بدن چھریرا ہے، رنگ سیاہی مائل ہے، آنکھیں روشن اور متحرک ہیں۔ زبان قینچی کی طرح چلتی ہے۔ کبھی صحافت کے قائد اعظم تھے۔ فاطمہ جناح سے الجھے تو قائد ملت ہو گئے۔ آج کل ڈیوک آف جرنلزم ہیں۔

☆☆☆☆☆

الطاف گوہر

ادب وانشا کہہ لیجیے یا شعر و نظم، بہر حال ان دونوں کے سانچوں میں ڈھلا ہوا، دوہرے بدن کا میانہ قد انسان، چہرہ کھلی کتاب، عینک سرورق، متن میں دلفریبی، حواشی میں دل آویزی، مطالب افکار غالب کی طرح کہیں کہیں پیچیدہ ہو جاتے ہیں، لیکن الفاظ میں حسن وجمال کی لٹک اور کھٹک، انگریزی یوں بولتے ہیں کہ خود اعتمادی ساتھ ہوتی ہے اُردو کے زبردست حامی، بلکہ پشتیبان، لیکن جب مرکزی حکومت کے اہم ترین سیکرٹری کا جامہ اوڑھ کر سامنے آتے ہیں تو اردو کو پردہ نشین خاتون کی طرح گھر میں چھوڑ آتے اور انگریزی کو پبلک پسند لیڈی کی طرح ساتھ رکھتے ہیں۔

سی، ایس، پی، اور سی ایس پی کے معنی ہیں اپنانہ پڑا یا۔ ان کے لب ولہجہ اور چال ڈھال میں عجز وانکسار کا رنگ وروغن اتنا نمایاں رہتا ہے کہ ان کی دارائی سے کسی کو خوف محسوس نہیں ہوتا۔ قدرت اللہ شہاب کے بعد صدر کے لیے اطلاعات کے سیکرٹری کا انتخاب شاید صدارتی انتخاب سے بھی مشکل تھا، لیکن حضور نے انھیں انتخاب کر کے یہ مشکل بھی حل کردی اور اس طرح حل کی، جیسے کوئی عقدہ ہی نہ تھا۔ الطاف گوہر اپنے نام کا ہو بہو عکس ہیں۔ جن لوگوں نے ان کے خلد آشیانی والد کو دیکھا ہے وہ شہادت دے سکتے ہیں کہ الطاف اپنے اباجی کے چہرے مہرے کی بولتی چالتی تصویر ہیں۔ وہی چہرہ، وہی آنکھیں، وہی عینک، وہی ناک وہی ہونٹ، وہی رخساروں کے گوشت پر نقطوں کی بھرمار، کھلا ماتھا، آنکھیں غلافی، کبھی میر تقی میر کے اس مصرع کی شرح تھیں۔

ساری مستی شراب کی سی ہے

(رہا مصرع اولیٰ تو عمر کے اس دور میں آ کر طائر لاہوتی ہو جاتا ہے) محض شاعر ہوتے تو بڑے بڑے بددماغ میروں کو ہرا جاتے۔ ادیب رہتے تو قلم فرا لے بھرتا۔ خطیب ہونے کا

شوق ہوتا تو خطابت ان کی قلو پطرہ ہوتی۔ لیکن حکومت کے ہو گئے۔ قابلیت نے راستہ صاف کیا۔ دیکھتی آنکھوں یہاں تک پہنچے۔ غصہ بھی آتا ہے، لیکن شاعرانہ، حاکمانہ غصہ سے خدائی پناہ، اور وہ بلا شبہ اس غصہ کے نزدیک نہیں پھٹکتے اور اگر ان میں سی ایس پی کا غصہ ہے تو قلندروں کے لیے نہیں، اس کی گردان کہیں اور ہوتی ہوگی، اور اتنا غصہ جائز بھی ہوتا ہے کیونکہ غصہ کے بغیر انسان نظم معریٰ کے مختلف النسل اوزان کا حصہ ہو کر آہنگ و ترنگ سے خالی رہ جاتا ہے۔ شرافت ان کی چاندنی ہے ذہانت ان کا ہالہ، قابلیت ان کا کشکول، حلقہ ارباب ذوق کبھی ان کی چوپال تھا اب ان کے احباب کی جلوہ گاہ ہے۔ اختر شیرانی سے سلمیٰ نہ چھوٹی، ان سے حلقۂ ارباب ذوق' جہاں جائیں اس کو لے پالک بچے کی طرح ساتھ رکھتے ہیں۔ بعض دوستوں کا خیال ہے کہ ان کے سداماں کا نام قیوم نظر ہے۔ لیکن قیوم نظر کے بارے میں .... کا خیال ہے کہ جب سے گورنمنٹ کالج میں وہ اُردو کے استاد مقرر ہوئے ہیں۔ سداماں نہیں، رہے اپنے کنہیا کی گوپی ہو گئے۔

شکایت انھیں یہ ہے ریڈیو کے پرانے فن کار ہیں۔ لیکن صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے بتانِ آذری میں سرفہرست ہونے کے باعث نور جہاں کی آواز پر "جملہ حقوق محفوظ" ہونے کی چھاپ لگادی، جس سے اُن کے ترانے سلیم رضا اور ان کی ہمجولیوں کے گلے کا ہار ہو گئے۔

☆☆☆☆☆

امیر محمد خان

قلندری و قباپوشی و کلہ داری

بالا بلند، کتابی چہرہ، کھُلا ماتھا، سر پہ کلاہ، خود نجکلاہ بلکہ بے پناہ، آنکھیں روشن اور متحرک، انسانوں کا انسائیکلوپیڈیا، طبیعتوں کا اندازہ شناس، مزاجوں کا رازداں، نسلوں کا واقف، افسروں کے افکار و مطالب کا لعنت:

اٹھے تو بجلی پناہ مانگے گرے تو خانہ خراب کر دے

جسم مضبوط، بدن سڈول، چہرہ ہمہمہ، طبیعت میں دبدبہ، رفتار میں دغدغہ، گفتار میں ہلہلہ، دل جری، نگاہ کھری، قاہری و دلبری کا مجموعہ، شجاعت و شرافت کا مرقع، دامن ہر داغ سے دُھلا ہوا نفس سونے میں تلا ہوا۔ کوئی بدمعاش فریب نہیں دے سکتا، کوئی شریف ان سے زک نہیں اٹھاتا۔ پیچدار الفاظ کا دشمن، جب تک انسان ان سے ملے نہیں مخلوط خیالات دماغ میں بجنٹ رہتے ہیں۔ ملاقات ہو جائے تو پھر ایک اُجلی تصویر سامنے آتی اور ملاقاتی یمین ویسار کے تذبذب سے باہر آجاتا ہے۔ انھیں نکیل ڈالنے اور کھیل کھیلنے میں مہارت تامہ حاصل ہے۔ دوستوں سے کبھی دغا نہیں، کی جس سے ہاتھ ملایا اُسے کاٹا نہیں۔ ان کے ہاں صحیح مشورہ اور مکمل متابعت ہے۔ دشمن ان سے واقعتہً ڈرتے ہیں۔ جو شخص پاکستان کا دشمن ہے ان کا بھی دشمن ہے۔ وہ جسور بھی ہیں اور غیور بھی۔ ان کے گردو پیش زانی اور شرابی نہیں رہ سکتے۔ لیکن وہ ایک دریا کی طرح ہیں، جس سے ہر شخص بقدر طلب اور بقدر ظرف پانی پی سکتا ہے۔ لاہور کے گورنر ہاؤس نے بیسیوں گورنر دیکھے ہیں۔ عبدالرب نشتر کی شرافت اور مشتاق احمد گورمانی کی ذہانت تاریخ کا حصہ ہو چکی ہے۔ اب امیر محمد خاں کی جلالت کا زمانہ ہے۔ قدرت نے انھیں بلا کی سوجھ بوجھ دی ہے۔ دیانتداری کا حال یہ ہے کہ گورنر ہاؤس کی مراعات سے بھی متمتع نہیں ہوتے۔ اپنے کھانے پینے پر جو خرچ کرتے، اپنی گرہ سے کرتے ہیں۔ ذہانت ان کی لونڈی ہے، دولت ان کی باندی، لیکن ان کے ہاں لہو ولعب کے

تصور کا بھی گزر نہیں۔ کھرے مسلمان ہیں۔ انھیں نبی اکرم ﷺ سے بے پناہ محبت ہے۔ حضور ﷺ کا نام بڑے ادب سے لیتے اور خود بخود جھکے جاتے ہیں۔ اپنے قبیلے سے نہایت درجہ محبت ہے۔ اس خون کی حفاظت عصبیت کی حد تک کرتے اور کسی قسم کا پیوند لگنے یا لگانے کے خلاف ہیں۔ جواں مرد اور پامرد ہیں اسلام کو اپنے لیے نہیں اسلام کے لیے مانتے ہیں۔ ان سے مل کر یہ احساس قوی ہوتا ہے کہ ہم ایک قول کے پکے اور فعل کے سچے انسان سے مل کر آئے ہیں۔ ان میں اتنی خوبیاں ہیں کہ طبیعت باغ و بہار ہو جاتی ہے۔ البتہ وزیروں کا انتخاب کرتے وقت ایک آدھ غڑغوں قسم کا وزیر بھی چن لیتے ہیں۔ اور یہ غالباً اس لیے کہ ہر انسان میں حس ظرافت ہوتی ہے۔ ایک گورنر کو بھی تفنن طبع چاہیے جو ناگزیر ہے۔

☆☆☆☆☆

مولانا امین احسن اصلاحی

جماعت اسلامی کے مردآہن یعنی سردار پٹیل۔ قامت ''تفہیمات'' کے سائز پر ہے یعنی بالابدن ''پاکستانی عورت دوراہے پر'' کی ضخامت پر ہے یعنی اکبر، چوں کہ دور سے دیکھا ہے قریب سے نہیں۔ اس لیے مزید خط وخال کی ٹوہ لگانے کے لیے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تصنیف ''رسائل ومسائل'' کو دیکھیے خود بھی ٹھوس ہیں، کلام بھی ٹھوس ہے، جہاں تک خطابت کا تعلق ہے، ہمیشہ شگفتہ بولتے ہیں۔ لیکن جہاں تک چہرے کا تعلق ہے اس سے ہمیشہ غصہ جھلکتا ہے ان کے فرزند ارجمند ابو صالح اصلاحی (جو قامت میں ان کا نصف ہیں اور ویسے بھی دھان پان ہیں) اپنے صبح وشام کے دوستوں میں سے ہیں۔ انھیں بھی معلوم نہیں کہ ان کے اباجان اس قدر متین کیوں ہیں۔!

مولانا حمید الدین فراہی کے شاگرد رشید ہیں۔ آبائی وطن اعظم گڑھ ہے، وہیں پیدا ہوئے، وہیں نشوونما حاصل کیا۔ ''مدینہ بجنور کے ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں۔ مدتوں اعظم گڑھ سے رسالہ ''الاصلاح'' نکالتے رہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ کی رفاقت میں پٹھان کوٹ سے تحریک کا اسلامی کا اجرا کیا۔ اب مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے جڑواں علمی بھائی ہیں انھیں مولانا کا ''اینجلز'' کہہ لیجیے۔ نظریں عقابی ہیں، جن سے جماعت کا نظم ونسق بندھا ہوا ہے۔ ہاتھ میں کوئی عارضہ ہے، اس لیے قلم سے نہیں لکھتے، سوچتے اور ٹائپ کرتے جاتے ہیں۔ امین بھی ہیں۔ اور اصلاحی بھی۔

ان کا خیال ہے ''پاکستانی عورت دوراہے پر'' ہے۔ حالاں کہ وہ اس سے گزر چکی ہے اور اب تبکدے سے میکدے کو جا رہی ہے۔

☆☆☆☆☆

انتظار حسین

بامحاورہ انسان، قد ضرب المثل اقامت کہاوت، چہرہ تشبیب، آنکھیں ساقی نامہ، ناک مصرع طرح، چال میں غزل، ڈھال میں نظم، اہلِ زبان، دھان پان، پیشانی ایک کہانی، آواز میں مسکراہٹ زیادہ آواز کم، قلم جیسے زُلف بر ہم، الفاظ کا جوہری، مطالب کا شناور، بزدل نہ دلاور، دوستوں کا دوست، باقی اللہ اللہ خیر سلا۔ اس کی بات مان کی جائے تو نصف سے زیادہ لکھنے والے پھانسی پر لٹکا دیے جائیں۔ عمر کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ غالب کے رامپوری نسخے کے ہم عمر، یا پھر "مرقعِ چغتائی" کی طباعت کے ساتھ ان کی بھی طباعت ہوئی ہے۔ مزاج کے بارے میں تو کچھ کہنا مشکل ہے، کیوں کہ پایا اور کیسا پایا ہے؟ لیکن قلم گھِساتے میر تقی میر یعنی بد مزاج ہو گئے ہیں۔ "لاہور نامہ" ان کے مقامی جائزے کی جولان گاہ ہے۔ جو کچھ لکھتے، خُوب لکھتے بلکہ خُوب تر لکھتے ہیں۔ اس "لاہور نامہ" ہی کے بطن سے جنگ کے آغاز میں "شہر نامہ" پیدا ہوا تھا، جو،

کھلا ضرُور مگر کھِل کے مُسکرا نہ سکا

ہاں تو زبان بڑی پیاری لکھتے، ہر لفظ مصری کی ڈلی ہوتا ہے۔ لیکن اُنھیں ہماری زبان پر اعتراض ہے کہ پنجابی بولے۔ تو "ق" "س" میں ٹھوکر کھاتا ہے۔ لکھے تو پنجابی کے پیوند لگانے سے چُوکتا نہیں۔ ہمیں ان کی زبان پر اعتراض ہے کہ میرٹھ کے محاورے لاہور کے مقابلے میں کیوں کر مستند ہو گئے اور جس بولی ٹھولی میں نسائیت ہو، وہ کبھی توانا نہیں ہو سکتی غرض اس معاملے میں وہ ابھی تک میرٹھ، دہلی اور لکھنو میں رہتے ہیں۔

حدیث گرچہ ضعیف است راویاں ثقہ اند، پہلے یعنی تقسیم ملک سے قبل لڑکے پڑھایا کرتے اور افسانے لکھا کرتے تھے قلم میں تیز رو تھے آگے نکل گئے۔ "نظام" ہفتہ وار سے منسلک ہوئے تو اخبار نویسی کا چسکا پڑا، پھر یہ چسکا انھیں "مشرق" میں کھینچ لایا، "خرابی" یہ ہے

کہ اپنے احباب کے گنبد سے باہر نہیں نکلتے۔ خوبی یہ ہے کہ لکھتے نہیں، موتی پروتے ہیں۔ آدمی ان کے طنز سے زخمی نہیں ہوتا، بلکہ مزہ پاتا ہے۔ اس عنوان سے ہم انھیں صاحبِ طرز کہہ سکتے ہیں۔

علیک سلیک ان سے بڑی پرانی ہے۔ نشست برخاست کبھی نہیں رہی مسکراہٹوں میں تبادلۂ خیال ہو جاتا ہے۔ اب یہ کہنا دشوار ہے کہ "شاعرانہ ذوق" کس حد تک ہے۔ سُنا ہے کہ اسی "عطار کے لونڈے" سے دوا لیتے ہیں۔

فی الجملہ سیرت وصورت دونوں کے لحاظ سے خُوبرو ہیں۔ اور خُوبروئی پر جان دیتے ہیں۔ حُسن تحریر میں ہو یا تقریر میں چہرے پر ہو یا عمارت میں، کن انکھیوں سے دیکھنے کے شائق ہیں۔ انتظار کرنے، کھنچنے یا دیکھنے کے عادی نہیں۔ نام ہی انتظار حسین ہے اور قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں! ذات کے سیّد، مذہب کے شیعہ، اور بہ قول ظفر علی خاں۔

کچھ شیعیوں ہی کے نہیں مُشکل کشا علیؓ
ہر ان میں سنیوں کا بھی نعرہ ہے یا علیؓ

قصہ کوتاہ آپ ان سے مل کر مایوس نہیں ہوں گے' خوش ہی ہوں گے۔ وہ ایک جیتے جاگتے انسان ہیں۔ البتہ آپ ان سے صرف ملاقات ہی کر سکتے ہیں۔ یہ توقع نہ کیجیے کہ وہ چائے کی پیالی یا پان کا ٹکڑا پیش کریں اور آپ "آداب عرض کرتا ہوں" کہہ کر قبول فرمالیں۔ اس بارے میں سخت کورے ہیں۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان سے کسی محاورے کا پیچ نکلوالیں، کسی ضرب المثل کی چُول ڈھیلی ہو تو کسوالیں یا پھر کوئی نیا لفظ گھڑوالیں اور دیر تک سوچتے رہیں کہ آپ ایک میناکار ادیب سے مل کر آئے ہیں۔ اسی کا نام انتظار حسین، عشاق کی زبان میں دل کا چین، ادب کے نزدیک نصب العین اور گھربار میں نور العین ہے۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر انصاری

(مختار الدین)

ڈاکٹر انصاری سے مجھے ذاتی نیاز حاسل نہ تھا لیکن پہلے پہل میں نے ان کا نام "الہلال" میں دیکھا تھا وہ جنگ بلقان کے موقع پر ہندوستان سے ایک طبی وفد لے کر ترکی جا رہے تھے اور رئیس وفد تھے۔ ان کی اور ان کے ساتھیوں کی ایک تصویر الہلال میں چھپی۔ جس کے نیچے کچھ اس قسم کے الفاظ درج تھے۔

"آپ اسلام کے زخموں کے لیے مرہم لے کر جا رہے ہیں۔ ہم ہندوستانی مسلمان آپ کو تبریک پیش کرتے اور خواہش رکھتے ہیں کہ ان زخموں پر پیار سے پھاہا رکھنا۔ مبادا انھیں تکلیف ہو۔ یہ ترکی کے زخم نہیں اسلام کے زخم ہیں"۔

غالبا ۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء میں وہ ڈاکٹر محمد عالم کے بلاوے پر نیشنلسٹ کانفرنس کی صدارت کے لیے لاہور پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن سے ان کا جلوس نکالا گیا۔ جن لوگوں کا برطانوی سرکار سے رشتہ مودت استوار تھا۔ انھوں نے کالی جھنڈیوں سے زبردست مظاہرہ کیا اور واہی تباہی بکنے میں وہ پھرتی دکھائی کہ آج تک اس کی مثال ناپید ہے۔ ایک فرستادہ نوجوان کارضاکاروں نے خرافات بکنے پر سر پھاڑ دیا۔ اس نے اپنا خون ڈاکٹر صاحب کی اچکن پر مل دیا اور خود موٹر کی چھت پر سوار ہو گیا۔

روزنامہ "سیا[illegible]ت" کے چیف ایڈیٹر خان محمد اسحاق خاں بی۔ اے۔ علیگ مظاہرہ کے لیڈر تھے۔ اور شراب میں دھت ناچ رہے اور غل مچا رہے تھے کہ میں نے اس لیے شراب پی رکھی ہے کہ کانگرس جیسی [illegible]ت نے شراب کا مقاطعہ کر رکھا ہے۔

لیکن اس دھما چوکڑی [illegible] بازی میں ڈاکٹر صاحب متانت کی تصویر بنے بیٹھے تھے اور

اُن کے چہرے پر غصے یا رنج کا کوئی پرتو نہ تھا۔

رات کو موچی دروازے کے باہر احرار نے ایک جلسۂ عام منعقد کیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری صدر تھے۔ انھوں نے فرمایا:

"لاہور کے مسلمانو! تم نے انصاری کے خلاف مظاہرہ کر کے اپنا ہی نہیں مسلمانوں کا منہ کالا کیا ہے۔ اب میں کس منہ سے دہلی جاؤں گا۔ اور پھر دنیائے اسلام کے زخموں کی ہتک کی ہے"۔

لیکن کانگرس ہائی کمانڈ میں اس دن ہی سے یہ خیال نقش ہو گیا کہ انصاری کی بے عزتی میں احرار کا بھی ہاتھ تھا، اور یہی وجہ ہے کہ کانگرس ہائی کمانڈ میں سے بعض افراد کا دل احرار کی طرف سے پھر کبھی صاف نہیں ہوا۔

اجمل اور انصاری دہلی کی آبرو تھے۔ انصاری لاکھوں کماتے اور قوم پر صرف کرتے۔ وہ حیات تھے تو گاندھی جی کے سب سے زیادہ معتمد تھے، ایک سیاستداں کی حیثیت میں ان کا جواب نہیں تھا۔ وہ پنڈت موتی لال نہرو کے پایے کے لیڈر تھے۔ ملک کے اکثر لیڈر ان کی جیب سے پلتے رہے۔ انھوں نے بے شمار قومی کارکنوں کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ اور جب ان کا انتقال ہو گیا تو دہلی کے ہزاروں گھرانے اس طرح روتے تھے۔ جیسے ان کا شفیق باپ اٹھ گیا ہے۔ لوگوں کو اس دن پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ انصاری مرحوم سے سیکڑوں بے سہارا گھرانے ماہوار وظیفہ پاتے تھے۔ اور کسی کو کانوں کان پتہ نہیں چلتا تھا۔

میانہ قد، دوہرا بدن، سفید رنگ، آفتابی چہرہ، روشن آنکھیں جن میں بصارت اور شرافت گتھی ہوتی ہے۔ عموماً سنہری فریم کی عینک لگاتے تھے۔ خوش پوش، خوش خوراک، خوش لباس اور خوش کلام۔

القصہ مرحوم دہلی میں اسلاف کی ایک آخری تصویر تھے۔ اور اب شاید ان اوصاف کے لوگ پیدا ہی نہیں ہوتے ہیں اور ہمیشہ کی نیند سو گئے ہیں۔

☆☆☆☆☆

جسٹس انوار الحق

قدرت بعض آدمیوں کا بنا کر پچھتاتی ہے بعض پر فخر کرتی ہے کہ اس کی منشا کو اس شخص نے گزند نہیں پہنچایا بلکہ توفیق ایزدی سے پورا کیا ہے۔ جسٹس انوار الحق اسی موخرالذکو قبیلے کے فرد ہیں۔ وہ اپنے نام کی تصویر ہیں۔ اب تو وہ جج ہیں۔ لیکن جس زمانے میں انتظامیہ کے فرد تھے اُن دنوں بھی ان کی طبیعت پر قانون وانصاف ہی کا رنگ وروغن چڑھا ہوا تھا۔ قادر بخش رپورٹ نے دولتانہ کے عہدِ وزارت میں بڑی شہرت حاصل کی، کیوں کہ اس کے مندرجات میں بہت سے چہروں کی نقابیں الٹ دی گئی تھیں۔ شیخ انوار الحق ان دنوں سیالکوٹ میں ڈپٹی کمشنر اور ایک ہی سی ایس پی آفیسر تھے، جن کے بارے میں ملک قادر بخش کے قلم سے کلمۂ تحسین واعتراف نکلا تھا۔ اس اقرار وستائش کی گونج بلکہ گرج دور تک چلی گئی اور یہ بات ہر زمانے میں اُبھر اُبھر کر سامنے آتی رہی کہ اس اُجلی سیرت کے لوگ بھی ہم میں موجود ہیں۔ مولانا حسرت موہانی کا ایک شعر ہے

حسرت ہی پہ موقوف نہیں کوئے بتاں سے
لے جانہ سکا کوئی بھی ایمان سلامت،

انوار جس کوبے میں تھے وہاں دامن آلودہ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ دیانت کی ضد خیانت تعاقب میں رہتی ہے انوار اس بازار سے دامن کشاں عدالت کی شاہراہ پر آنکلے کہ اس سفر میں خدا کا خوف ہمراہ رہتا اور دیانت کو اختلاج نہیں ہوتا۔ چناں چہ انھیں کبھی یمین ویسار کا تذبذب نہیں رہا وہ ترکش کے تیر کی طرح ہیں۔ قد میانہ، بدن شاعرانہ، مزاج شاہانہ، طبیعت فقیرانہ، افکار عالمانہ، لہجہ مدبرانہ، گفتار ادیبانہ، چال ڈھال دونوں میں رکھ رکھاؤ۔

آنکھیں تیز وطرار، ناک تیغ آبدار، رنگ گوراچٹا، پیشانی کشادہ، شرافت، ذہانت، فطانت اور دیانت اس جسد خاکی کے عناصر اربعہ، سیرت میں پیچ نہ خم؛ جب رات اور گہری ہو جاتی ہے تو انتظامیہ وانصاف کی مسندوں پر اس قسم کے درخشندہ چہرے دیکھ کر طبیعت کو اطمینان ہوتا ہے کہ انسانوں کو ضمیر کی سچائی زندہ رکھتی ہے اور اس سچائی ہی سے ذہ... ت انسان نشوونما پاتے ہیں۔

سردار اورنگ زیب

خوش خلق اور خوش گفتار، جسامت دوگنی، قامت نشتر سے دوتہائی، داڑھی صفاچٹ، مونچھیں ؟ رنگ گندمی، لیکن اُجلا، چہرے پر جُھریاں ابھر آئی ہیں، دانت مصنوعی ہیں، کھانے کے اور دکھانے کے اور۔

ایک زمانے میں شکارِ مُردہ کے سزاوار تھے، آج کل معلوم نہیں کہاں ہیں۔ انھیں اگر کوئی صدمہ ہے تو صرف یہ کہ نشتر آگے نکل گیا ہے اور وہ رنگون سے لوٹ کر بھی اپنی ہی چوپال پر بیٹھے ہیں۔

اُن کے خلاف لوگوں نے بہت سی کہانیاں جمع کر رکھی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان میں غلو زیادہ ہے، اصلیت کم، وہ مسلم لیگی قیادت ہی کا ایک باز ہیں۔ انھوں نے بُرے وقت میں مسلم لیگ کی بھلی خدمت کی ہے۔ ہمارے بعض دوست قائدِ اعظم علیہ الرحمتہ کے جس "بقیہ السیف" سیاسی خاندان کو جمع کرنے کی فکر میں ہیں اگر وہ اکٹھا ہو گیا تو اورنگ زیب اس سونے کے لیے سہاگہ ہیں۔ ان کی خدمت کا طول و عرض مسلم لیگ کے کسی راہنما سے فروتر نہیں ہے!

ایک انسان کی حیثیت میں وہ بڑے ہی مرنجاں مرنج ہیں۔ اس وقت ان کی عمر کوئی پچپن اور ساٹھ کے درمیان ہے۔ لیکن باتوں میں وہی پچیس اور تیس برس کے نوجوان کا غلغلہ ہے، تمام عمر انگریزوں کے دوست رہے۔ طوعاً یا کرہاً سیاسیات میں گھسنا پڑا۔ اب طوعاً یا کرہاً اس سے الگ پڑے ہیں۔ اور کبھی کبھار میر کا یہ شعر گنگنا لیتے ہیں۔

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس شاعری میں عزتِ سادات بھی گئی

☆☆☆☆☆

صدر ایوب خاں

قد، ترکش کے تیر کی طرح سیدھا، بدن، دوہرا، رنگ، گوار، سُرخ و سفید۔ آنکھیں کچھ سوچتی ہوئیں، کچھ بولتی ہوئیں۔ کچھ کہتی ہوئیں ہر لحظہ متحرک۔ میر ہوتے تو اس عمر میں بھی مطلع کہہ لیتے۔ پیشانی شگفتہ، لیکن جھریوں کی طبع آزمائی سے خالی، چہرہ بہر حال غصہ کی لو دے جاتا ہے۔ جسم سڈول، ہر لباس کے لیے تصویر، ایک بے روک اور بے ٹوک انسان، جو زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند، خود سپاہی، سپاہی کے گھر میں پیدا ہوا۔ سپاہیانہ آغوش میں پلا۔ پنگھوڑی سے تلوار ہنا۔ نوشتۂ ازل ساتھ تھا۔ قدرت نے انگلی پکڑی۔ اتفاقات نے سہارا دیا، حالات نے پشتیبانی کی، سیاسیات نے پٹخنی کھائی۔ جنرل ایوب صدر مملکت ہو گئے فیلڈ مارشل کا تاج پہنا۔ یہ اعتراف کیے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے کہ انھوں نے ملک کو گرد و غبار سے نکالا، سیاسی قمار خانہ توڑا، جو ٹوٹ رہے تھے، انھیں جوڑا، ہوا کا رُخ موڑا۔

لوگ انھیں سپاہیوں کی طرح کھڑ کہتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ پاکستانی فوج ظفر موج کے سردار رہے ہیں اور اب بھی سردار ہی ہیں۔ مزاج عسکری ہے۔ زبان لشکری، ذرا غور کیجیے اردو کے لغوی معنی لشکر کے ہیں اور پاکستان کی قومی زبان اردو ہے اب اگر صدر مملکت کا لب و لہجہ لشکری ہے تو یہ گویا اردو ہی کا لف و نشر مرتب ہو گیا ہے۔

ہر بڑے آدمی کا فیصلہ تاریخ کا فیصلہ بڑی دیر بعد صادر ہوتا ہے۔ صدر ایوب فی الواقع پاکستان کی تاریخ بنا رہے ہیں اور خود تاریخ کی شاہراہ پر ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ عام سیاستدانوں کی طرح بات چھپا کے نہیں رکھتے۔ جو دل میں ہوتا ہے۔ توپ کے گولے کی طرح داغ دیتے ہیں۔ اکل کھرے ٹھیٹ انسان۔ ردیف و قافیہ ملانا نہیں جانتے، لیکن طبیعت کسی موضوع پر بند نہیں۔ طویل مشاہدہ عمیق تجربہ اور گہرا مطالعہ ان کی ذکاوت پر دال ہے۔ محاورہ ہے چونکھی لڑنا۔ لیکن آج کل وہ پنج مکھی لڑ رہے ہیں۔ جب تک فوج میں تھے۔ ان کے سینے پر ملک کے بازوے شمشیر زن کا تمغہ آویزاں تھا۔ اب چھ برس سے

صدارت کا تمغہ بھی لٹک رہا ہے لیکن اس لٹک کے ساتھ کھٹک بھی ہے۔

سیاستدانوں سے نفرت ہے اور وہ بھی خم ٹھونک کر سامنے کھڑے ہیں۔ حمہ ت د، ن کا ایک غول ہے اور تنہاسب سے پنجہ آزما ہیں۔ حادثہ یہ ہے کہ انھوں نے خود بھی اپنے گرد سیاست دانوں کا کچرا جمع کر لیا ہے، جو واقعتہً مسجد کی لکڑی ہیں۔ سو ختی نہ فرو تنی

بعض لوگ دور سے ان پر پتھراؤ کرتے ہیں، لیکن قریب جاتے ہوئے ڈرتے ہیں جن لوگوں نے انھیں نزدیک سے دیکھا ہے اس بات کی تردید نہیں کریں گے کہ ان کے وجود میں دورِ ماضی کے ناقابل تسخیر قلعوں کا بانکپن موجود ہے اور یہ حسن و خوبی خدائے بخشندہ ہی کے کرم سے حاصل ہوتی ہے۔

صدر ایوب خاں کو الفاظ کے اس آئینہ خانہ میں کماحقہ تلاش کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

بابائے اُردو (مولوی عبدالحق)

نام عبدالحق، تخلص اُردو، پیشہ انجمن ترقی اُردو، بظاہر مولوی بباطن پیر مغاں۔

ہاپوڑ (میرٹھ کا قصبہ) سے اٹھے، حیدرآباد پہنچے، دہلی میں آباد ہو گئے۔ آج کل کراچی میں سامان لخت لخت جمع کر رہے ہیں، اُردو ہی ان کا اوڑھنا اور اُردو ہی ان کا بچھونا ہے۔ گویا اُردو ان کے رگ و ریشہ میں خون کی طرح دوڑتی ہے۔

چوں کہ مدۃ العمر ریاستی فضا میں سانس لیتے رہے ہیں۔ بلکہ ریاست کا پانی پی کر پلے اور بڑھے بلکہ بوڑھے ہوئے ہیں۔ اس لیے دماغ و دل کی ساخت میں ریاستی آب و ہوا کا بڑا حصہ ہے۔ ان کی رائے میں کوئی پنجابی شاداب اردو نہیں لکھ سکتا۔ ہاں پنجاب اُن کی اُردو کے لیے روپیہ ضرور دے سکتا ہے کسی نامور پنجابی ادیب کے قائل نہیں۔ اپنے اردگرد انھی لوگوں کو رکھتے ہیں جنھیں قدرت نے چند خصوصیتیں دے رکھی ہیں اپنے ہر معاصر کو بالواسطہ پخنی دینے کے شائق ہیں اور جو اللہ کو پیارا ہو گیا ہے اس کا کفن گھسیٹنے سے کبھی نہیں چوکے۔ علامہ شبلی نور اللہ مرقدہ کا گوشت نوچنے میں انھیں خاص لطف محسوس ہوتا ہے۔ عبادت بریلوی کو، ابوالکلام آزاد سے بڑا ادیب سمجھتے ہیں۔ اور طفیل احمد (امروز) کو حمید نظامی سے بڑا صحافی!

قد بحر طویل میں ہے، رنگ میں ایطاء جلی ہے، آنکھیں سڈول، چہرے پر قصیدے کی تشبیب معلوم ہوتی ہیں، کمر میں اس سن و سال کے باوجود کوئی شتر گربہ نہیں، خود مسجع عبارت سے پرہیز کرتے ہیں۔ لیکن داڑھی مسجع بھی ہے اور مقطع بھی۔

مولانا ظفر علی خاں کے معاصر ہیں۔ انجمن ترقی اُردو کے پہلے سکریزی مولانا شبلی علیہ الرحمتہ کے نقاد، بے چاری اُردو کے بابا ہیں۔ لیکن ''اُردو خانم'' کو جس سوت سے پالا پڑا ہے وہ بنگالہ ہے جو مدخولہ سے بیگم بنتی نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر محمّد باقر

دانش گاہ پنجاب میں شعبہ فارسی کے رئیس، ہر لحاظ سے نفیس، اہل علم کے ہم جلیس، قاآنی کی رعایت سے نزاکت گفتار کو ملحوظ رکھتے ہوئے میرانیس؟ پڑھاتے فارسی، پڑھتے ریزی، لکھتے اُردو اور بیچتے پنجابی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پنجاب مرحوم میں پنجابی اکیڈیمی کے صدر ہیں اور اس کے زیر اہتمام بعض نایاب کتابیں بڑی محنت اور شوق سے برائے افادۂ خواص وعوام شائع کی ہیں۔ آج کل اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل ہیں بعض لوگ انھیں خم گیسو سمجھتے اور شانہ بن کر الجھنا چاہتے ہیں، لیکن اس ذہانت کے ساتھ اڑنگے پر لاکر انھیں پٹخنی ۔ ے جاتے ہیں کہ خود انھیں احساس تک نہیں ہوتا کہ کس کے ہاتھ سے مارے گئے ہیں۔ خود کسی پروار نہیں کرتے۔ دشمنوں کے وار بھی خوشی سہہ جاتے ہیں، لیکن جب کوئی حریف ان کے نرغے میں آجاتا ہے تو رستم واسفندیار کی طرح لڑتے ہیں۔ شورش کاشمیری سے ہمیشہ ناراض رہتے ہیں اور اس کے وجوہ ہیں۔ لیکن وار عقب سے نہیں کرتے، سامنے آکر کرتے ہیں۔ اکل کھرے مسلمان ہیں، اقبال سے انتہائی عشق ہے اور اس کے مطالعے میں شب وروز غرق رہتے ہیں۔ ہیں پاکستانی اور سچے پاکستانی، لیکن:

گھر ان کا نہ دلی نہ بخارا نہ سمرقند

سال میں تین چار ماہ ملک سے باہر مختلف ممالک کی یونیورسٹیوں میں گزارتے ہیں ایران اُن کا وطنِ ثانی ہے۔ ہر شخص کی عزت کرتے، کسی کی دل آزاری کے قائل نہیں اور نہ کسی کو صدمہ پہنچا کر خوش ہوتے ہیں۔ پنجاب مرحوم کے دارالحکومت لاہور کی زندہ دل بستی موچی دروازے میں پیدا ہوئے، گجرات میں پڑھتے رہے، پھر جانے کہاں کہاں کا سفر کیا، دہلی میں تعلیمات کے ڈائریکٹر رہے فوج میں کچھ دنوں پاپڑ بیلے، آخر پنجاب یونیورسٹی سے منسلک ہوگئے اور آج تک اسی کے ہیں۔ چہرہ ضرب کلیم، آنکھیں شعلۂ طور، ناک سوزوساز،

قد طلسم ہوش ربا، بدن دو جلدوں میں، چال میں گئے وقتوں کے استادوں کا رعب داب۔ ڈھال میں انقلاب وانقلاب وانقلاب۔ رنگ ایرانی، خون کشمیری، جسد پنجابی، اہل زبان ان سے کنی کتراتے اور یہ اہل زبان کے کان کاٹتے ہیں، ہر عنوان سے وضعدار، پروفیسر نہ ہوتے تو بریگیڈیر ہوتے، قلم ان کا بھی رواں دواں ہے۔ لیکن ادبیات سے زیادہ عمرانیات پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے جب تک نئی پود کی ذہنی سمتیں درست نہ ہوں گی معاشرے کی کجی نکل نہیں سکتی ہے اور اس جدوجہد کا نام ہے ڈاکٹر محمد باقر۔

☆☆☆☆☆

آقا بیدار بخت خاں

کسی علم دوست قوم میں ہوتے تو اس وقت کئی اعزاز پا چکے ہوتے۔ افسوس ہے اس قوم کے فرد ہیں جس کے ہاں آفتاب کا نور جگنو کی روشنی سے ہار جاتا ہے۔ نصف صدی میں اور ینٹل کالج لاہور نے اتنی خدمت علوم شرقیہ کی نہیں کی جتنی بیدار بخت نے تنہا ان زبانوں کی خدمت کی ہے۔ اِن کی ذات ایک ادارہ نہیں، جامعہ ہے۔ وہ اُردو اور فارسی کے ایک ایسے معلم اور اُستاد ہیں کہ آج صوبے کے طول و عرض میں بلاشبہ ہزاروں افراد ان کے شاگرد ہیں ۔سیکڑوں ان میں سے بڑے بڑے عہدوں پر پہنچ چکے ہیں، لیکن یہ انسان جو اس وقت کہولت کی منزلیں پھلانگ کر بڑھاپے کی سرحد پر کھڑا ہے اُسی ڈگر پر چل رہا ہے جس ڈگر پر اُس نے شروع میں قدم رکھا تھا اور یہی ڈگر اُس کو سب سے زیادہ عزیز ہے۔ وہ کئی ادوار کی ایک جیتی جاگتی تصویر ہیں اُن کا سینہ سیکڑوں سیاسی، ادبی اور تہذیبی تحریکوں کے گم شدہ واقعات کا خزینہ ہے۔ ان کی سوانح عمری میں کئی سانحے ہیں، لیکن وہ اسے قلم بند نہیں کرتے ان کا خیال ہے کہ اس کا لکھنا خالی از خطرہ نہیں۔ شاعر تو اس لیے ڈرتے ہیں کہ

اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔

اور یہ اس لیے ہچکچاتے ہیں کہ نصف صدی کے اُن پُر اسرار واقعات کی طنابیں ٹوٹنے کا اندیشہ ہے، جن کے چہروں پر ابھی تک نقابیں پڑی ہوئی ہیں اور جن کے پیچ و خم یا ظاہر و باطن سے انھیں کماحقہ، آگاہی ہے۔

آقا صاحب مدۃ العمر سے کارپوریشن لاہور کے ممبر ہیں ڈگریاں اتنی کہ ان کے حلقے میں اتنے ووٹ نہیں ہوں گے۔ پنجاب یونیورسٹی کی کوئی سی ڈگری ہوگی، جو ان کے پاس نہ ہو، لیکن قدرت کا تماشا ہے کہ علم بازار میں سر بہ گریبان پھر رہا ہے اور جہالت تخت نشینوں کے مصاحبوں میں ہے۔ راقم نے ان سے عرض کیا:

آقا صاحب آپ بھی کسی عہدہ و منصب کے لیے ہاتھ پاؤں ہلائیے۔ زور کا قہقہہ لگا کے

کہنے لگے ترقی وعہدہ کے لیے تین چیزوں کی ضرورت ہے۔

اول دولت، دوم اُن پڑھ ہونا، سوم ایک ایسی ٹوپی، جو ہر شخص کے پاؤں پر رکھی جا سکے ۔ افسوس کہ میں ان تینوں سے محروم ہوں۔ آقا بیدار بخت غالباً ان کا تاریخی نام ہے ورنہ شورش کاشمیری کا آغا اور بیدار بخت کا آقا دونوں حشو محض ہیں۔

قامت حاجی بابا اصفہانی کے قصے کی طرح طویل ہے، جسامت مقالہ چہار درویش کی طرح مختصر' چہرہ پر اب جھریاں آگئی ہیں، جس سے احساس ہوتا ہے کہ بڑھاپے نے اپنے قلم سے جوانی پر خطوط کھینچ دیے ہیں۔ آنکھیں اب بھی روشن اور متحرک ہیں، اُن پر چشمہ اس طرح کھلتا ہے جس طرح ریشم پر کوئی پھول کڑھا ہو۔ تمام عمر تعلیم و تعلم میں گزار دی۔ آخری عمر میں السنہ شرقیہ کی ناؤ کو ڈوبتے دیکھا تو وکالت پاس کی، آجکل ایڈووکیٹ بھی ہیں۔ حافظ بلا کا پایا ہے۔ میر ولی دکنی سے لے کر عارف عبدالمتین تک ہر شخص کے اشعار نوکِ زبان ہیں۔ گویا ادبیات اُردو کا انسائیکلوپیڈیا ہیں۔ نثر بھی نظم کی طرح حافظے کی لوح پر نقش ہے۔ جہاں تک السنہ اشرقیہ کے نصاب کا تعلق ہے، تمام کتابیں چالیس برس کی معلمانہ زندگی میں حفظ ہو گئی ہیں۔ روپیہ جمع کرنا اپنے کمانے کی توہین سمجھتے ہیں۔ شاہ خرچ اتنے ہیں کہ بادشاہ ہوتے تو سلطنتوں کا دیوالیہ نکال دیتے۔ ہاتھ اور دل دونوں کے سخی ہیں۔ ان سے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ دوست کو نہ دشمن کو! خود دوستوں اور دشمنوں سے متواتر نقصان اُٹھاتے رہے ہیں اور شاید اب بھی اُٹھا رہے ہیں۔

بولتے ہیں پنجابی

لکھتے ہیں اردو

پڑھاتے ہیں فارسی

پہنتے ہیں انگریزی

اور کھاتے ہیں۔ کچھ غم جاناں کچھ غم دوراں

☆☆☆☆☆

(۲)

راقم الحروف کے نام کے ساتھ آغا اور ان کے نام کے ساتھ آقا مشہور ہیں۔ قامت حاجی بابا اصفہانی کے قصہ کی طرح طویل ہے۔ لیکن جسامت مقالہ چہار درویش سے بھی مختصر ہے۔ کوئی صاحب کہہ رہے تھے۔ آقا بیدار بخت تاریخی نام ہے۔ ممکن ہے درست ہو حفیظ ہوشیار پوری سے رجوع کیجیے۔

۱۹۳۵ء میں پہلی دفعہ دوست بنے تھے۔ آج تک یہ رشتہ ٹوٹا نہیں۔ کئی دوست قریب آکر کشش کھو دیتے ہیں، لیکن بیدار بخت کی کشش بڑھتی ہے۔ ان میں کئی خصوصیتیں جمع ہیں۔ مثلاً وہ شاعر بھی ہیں، ادیب بھی ہیں، نقاد بھی ہیں، خطیب بھی ہیں۔ لیکن اصل خوبی یہ ہے کہ وہ ایک اچھے استاد ہیں۔ اُردو فارسی کے ہر شاعر کے تیر و نشتر ان کے نوکِ زبان ہیں انھیں نثر کی کتابوں کے سیکڑوں صفحے ازبر ہیں۔ یہاں تک کہ السنہ شرقیہ پڑھاتے پڑھاتے نصاب کی کتابیں حافظے کا جزو ہو گئی ہیں۔ شاہ خرچ اتنے ہیں کہ بادشاہ ہوتے تو سلطنتیں دیوالیہ ہو جاتیں۔ پیسہ جمع کرنا عیب گردانتے ہیں۔ کسی دوست کو مایوس نہیں کرتے۔ دوستوں کے دوست بلکہ دشمنوں کے بھی کسی حد تک دوست ہیں۔

چہرہ کتابی ہے، لیکن آنکھوں پر عینک چڑھی رہتی ہے، جیسے کسی کتاب کا گردپوش ہوتا ہے۔

بولتے پنجابی

لکھتے اُردو

اور پڑھاتے فارسی

پہنتے انگریزی اور کھاتے چینی ہیں۔

☆☆☆☆☆

بیگم شاہنواز

(جہاں آرا)

پنجابی مسلمانوں میں آزادی نسواں کی داعیہ! جس زمانے میں انھوں نے پردہ اُتار اور "قومی تحریکوں" میں قدم رکھا ان دنوں مسلمانوں میں خال خال گھرانے ہی بے پردہ ہونے کی جسارت کر سکتے تھے۔ اور اب تو ان کا لگایا ہوا پودا خاصا تن آور ہو چکا ہے اور ہر کہیں لالہ زار کھلا پڑا ہے۔

وہ پہلی ہندوستانی خاتون تھیں، جنھوں نے گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ اس کے بعد انھوں نے بعض دوسری کانفرنسوں میں ہندوستانی سرکار کی نمائندگی کا حق ادا کیا۔

ان کی ذہانت کو خود انگریزوں نے سراہا۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد ان کی قابلیت کو طاق نسیان پر رکھ دیا گیا۔ اور اب تو ان کا زمانہ ہی لد چکا ہے۔ ان کی عمر مرجھائی جا رہی ہے اور چہرہ جھریا گیا ہے۔

بالمشافہ گفتگو کبھی نہیں ہوئی۔ البتہ دور کی جان پہچان کافی ہے۔ گذشتہ سے پیوستہ سال مری میں دیکھا تھا۔ غالباً کمر میں خم آ چکا ہے۔ اگر زندگی لوٹ کر آ سکتی تو آپ ضرور اس کو آواز دیتیں، پکارتیں، جھنجوڑتیں لیکن زندگی لوٹتی نہیں، عمر بڑھتی اور زندگی گھٹتی ہے۔

اب وہ ایک صدائے برخواست ہیں۔ ایک غم ہیں، ایک آنسو ہیں۔ اور ایک خاتون کی حیثیت سے ہم سب کے لیے قابلِ احترام!

شاہنواز کی زوجہ، سَر محمد شفیع کی دختر،

جہاں آرا شاہنواز......،

☆☆☆☆☆

پنڈی داس

جہاں آج کل مطبوعات چٹان کا دفتر ہے وہ بلڈنگ انھیں لالہ پنڈی داس کی ہے۔ ان کی جدوجہد کی ایک طویل کہانی ہے۔ وہ پنجاب کے ان بزرگ افراد میں سے تھے جنھوں نے زندگی کا سکھ ورثہ میں نہیں پایا تھا، بلکہ خود کمایا تھا۔

جن دنوں گاندھی جی ابھی جنوبی افریقہ میں اپنی ستیہ واہنسا کا تجربہ کر رہے تھے، لالہ پنڈی داس کا شمار پنجاب کے سرفروش نوجوانوں میں ہوتا تھا۔ غالباً وہ پہلے قافلے کے ان نوجوانوں میں سے تھے جنھوں نے پنجاب میں برطانوی بیخ وبنیاد کو چیلنج کیا اور عمر بھر کے لیے قید کی سزا پا گئے۔

بڑے ہی خلیق، بڑے ہی متواضع، سراپا عجز، سراپا محبت۔ قددرمیانہ، رنگ گندمی، آنکھوں پر شیشے چڑھے ہوئے، لہجہ ملائم، زبان میں شرینی، ہندو مسلم اتحاد کی دلآویز تصویر۔ مولانا ظفر علی خاں کہا کرتے تھے، "پنجاب میں صرف دو ہندو خاندان ہی ایسے ہیں جہاں مذہب کے تنفر کا سایہ تک نہیں اور تمام افرادِ خاندان دیش بھگت ہیں۔"

اولاً۔ سردار کشن سنگھ کا خاندان جو سردار بھگت سنگھ شہید کے والد ہوتے ہیں۔

ثانیاً لالہ پنڈی داس کا خاندان کہ ان کی چاروں بیٹیاں سودیش کماری آدرش بالا۔ ستیہ کماری اور سوراج کماری۔ ملک کی جدوجہد آزادی میں سرعنوان تھیں۔

آج لالہ جی کی عمر ستر کے لگ بھگ ہے۔ لیکن اس کہنگی میں بھی اُن کے وجود میں جوانی کی رمق باقی ہے۔ اور وہ دہلی و لاہور کو ایک ہی نظر سے دیکھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

پیر زکوڑی شریف

دراز قد، گورا رنگ، بھوی آنکھیں، گھنی سیاہ داڑھی، سادہ مزاج، سادہ طبیعت، فہمید، اور سنجیدہ۔ ایک دفعہ ان کے ہاں خانقاہ میں ان کی تقریر سنی ہے۔ پشتو اس تیزی سے بولتے ہیں، جیسے کوہستانوں میں من چلے پٹھان گولیوں سے کھیل رہے ہوتے ہیں۔ الفاظ میں بلا کا بہاؤ اور فقروں میں غضب کا تسلسل۔ بادلوں کی کڑک اور بجلی کی دھمک لیکن اردو ذرا ٹھہراؤ سے بولتے ہیں۔ یعنی قاف، شین کے بغیر تذکیر و تانیث کا امتیاز افغان الاصل ہونے کے باعث غائب غلہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے ہر سوال کا جواب کھٹ سے حاضر کر دیتے ہیں پیر نہ ہوتے تو سیاست داں ہوتے۔ چونکہ پیر ہیں اس لیے سیاست دانوں کے داؤں سے محترز رہتے ہیں۔

راقم الحروف نے ان کے ایک جلسے کا منظر خود دیکھا ہے۔ ہزاروں مرید کندھوں پر بندوقیں لیے حاضر تھے۔ آپ نے گھنٹہ سوا گھنٹہ پشتو میں تقریر کی۔ حاضرین میں سے نوے فیصد کے چہرے اشکبار تھے۔ سب نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اعلان کیا کہ وہ خان عبدالقیوم کی مطلق العنانیت سے بیزار ہیں۔ کچھ دنوں بعد پیر صاحب گرفتار کر لیے گئے اور انہیں مچھ جیل (بلوچستان) میں غالباً اڑھائی برس تک رکھا گیا۔ آج کل اپنے ہی گھر میں پابند ہیں۔ ایک دفعہ خان عبدالقیوم خان کی تصویر دیکھ کر کہہ رہے تھے۔

الٰہی جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے؟

☆☆☆☆☆☆☆

پیر مانکی شریف

قد میانہ، بدن دوہرا، چہرہ شگفتہ، مہرہ شرعی، رنگ سفید سر تاپا کھدر پوش، طبیعت میں شرافت، خون میں نجابت، کبھی سرحد میں مسلم لیگ کا عنوان جلی تھے، آج ایطاء جلی ہیں۔ کہا جاتا ہے، انقلاب کامیاب ہونے کے بعد سب سے پہلے اپنے ہی بچوں کو کھاتا ہے اور اس کی بیّن مثال پیر مانکی اور پیر زکوڑی ہیں۔ ان دونوں بزرگوں نے سرحد کے کوہستانی علاقہ میں مسلم لیگ کو گونجایا۔ لیکن انجمن آراستہ ہوگئی، تو ان پر وہی گزری، جو اس سے پہلے غالب پر گزر چکی تھی:

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

خان عبدالقیوم انہی کی تصنیف ہیں، اور یہ قوت کا خاصہ ہے کہ وہ دوستوں کی پیٹھ میں بھی چھرا گھونپنے سے نہیں چوکتی۔

پیر مانکی شریف مروجہ مفہوم میں کوئی لمبے چوڑے سیاستدان نہیں اور نہ سازشی ذہن کے آدمی ہیں، وہ ایک سیدھے سادھے انسان ہیں۔ ان کے قول و فعل میں بھی چندانیوں تضاد نہیں۔ کم گو ہیں، کم آمیز ہیں۔ مجھے اس کی خبر نہیں کہ ان کی دینوی حیثیت کیا ہے، لیکن جہاں تک دینوی وجاہت کا تعلق ہے، یہ ایک کھلا راز ہے کہ قائداعظم نے انہیں وزارت کی پیش کش کی، اور انہوں نے انکار کیا۔ وہ چاہتے تو صوبہ سرحد کے وزیراعظم بھی بن سکتے تھے۔ وہ محض پیر نہیں ایک طبّاع نوجوان ہیں اور سیاسی سوجھ بوجھ میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ آج وہ سامانِ لخت لخت جمع کر رہے ہیں۔ مگر ایک دن ایسا بھی آسکتا ہے کہ ان کے حریف دلِ لخت لخت لے کر نکلیں اور لوگ ان پر قہقہے لگائیں۔ اور انقلاب قہقہوں اور آنسوؤں ہی کی ایک المیہ کہانی ہے۔

☆☆☆☆☆
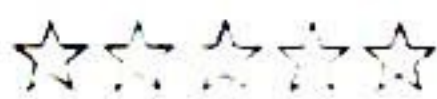
محمد دین تاثیر

تاثیر فی الواقع مجموعہ، اضداد تھے، لیکن ان کی خوبیاں منفرد تھیں مثلاً وہ باغ و بہار طبیعت کے مالک تھے۔ جہاں بیٹھتے شمع محفل ہوتے، ہر موضوع پر بے تکان بولتے، دوستوں کو کھلانے میں بھی بے تکلف اور ان سے کھانے میں بھی بے تکلف، بلا کے ادبی لڑویے، لیکن ذاتیات سے مجتنب، جس فرد یا جماعت کے متعلق دل میلا کر لیتے، اس کی بنیادوں کو بھی ہلانے سے نہ چوکتے، لیکن کبھی سامنے سے وار نہ کرتے، عموماً پشت ہی سے خنجر بھونکتے تھے، اور مقتول کو خبر بھی نہ ہونے دیتے تھے۔ ان کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ یار باش تھے۔ گفتگو طراز تھے، بذلہ سنج تھے، حاضر جواب تھے، نکتہ سنج تھے، شعر و انشا کے کسی، میدان میں ان کا رہوار قلم تھکا نہیں۔ وہ پہلے ادیب، شاعر، یا نقاد یا مدیر تھے، جنھوں نے اُردو ادب میں تنقید کے جدید رجحانات کی نیو اٹھائی، بلاشبہ وہ پنجاب میں ترقی پسندوں کے پیشوا تھے، انھوں نے خیالات کی جدید راہوں سے نوجواں پود کو باخبر کیا، فیض احمد نے ان کی موت پر مانا تھا کہ تاثیر ان کا محسن بھی، تھا اور استاد بھی "نقش فریادی" کی نوک پلک کے سنوارنے اور خیالات کے نئے تجربوں کو ابھارنے میں تاثیر کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

۱۹۳۵ء سے ۱۹۵۰ء تک اہل پنجاب کی جدید ادبی تحریکیں شعوری یا غیر شعوری طور پر تاثیر سے متاثر ہوتی رہی ہیں، تاثیر اس دوران میں ایک احتجاج تھا۔ قدامت کے خلاف اس نے اسلوب و بیان کے بتوں کو توڑنے میں بڑی ہمت سے کام لیا۔ وہ ایک بانکا پھکیت تھا اس کا مارا ہوا سانس تک نہیں لیتا تھا۔ وہ ایک لبت سالہ ادبی تاریخ تھا جس میں قدما کی خلاف تضحیک تھی یا طنز، اور پھر اس کے ساتھ جذبہ تھا یا اخلاص۔ طبعاً آزاد منش تھا لیکن بعض معاملوں میں انتہائی معتمد اس کی طبیعت میں قرار الشاذ کالمعدوم تھا، اس کے خیالات اکثر و بیشتر کا نٹا بدل لیتے تھے، لیکن اس کا علم بہت وسیع تھا وہ مشرق و مغرب کے علوم کی ایک جامع شخصیت تھا۔ اور شاید آج پنجاب میں اتنا باخبر آدمی کوئی نہیں ہے۔ وہ ایک نگینہ تھا، جو کسی بھی

انگوٹھی میں جڑا جا سکتا ہے۔ اور ہر کہیں جگمگاتا ہے، میانہ قامت، کھلا ماتھا، گندمی رنگ، متحرک آنکھیں دہرا بدن ہنس مکھ، آواز میں دبدبہ، اردو میں تیز اور انگریزی میں طرار۔

ابوالکلام سے لے کر جانباز تک اور قائداعظم سے لے کر شمس الحق تک کا تابع۔ کبھی دوستوں سے گلہ نہ کرتا، لیکن اس کے دوست سے ہمیشہ شاکی رہتے، وہ دوستی کے بارے میں قول و فعل کے تضاد کا شکار ضرور تھا، لیکن اس کا عقیدہ تھا۔ ہم کہاں کے بادشاہ ہیں کہ ایک دوسرے کے گریباں پھاڑتے پھریں۔

وہ لوگ جو زندگی میں اس کی دھجیاں تک نیلام کے چبوترے پر لے آئے تھے، اس کی موت پر جی جان سے آبدیدہ تھے۔ اور سچ تو ہے کہ غالب کے اس شعر میں تاثیر کی تمام و کمال سیرت منعکس ہے:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے!

☆☆☆☆☆
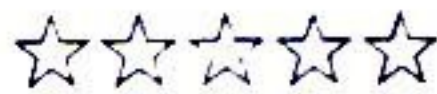
ماسٹر تاج الدّین انصاری

چہرہ پر ''ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا'' کی صدا دیتی ہوئی شکنیں، ماتھے پر جھریوں کی چُنت، آنکھیں اندر خانہ تیز و طرار، لیکن اب گئے وقتوں کی راز دار، اور صورتِ حال پر اشکبار، دبیز شیشوں کے پس منظر میں ''جوانی چنانکہ اُفتد دانی'' کا گرد و غبار، رنگ اس عمر میں بھی سرخ و سپید، لیکن تھوڑی سی زردی نے مالٹے کی سی رنگت بنا دی ہے۔ چندیا کے بال غائب، ریش کے بال سفید، جیسے گرمی کے دنوں میں آفتاب کے جلال سے مطلع صاف ہوتا ہے۔ زبان میٹھی، لہجہ شکر، چال میں عجز، ڈھال میں نیاز، قد میانہ یا اس سے ذرا نکلتا ہوا، ذہانت ہم رکاب، لیکن قدم پھونک پھونک کر رکھتے، اور لفظ سوچ سوچ کر بولتے ہیں۔ تقریر میں تحریر، اور تحریر میں تقریر۔ کوئی شخص ان سے ہمکلام ہو کر یہ اندازہ نہیں کر سکتا، کہ پنجابی ہیں۔ محسوس ہوتا ہے جیسے جمنا پار سے آئے ہیں۔ آبائی وطن لدھیانہ ہے، پنجابی اور ٹھیٹھ پنجابی ہیں۔ لیکن زبان لکھنؤ اور دہلی کی بولتے ہیں، دونوں کے روزمرہ پر عبور حاصل ہے۔

تحریک خلافت میں گھر سے نکلے اور رضا کاروں کی جمعیت کے سالار ہو گئے طبیعت کے شگفتہ پن اور زبان کے تیکھے پن نے پروان چڑھایا، پھر قومی خدمت گذاری گویا اوڑھنا بچھونا ہو گئی، ساری عمر اسی تانے بانے میں میں گزری ہے۔ جماعت احرار کی بنیاد پڑی تو اس کے رہنماؤں کی صف میں آ گئے، ان کے مشوروں کو اصابتِ فکر اور علو خیال کا شہ پارہ سمجھا گیا، ہر شخص کے نزدیک محترم رہے، ان کی باتوں کو غور سے سُنا گیا، اور اکثر و بیشتر بحث و تمحیص کے بعد ان کا مغز قبول کر لیا گیا۔ وہ لڑائی کے وقت بھی لڑائی کے موڈ میں نہیں ہوتے، دشمن کو رام کرنا اور حریف کو سرنہ ہونے دینا، ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے، باتیں سیدھی سادھی کرتے، لیکن مطالب سیاستدانوں کی طرح پیچ و خم میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ مزاج میں گرمی مطلقاً نہیں۔ ہر بات کو ٹھنڈے دل سے حل کرنے کی فکر میں رہتے، حتیٰ کہ طوفانوں

میں بھی برف کے تودے کی طرح بہتے ہیں۔ ان کے لب لہجہ سے کسی کو شکایت نہیں ہوتی، وہ نہ شکار ہوتے اور نہ شکار کھیلنے عادی ہیں، لیکن جب کوئی اڑتی چڑیا کے پر گنتا ہے تو فوراً ہی شکار کرتے ہیں۔ زندگی ان کی انتہائی سادہ ہے، ان کے ہاں خیال کا عیش بھی نہیں۔ قرونِ اولیٰ کے جن مسلمانوں کے طرز بود و ماند کا ذکر تاریخ میں ملتا ہے۔ ان کا ہو بہو نمونہ ہیں۔ پیغمبری وقت کا محاورہ ان کے قد و قامت پر خوب بیٹھتا ہے۔

پاکستان بنا تو احرار کے صدر ہو گئے۔ یہ وقت نازک بھی تھا اور پیچدار بھی۔ ان کا یہ کمال تھا کہ اس کشتی کو کنارے پر لے گئے، اور ڈوبنے سے بچا لیا، جو اس سے پہلے ناخداؤں کی بدولت طغیانیوں کے رحم و کرم پر تھی۔ احرار کے "جی دار" رہنماؤں میں بعض بٹ گئے بعض ہٹ گئے، بعض قبروں میں چلے گئے، جو رہ گئے ان میں وہ اعتدال یا تناسب نہ تھا، جو کسی تنظیم کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہوتا ہے۔ آپ نے اس خلا کو محسوس نہ ہونے دیا، اور جلد ہی اپنی ذہانت کا سکہ منوالیا منیر انکوائری کمیٹی کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ ماسٹر تاج الدین انصاری داؤں پیچ کے انسان ہیں ہائے میر تقی میر نے کیا عمدہ بات کہی ہے:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

اور اس گئے دور میں ان پراگندہ طبع لوگوں کے میر مجلس کا نام تاج الدین انصاری ہے۔

☆☆☆

مولانا تاج محمود لائل پوری

چودھری افضل حق مرحوم نے "تاریخِ احرار" اُن گمنام احرار دوستوں کے نام انتساب کی ہے، جن کی گمنامی سے احرار راہنماؤں نے ناموری حاصل کی...... مولانا تاج محمود اس گئے دور میں احرار کے ایسے ہی مخلص ساتھی ہیں، بلکہ احرار مرحوم کے ویرانہ آباد میں اگر شاہ جی دل ہیں، محمد علی جالندھری دماغ تو قاضی احسان احمد اور مولانا تاج محمود دو بازو ہیں۔

تحریک ختم نبوت میں جن احرار قیدیوں کو قلعۂ شاہی کی زیارت نصیب ہوئی، ان میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ خلوتیان راز کا کہنا ہے کہ تاج محمود اپنی پامردی اور جواں مردی میں منفرد رہا "احرار قلعہ" میں کوئی بھی ان کا ہم پایہ و ہم مرتبہ نہیں تھا۔

احراری خصوصیت کے بر عکس تاج محمود کوئی بڑے مقرر نہیں، خود بھی ٹھوس، کام بھی ٹھوس۔ دُھن کے پکے، بات پر مر جانے والے ایثار پیشہ، فارسی، اردو، عربی کے شناور۔ دوستوں کے لیے موجِ رواں، دشمنوں کے لیے برقِ تپاں، مرزائیت کے دشمنِ جانی، اسلام پر جی جان سے عاشق، معاملہ فہم، سیّد عطاءاللہ شاہ بخاری کے مجنوں، بلکہ صحرانوردی میں قیس عامری کو میلوں پیچھے چھوڑنے والے، انتہائی وضع دار، انتہائی خوددار، خوف ان کی چمڑی میں نہیں، شعر و شاعری میں ان کا مذاق ستھرا، ادب کی نوک پلک سے واقف، دیانتدار، احرار کے لیے کوڑی کوڑی جمع کرتے اور کوڑی کوڑی جمع رکھتے ہیں۔

قامت میانہ، جسم دہرا، رنگ سانولا، آنکھیں مسکراتی ہوئی، پیشانی کشادہ، ماتھے پر ہلکی پھلکی لکریں...... خوش گفتار اور خوش کردار القصہ...... سراپا اس شعر کی تفسیر ہے:

بہت جی خوش ہوا کل جوش سے اے ہمنشیں مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں!

☆☆☆☆☆

(۲)

احرار راہنماؤں کی دوسری صف میں صفِ اوّل کے راہنما، دل کے غنی، زبان کے دھنی، بات نیزے کی انی، شاہ جی کے عشق اور افضل حق کے فکر کی تصویر، صحیح العقیدہ مسلمان، لائل پور کے زندہ دلوں کی روح رواں، بے عیب اللہ کی ذات ہے، لیکن کوئی سی معصیت بھی ان کے خیال کو چھو کر نہیں نکلی، ایک اُجلا اور صاف ستھرا انسان جو شاید دھوکا کھا سکتا ہے، لیکن دھوکا دے نہیں سکتا۔ عربی کی مشہور کہاوت ہے کہ حسن وہ ہوتا ہے، جس کا سوکنوں کو بھی اعتراف ہو۔ تاج محمود کے مخالف بھی اس کی ایمانداری پر گواہی دیتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہر شخص، ہر شخص سے متفق ہو یا ہر انسان کو ہر خیال سے اتفاق ہو، تاج محمود کے خیالات سے اختلافات ہو سکتا ہے، اور لوگوں میں اس قسم کے اختلافات ہمیشہ ہی رہے ہیں۔ تاج محمود بہر حال ایک انسان ہے، اُس سے بھی لوگوں کو اختلاف ہے اور رہے گا۔ لیکن یہ شہادت کہ وہ ایماندار ہے، مخلص ہے، صاحب عزم ہے اور ناقابل خرید ہے ایک ایسا اعزاز ہے، جو اس دنیا میں معاصرت کے دربار سے شاذ ہی کسی کو ملتا ہے۔ ان کے سامنے صرف ایک ہی دنیا ہے اور وہ حضور سرور کونین ﷺ کے عشق و محبت کی دنیا ہے۔ حضور ﷺ کی ذات اقدس سے انھیں بے پناہ محبت ہے، اس میں سر مو فرق نہیں۔ اس معاملے میں مسلمان بھی ہیں، مومن بھی، قلندر بھی ہیں، مجذوب بھی، سالک بھی ہیں، صوفی بھی، مجاہد بھی ہیں اور غازی بھی۔ حتیٰ کہ اس عشق کی تیغ جگر دار کا ہم انھیں شہید بھی کہہ سکتے ہیں:

اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

قد دراز، طبیعت پر گداز، مزاج میں سوز و ساز، شوق میں پرواز، سیرت میں اعجاز، عمر میں جوانی کا ولولہ، رنگ گندمی، ماتھا کھلا، آنکھیں روشن، ناک ستواں، رفتار میں تحمل، نمو میں تجمل، دل آئینہ، سادہ فطرت، سادہ سرشت عیب بیں نہ عیب چین، اقبالؔ کے تخیلی مسلمانوں میں سے ایک۔

☆☆☆☆☆

تاجور نجیب آبادی

نام احسان اللہ خاں، تخلص تاجور، وطن نجیب آباد، پیشہ معلّمی و مدیری تھا۔ دو بیویوں کے شوہر اور پانچ بچوں کے باپ تھے۔ معنوی اولاد کا کوئی ٹھکانا نہیں!

ایک فرد نہیں ایک ادارہ تھے۔ بیسیوں شاعروں کو پروان چڑھایا اور دسیوں ادیبوں کو لکھنا سکھایا۔ قلم میں زور تھا۔ زبان میں نفاست۔ زندگی بھر شعر کہتے رہے۔ لیکن کلام کا بہت سا حصہ تقسیم ہو گیا۔ کچھ خواتین لے گئیں، کچھ شاگردوں نے اڑنچو کر لیا۔ کچھ آئی سی ایس افسروں کی نذر ہو گیا، جو بچا اس میں شاعری تھوڑی متانت زیادہ ہے۔

دیوبند سے فارغ التحصیل ہو کر لاہور پہنچے تو علم و افلاس میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ ادھر ادھر ٹھوکریں اٹھاتے پھرے۔ اسی اثنا میں منشی فاضل کا امتحان دے ڈالا اور پنجاب یونیورسٹی میں فرسٹ آئے۔

مخزن کی ایڈیٹری کی، ہمایوں میں نائب مدیر ہو گئے، دیال سنگھ کالج میں اردو کے مدرس مقرر کیے گئے۔ وہاں سے کالج کا رخ کیا اور مرتے دم تک پروفیسر رہے۔

ادھر پنجاب میں نیاز مندان لاہور کسی کو ٹکنے نہیں دیتے تھے۔ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ادبی دنیا نکالا۔ بچوں کے لیے پریم جاری کیا۔ ان دونوں سے دست بردار ہو گئے تو شاہکار نیرنگی۔ اور سچ تو یہ ہے کہ چومکھی لڑتے رہے۔ جن نیاز مندوں سے نیاز فتح پوری اور سیماب اکبر آبادی مار کھا کر بھاگ گئے تھے۔ ان سے مرتے دم تک آنکھیں ملاتے رہے۔

ایک زمانے میں ان کے لکھے ہوئے اردو نصاب ہائی کلاسز میں پڑھائے جاتے تھے۔ وہ ... کے لیے ... وں کے نام پر کتابیں لکھ دیتے تھے۔ آج بھی ایک بڑے ادارے کا مالک ان تحریروں کے اپنے دم سے پنپتا ہے۔ مگر جب وہ رحلت کر گئے تو محکمۂ تعلیم نے ان کے ... کیے ہوئے نصاب کو مسترد کر دیا۔ ان کی ذات کا تو لحاظ ہو سکتا تھا، لیکن ان کی موت سے عداوت ...

سے نصاب یا اولاد کا مسئلہ ہی نا قابلِ اعتنا ہے؟

درمیانہ قامت، فربہ بدن، گورا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، یکمشت داڑھی، عموماً سرمہ لگاتے تھے۔ ہمیشہ ترکی ٹوپی پہنتے تھے، عام پہناوا شیروانی اور کھلے پائنچے کا پاجامہ تھا۔ بہ قول شورش کاشمیری: سخت عشق تھانوی، خود بھی ٹھوس تھے اور کلام بھی ٹھوس۔ لہجہ میں شرافت تھی۔ بڑی صاف اور بامحاورہ اردو بولتے تھے۔ ہر نوجوان کا دل بندھاتے۔ بڑے بڑے شاعروں کو موضوع اور مضمون دیتے۔ وہ اس پر طبع آزمائی کر کے لاتے تو قطع و برید فرماتے۔ اکثر مسلمان نوجوان تو ان سے خوشہ چیں تھے ہی لیکن بہت سے ہندو، سکھ نوجوانوں کو بھی اردو کی ڈگر پر لانے میں آپ کا ہاتھ تھا۔ میں نے اساتذہ میں ان سے بہتر شعر و شاعری میں مشورہ دینے والا کوئی شخص نہیں دیکھا۔ وہ صحیح معنوں میں استاد تھے۔ انھیں زبان کے قواعد و ضوابط اور شعر و سخن کے عروضی لوازم کی ذرا ذرا پلک کا علم تھا۔ اور جو کچھ جانتے تھے وہ تلامذہ کے دل میں اتار دیتے تھے۔ خود علامہ انور شاہؒ کے شاگرد تھے۔

جب کبھی ان کی تصویر سامنے آتی ہے۔ سوچا کرتا ہوں کاش نہ مرتے۔ لیکن موت سے کس کو رستگاری ہے۔ بارہا ایسا محسوس ہوتا ہے۔ وہ مرے نہیں زندہ ہیں۔ بایں ہمہ کہ وہ طبیعت کے نرم تھے۔ آنکھوں میں شرم تھی اور عموماً رکھ رکھاؤ سے بات کرتے تھے لیکن ان کی شخصیت میں جو کھنچاؤ تھا وہ بڑا ہی پیارا تھا۔ چند قدم چلتے تو ہانپنے لگتے تھے۔ تانگہ والوں سے سخت دشمن تھے کسی کنسٹیبل کو کسی تانگے والے کا چالان کرتا دیکھ لیتے تو عام لوگوں کے عکس رنگ پر زور دیتے تھے ایک دفعہ وجہ پوچھی تو طرح دے گئے تاہم کسی سے پتہ چلا کہ کسی تانگہ والے نے ایک دفعہ آپ کے بھاری بھر کم بدن پر پھبتی کسی تھی،

مولانا: (تانگہ والے سے) فلیمنگ روڈ چلو گے۔؟

تانگے والا: جی ہاں!

مولانا: کیا لو گے؟

تانگے والا: [illegible] پیسہ،

مولانا: [illegible] بلکہ کنہیا لال [illegible] نک روڈ تک؟

تانگے والا : جی ہاں،

مولانا : بارہ آنے ملیں گے۔

تانگے والا : تو حضرت دو پھیرے کر لیجیے، نصف پہلے چھوڑ آتا ہوں نصف پلٹ کے لے جاؤں گا....."

اور یہ تھے مولانا تاجورؔ!

☆☆☆☆☆

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

صوفی تبسم اور ملکہ ترنم دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں، دونوں عمر کے آخری دور میں ہیں لیکن دونوں میں سن و سال کی کہنگی کے باوجود جوانی کی اُمنگ اور ترنگ، آہو کی طرح چوکڑی بھرتی ہے۔ نور جہاں کی آواز میں نشہ ہے اور نشہ بھی شراب کا کہ

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

تبسم کا نشہ عادت کا نشہ ہے کہ پختہ ہو کر فطرت بن جاتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ غلام مصطفیٰ تبسم کے صوفی کہلانے کی وجہ کیا ہے؟ تو نہ آغا شورش کاشمیری کے آغا ہونے کی وجہ سمجھ میں آئی نہ ان کے صوفی ہونے کی، کیوں کہ تصویر سے انھیں اتنا ہی لگاؤ ہے جتنا لتا منگیشکر کو اسلام سے، صوفی صاحب ہیں وضعدار، رکھ رکھاؤ خوب جانتے ہیں۔ ادیب بھی ہیں، شاعر بھی، انھیں دیکھ کر گئے وقتوں کے اوبا یاد آجاتے اور پچھلی روایتوں کی ٹیسیں دل و دماغ کا احاطہ کر لیتی ہیں۔ فارسی کا ذوق نہایت عمدہ پایا ہے۔ اُردو کے استاد رہے، کئی کتابوں کے مولف، مترجم، مصنف اور مرتب ہیں۔ اپنا دیوان بھی چھپا چکے ہیں۔ فارسی، اُردو اور پنجابی میں یکساں اعتماد کے ساتھ غزل کہہ لیتے، اور اوزان و بحور پر رکھتے ہیں۔

کسی فرد یا ادارے کے خلاف زبان طعن نہیں کھولتے اور نہ اپنے طائفے کے سوا کسی کی تحسین کرتے ہیں۔ جوان تھے تو نیاز مندان لاہور کے سرخیلوں میں رہے۔ بوڑھے ہو گئے تو ستاروں سے دوستی کر لی۔ یعنی گردون گرداں کی زبان میں زہرہ و ناہید کے ہو گئے۔ جی خوش رکھنا انہیں خوب آتا ہے۔ عمر خیام نے بھی بڑھاپے کو اتنا خوش و خرم نہیں رکھا ہوگا جتنا انھوں نے، ان کی کبر سنی لی فاختہ کی طرح اُڑی پھرتی ہے۔

تمام عمر گورنمنٹ کالج کے اُستاد رہے۔ جب تک پاکستان نہ بنا تھا ان کی حلقہ، سخن میں پسران پچھمن و رام تربیت پاتے تھے پاکستان بنا تو بتان آذری کے اُستاد ہو گئے۔ قلم کے ہو کے

رہتے تو قلم تلوار ہوتا۔ صرف شاعری کرتے تو بڑے بڑے میر تقیوں سے جگہ خالی کرالیتے۔ انشا کی طرف آتے تو صاحبِ طرز ادیب ہوتے لیکن زندگی کو اس طرح نچوڑا کہ خون کا ہر قطرہ جام وسبو کی نذر ہو گیا لیکن ان کے سامنے آتے ہی گردن جھک جاتی ہے کہ ہم ایک قابل تعظیم استاد کے روبرو ایستادہ ہیں اور وہ ہم سے کچھ لے نہیں رہا بلکہ ہمیں کچھ دے ہی رہا ہے۔

☆☆☆☆☆
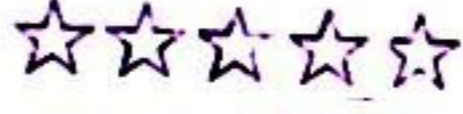
رابندر ناتھ ٹیگور

رابندر ناتھ ٹیگور ہندو مائی تھالوجی کی صحیح ادبی تصویر تھے۔ گاندھی جی انھیں "گورودیو" کہتے تھے۔ ان کے شعروں میں صحیح نغمہ تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا قلم فنون لطیفہ کا جوہر کھینچ کر تیار کیا گیا ہے۔

شہنائی کے بول، گنگا کی لہریں، جمنا کا تموج، ہمالیہ کا طنطنہ، گوپیوں کا رقص، ان کے ہلکورے، کہکشاں کا نور، آبشار کی دھنیں، عورت کی چترائی اور گلاب ر سمن کی نزاکت، ان کی عمارت فکر کے اجزا تھے۔

اقبالؔ جگاتا رہا، ٹیگور سلاتا رہا، اقبالؔ جھنجھوڑتا رہا، ٹیگور جھلاتا رہا۔ دونوں عظیم شاعر تھے۔ لیکن ایک جدال و قتال کی دعوت دیتا تھا اور دوسرا نغمہ و نور کے اس جزیرے میں لے جاتا تھا۔ جہاں آکاش کی اپسرائیں ہم آغوش ہوتی ہیں۔

سنہ ٹھیک یاد نہیں رہا، لیکن پندرہ بیس برس کی بات ہے۔ ٹیگور میرے جگری دوست پربودھ چندر کی دعوت پر لاہور آئے تھے۔ دوسری تقریبوں میں شمول کے علاوہ انھوں نے رشی بھون میں ریلوے روڈ پر اپنے ہاتھ سے آم کا ایک پودا لگایا تھا۔ وہ پودا اب جوان ہو چکا ہے۔ اور میں جب بھی ادھر سے گزرتا ہوں میری نظر اس پر ضرور اٹھتی ہے ... غالباً وہ درخت گیتانجلی ہی کا ایک ورق ہے۔ لیکن اس کی چھاؤں عرصے سے پامال ہو چکی ہے۔

ٹیگور چہرے مہرے کے اعتبار سے "مہرشی" تھے، مسلمانوں میں ہوتے تو ممکن تھا قوم انھیں امیر خسرو ثانی کہتی۔ چوں کہ ہندوؤں میں تھے، اس لیے ان کی ذات کے اردگرد عقیدت کے تمام تانے بانے بُن دیے گئے تھے، جن سے ہندوستانی تہذیب ممیز ہے۔

☆☆☆☆☆

جگر مراد آبادی

یہ قیام پاکستان سے پہلے کی بات ہے۔ جگر ایک مشاعرے میں شامل ہونے کے لیے لاہور تشریف لائے۔ اور حسبِ معمول شیخ عبدالمالک (کرنال شاپ) کے ہاں قیام کیا۔ میں ان دنوں اس علاقے میں نظر بند تھا۔ ایک دوست کھینچ کھانچ کے ملاقات کو لے گئے۔ اتنے میں وہاں اوباش لوگ بھی آ گئے۔ انھوں نے جگر صاحب کو ڈانٹنا شروع کیا۔ معلوم ہوا کہ معاوضے کا جھگڑا ہے۔ جگر پانچ سو روپے مانگ رہے تھے اور یہ پہلے سے فیصلہ ہو چکا تھا۔ لیکن منتظمین اب دو سو روپے دے کر ٹرخا دینا چاہتے تھے۔ جگر نے صدر مشاعرہ سردار شوکت حیات سے شکایت کی تو پتہ چلا کہ منتظمین پانچ سو روپیہ لے چکے ہیں۔ اور خود ڈکارنا چاہتے ہیں۔ اس شکایت نے منتظمین کو بھڑکا دیا۔ وہ نامور غنڈے تھے۔ پچاس سواریوں سمیت وہاں پہنچے، اور واہی تباہی بکنے لگے۔ انھیں اصرار تھا کہ جگر ان کے ساتھ چلیں اور روپیہ لے لیں۔ میں نے مداخلت کی اور کہا کہ روپیہ یہیں ادا کیجیے۔ ان میں سے ایک راز دار نے پھر مجھے لیجا کر کہا کہ آپ دخل نہ دیجیے۔ ہم اپنی بیٹھک پر لے جا کر اس کی تواضع کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا ارادہ بڑا ہی کمینہ تھا۔ لکھتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ اس پر مجھے غصہ آگیا۔ اور میں نے جگر صاحب کو جانے سے روکا اور انھیں ڈانٹ ڈپٹ کی۔ غنڈہ تو بزدل ہوتا ہے وہ ہموار ہو گئے اور بقیہ رقم ادا کر کے چلتے بنے۔ یہ تھا میری اور جگر کی دوستی کا آغاز۔ اور اب تو جگر صاحب سے خصوصی یاد اللہ ہے۔

وہ پہلے شعر کہتے تھے۔ تیر و نشتر، لیکن اب فلسفہ چھانٹتے ہیں۔ جس سے شاعری تو مر چکی ہے اور فلسفہ نظر نہیں آتا۔ کبھی شراب ہی شراب تھے اور اب جگر ہی جگر ہیں۔ دختِ رز سے توبہ کر لی ہے۔ اب شعر سناتے ہیں، تو پہلے تمہید باندھتے ہیں۔

قد چھوٹی جڑ میں ہے، رنگ شب تاب ہے، دانتوں پر پان کے کتھے کی تہیں اور

آنکھوں میں سگریٹ کے دھوئیں کا غبار جما ہوا ہے۔

نام سکندر علی، تخلص جگر، وطن مراد آباد اور تلمذ اصغر گونڈوی سے ہے۔ کبھی شاہد بکنار اور سبو بدست ہوتے تھے۔ اب اللہ ہی اللہ ہے۔ گیارہ مہینے ہندوستان میں رہتے اور بارھویں مہینے پاکستان آتے ہیں۔ ان کی آمد سے "تسلیمات عرض ہے" اور آداب عرض ہڑی بھری ہو جاتی ہیں۔

ان کی شاعری محتاج تبصرہ نہیں۔ اس میں ان کی شخصیت کا پرتو پورے طور پر منعکس ہے۔ حسرت نے جو بیج بویا تھا اس کی تثلیث کچھ اس طرح بنتی ہے۔

حسرت موہانی

جگر مراد آبادی — اصغر گونڈوی — فانی بدایونی

سرمستی، لاابالی پن اور جسمانی عشق جگر کی شاعری کے اربعہ عناصر ہیں۔
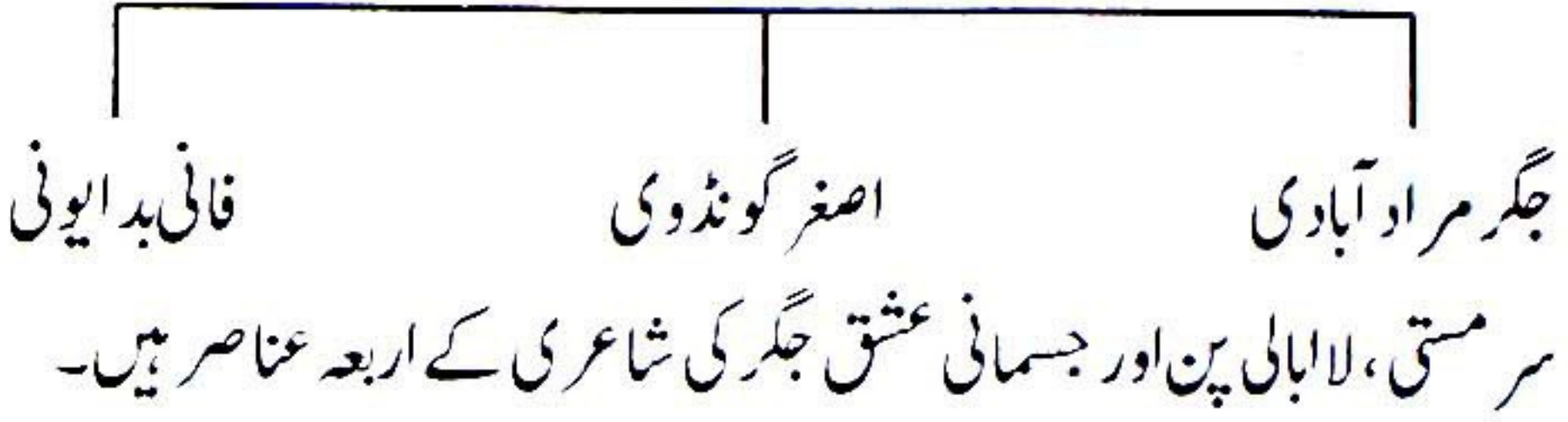
جوش ملیح آبادی

میں پہلی دفعہ ۱۹۳۶ء میں دہلی گیا۔ پیرس ہوٹل میں ٹھہرا۔ اس کے متصل ہی ''کلیم'' کا دفتر تھا۔ نام پہلے سے سن رکھا تھا۔ ایک شوق لیے دفترِ کلیم میں چلا گیا۔ آغا سرخوش اتفاق سے دفتر کے مہتمم تھے۔ وہ پہچان گئے۔ بڑے تپاک سے ملے۔ پتہ چلا کہ جوش صاحب کوئی دو بجے دوپہر کو تشریف لاتے ہیں۔ کارڈ چھوڑ آیا۔ وہ تشریف لائے تو یاد فرمایا۔

میں کوئی بات چھیڑنا چاہتا تھا، موضوع تھا نہیں۔ اور محض عقیدت کے کوئی معنی نہ تھے۔ اتفاق سے اس ماہ کے کلیم میں آدم و حوا کی تصویر چھپ گئی تھی۔ عرض کیا اس سے مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

مسکرائے اور کہا:

آپ ایک شاعر کے ایمان کو حدیث و فقہ کی ترازو میں کیوں تولتے ہیں۔ اپنا کلام سنایا، شکنجبین پلائی، کچھ پریشان سے تھے لیکن ایکا ایکی چہرہ مسکرا اٹھا۔ دیکھا تو ایک خوبرو نوجوان سامنے سے داخل ہو رہا ہے۔ اب وہ سراپا عشق تھے یا سراپا جوش اور نوجوان حسیب احمد ملک تھا۔

دوسری دفعہ لالہ پنڈی داس کے مکان واقع نسبت روڈ میں ملاقات ہوئی۔ ساغر نظامی ساتھ تھا۔ ساغر اوچھی عادتوں کا نوجوان تھا۔ جوش کھلنڈرے لیکن ثقہ۔

بریڈ لاہال میں مشاعرہ ہوا۔ سروجنی نائیڈو صدر تھیں۔ لاہور کے منچلے طلبہ نے معمول کے مطابق جوش کو اڑا دینا چاہا۔ سروجنی بھڑک اٹھیں۔ آپ جوش کی ہتک نہیں کر رہے۔ ہندوستان کی انقلابی شاعری کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں۔ جوش ایک عظیم شاعر ہے۔ اور طلبہ یوں چپ ہو گئے جیسے قبرستان میں سناٹا ہوتا ہے۔

تیسری دفعہ سراج الدین ظفر کے مکان میں احباب کا ایک مختصر سا اجتماع تھا۔ ساغر اور جوش دونوں شراب میں دھت تھے۔ کئی دوستوں نے اپنا کلام سنایا۔ فراغ دلی سے داد دیتے رہے۔ ظفر نے اپنی نظم یوئنگ ہال پڑھی۔ اس میں بورڈنگ کے طلبہ کو خراج عشق

پیش کیا گیا تھا۔ جوش للچا گئے۔

میاں مجھے بھی لے چلو، ایک سجدہ کر لیں۔ آخر وہ کون سی باعظمت جگہ ہے۔ جہاں آہوں کا مسکن ہے۔

اس نظم کی اشاعت پر ایف سی کالج کے پرنسپل نے احتجاج کیا۔ حکومت نے ”ہمایوں“ کو باضابطہ انتباہ کیا تھا۔

اس زمانے میں ایف سی کالج کے خوبصورت لیکن منتخب طلبہ یوئنگ ہال میں رہتے تھے۔ لاہور شاعروں کا مرکز تھا۔ مختلف شاعر طلبہ میں اپنا کلام تقسیم کرتے تھے۔ جب چھٹی کا وقت ہوتا تو بہت سے ثقہ شاعر ایف سی کالج کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے، کئی یوئنگ ہال کا راستہ ناپتے۔ کبھی کبھار شاعروں میں جھپٹ بھی ہو جاتی۔ ایک دفعہ فہیم چغتائی، واقف مرادآبادی، احسان دانش و سراج الدین ظفر میں تو تکار کا وہ رنگ بندھا کہ لکھنؤ کی بھٹیاریاں بھی سر چھپائے پھرتی تھیں۔ جوش نے یوئنگ ہال کے ان عزیز طلبہ میں ایک رات بسر کی اور جب رخصت ہوئے تو اپنے ساتھ ایک ”آہ سرد“ لیتے گئے۔

عمر کا بہترین حصہ تھا

جوش یوپی کے تمام شاعروں کی طرح کبھی دھان پان نہ تھے بلکہ کسی حد تک جسیم و شحیم خالص پٹھان۔

انھوں نے زبان و قواعد کے بہت سے ضابطے توڑ ڈالے۔ وہ ایک انقلابی نہیں انارکسٹ شاعر تھے۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء تک ان کا طوطی بولتا رہا۔ وہ اپنی طرز کے آپ موجد تھے۔ بہت سوں نے ان کی ریس کرنا چاہی:

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

تھے ”انقلابی شاعر“ لیکن بوتل دربغل اور شاہد بکنار..... اس بڑھاپے میں بھی ان کی ایک ہی خواہش ہے۔

معشوق کہیں، آپ ہمارے ہیں بزرگ
ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یارب

جب تک بوڑھے نہیں ہوئے تھے نوجوانی کو رگِ تاک کی طرح نچوڑتے رہے۔ اب جوانی ڈھل گئی ہے تو عمرِ رفتہ کے عیش سے جی بہلاتے ہیں۔

اور یہ واقعہ ہے کہ اُردو شاعری ان کی ذہانت کو خراج ادا کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتی ہے۔

ان کے مجموعے ہی ان کی زندگی کے عکاس ہیں "شاعر کی راتیں" ان کے تحت الشعور کی تصویر ہے۔ "شعلہ و شبنم" میں ان کا سراپا جھلکتا ہے۔ "رامش و رنگ" ان کے مشرب کی علامت ہے۔ "سیف و سبو" ان کی جوانی کا توشہ ہے اور اب جو کچھ ہے وہ "حرف و حکایت" میں ہے۔

"جوانی ایک افتاد ہے جو بڑھاپے میں سانحہ بن جاتی ہے۔ بڑھاپا ایک المیہ ہے جس کا عنوان جوانی ہے۔"

☆☆☆☆☆

چراغ حسن حسرت

بالا بلند، دوہرا بدن، رنگ سیاہ گندمی، آنکھیں بھوری، چہرہ کتابی، پیشانی کشادہ، ریش غائب بروت حاضر، الطاف حسین کو دو سے ضرب دیں تو جثہ میں چراغ حسن حسرت بنتا ہے۔ پاکستان میں مونچھیں تین ہیں۔ نشتر کی مونچھیں، حسرت کی مونچھیں، اور صلاح الدین (ادبی دنیا) کی مونچھیں۔

ماں باپ کا رکھا ہوا نام چراغ حسن ہے، خود حسرت تخلص کرتے ہیں۔ میجر ہو گئے تھے۔ وہاں سے نکلے تو "امروز" کے مدیر بن گئے۔ کہیں بھی مستقلاً نہیں ٹکتے۔ انا کو ہمیشہ زندہ رکھتے ہیں۔ اسی لئے:

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

کلکتہ میں "العصر" نکالتے رہے۔ ابوالکلام کے "الہلال" میں بھی کام کیا لیکن زیادہ عرصہ نہیں۔ مولانا ظفر علی خاں کلکتہ گئے تو وہ انھیں "زمیندار" کے لیے ساتھ لے آئے۔ یہاں فکاہات لکھتے رہے۔ زمیندار سے نکلے تو بعض دوستوں کی معیت میں "انصاف" نکالا۔ یہ ناؤ بھی جلد ہی ڈوب گئی۔ پھر "زمیندار" میں چلے گئے۔ وہاں سے مرتضیٰ احمد میکش کی ہمراہی میں نور الٰہی کو گانٹھا۔ "احسان" کی داغ بیل ڈالی۔ آخر اس سے بھی کٹی ہو گئی۔ "شہباز" نکالا۔ اس کو چھوڑا۔ اپنا ہفت روزہ "شیرازہ" جاری کیا۔ اتنے میں جنگ آ گئی۔ فوجی اخبار کے ایڈیٹر بن گئے اور میجر کہلانے لگے۔

جنگ ختم ہو گئی تو پھر گردشِ دوراں کے ساتھ عرب ہوٹل میں آ گئے۔ "امروز" میں ایڈیٹر بنا دیے گئے۔ وہاں بھی ٹھن گئی۔ استعفیٰ دے کر کراچی چلے گئے۔ ریڈیو میں ملازمت کر لی لیکن تھوڑے ہی دنوں میں اس سے بھی علیحدہ ہو گئے۔ مجھے ایک خط میں لکھا تھا۔

"بھاری پتھر تھا اٹھ نہ سکا۔ چوم کے چھوڑ دیا"۔

آج کل مختلف سفارت خانوں کے لیے ترجمے کا کام کرتے ہیں۔

طبعاً آزاد ہیں۔ بظاہر لیے دیے رہتے ہیں اور کسی کو خاطر میں نہیں لاتے لیکن دل میں کھوٹ کا شائبہ تک نہیں۔ چاہیں بھی تو کسی سے لڑائی نہیں لڑ سکتے۔ البتہ زبان و قلم کے وار سے کبھی نہیں چوکتے۔ وہ ایک منفرد ادیب ہیں۔ ان کی زبان پر کوئی شخص انگلی نہیں دھرتا، جو پڑھتا ہے سر دھنتا ہے۔ اپنے سوا کسی کو ادیب بھی نہیں مانتے۔ صرف ابوالکلام کی عظمت کے قائل ہیں۔ سالک نوجوان پود کے لیے سایۂ رحمت ہے لیکن حسرت قہقہہ استہزاء۔

"اجی یہ لونڈے ہیں لونڈے، قلم کو جھاڑ دوں تو اس قسم کے شاعر و ادیب پیدا ہو سکتے ہیں...."

الفاظ کو ہمیشہ کھینچ تان کے بولتے ہیں۔ ان کی پیاری چیزیں ہیں: دختِ رز، خوبصورت چہرہ، فسانہ آزاد، اور سگریٹ، سگریٹ کے بغیر چراغ حسن حسرت کا تصور ایسا ہی ہے، جیسے ہندوستان کا نقشہ لنکا کے بغیر۔

ان کا وجود غنیمت ہی نہیں بلکہ اس سے بھی سوا ہے۔ وہ سیاسی مطالبات کی ایک اچھوتی تاریخ ہیں انھوں نے جو بہ ظرافت میں لکھا ہے۔ وہ بڑے سے بڑا شیوا بیان صحافی اور فصیح البیان مقرر بھی اس بے خوفی کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ ان کے بولتے ہوئے فقروں میں ایک مسکراہٹ ہوتی ہے اور ان کی طنز میں شگوفوں کی طرح چٹکتی ہیں ... چراغ حسن حسرت۔

☆☆☆☆☆

حسن محمود

"لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے"
بس! موجِ خرام یار بھی کیا گل کتر گئی
کی شرحِ دلفریب اور غالب کے اس فرمودے کا اعادہ وہ تکرار!

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟

غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟ کچھ زمیندار سے پوچھیے، کچھ مغربی پاکستان" سے...... مزید سراغ لگانا ہو تو بہاولپور چلے جائیے۔ اعلیٰ حضرت امیر بہاول پور بھی بالی عمریا کی بعض گرہیں کھول سکتے ہیں۔ لیکن بعض تہ بہ تہ داستانیں سردار محمود خان کے حافظے اور علامہ ارشد کی طلاقت ہی سے کشید ہو سکتی ہیں۔

ایک مصرعی قد، مہتابی چہرہ، موٹی موٹی آنکھیں، جن میں "ساری مستی شراب کی سی ہے"

سر تاپا کھانڈ کا کھلونا۔ رئیس ابن رئیس بلکہ مخدوم۔ ابنِ مخدوم باپ کے بھی لاڈلے اور وزارت کے بھی لاڈلے۔ ساری دنیا کو امت ہی سمجھتے ہیں اور غالباً اس واہمہ کا شکار ہیں کہ "عاصیان جمہور" ان کی سفارش ہی سے پلسراط عبور کر سکیں گے۔

ان کی فراست کا عرض سعید سہگل اور قیادت کا طول مخدوم الملک ہیں۔ ہماری طرح تہی کیسہ ہوتے تو کسی غزل کا مطلع ہوتے۔ یا پھر میر کے بہتر (۷۲) نشتروں میں سے ایک! بہر حال یکے از مطبوعات مشتاق احمد گورمانی ہیں۔

خواجہ حسن نظامی

ہم لوگ مولانا ظفر علی خاں کے معتقدوں میں تھے اور ظاہر ہے کہ اُن کا معتقد ہونا ایک دنیا کے خلاف ہونا تھا! ہم ہر شخص کو ان کے شعروں میں دیکھتے تھے لیکن پہلی دفعہ ۱۹۳۶ء میں خواجہ کو دیکھا تو ان میں ایک بانکپن تھا۔ وہ دہلی کے عربک کالج کے ہال میں کسی قومی مسئلہ پر تقریر کر رہے تھے۔ معاً مجھے مولانا ظفر علی خاں کا مشہور لطیفہ یاد آگیا۔ یعنی خواجہ صاحب نے مولانا ظفر علی خاں کو کسی موقع پر "اردو نواز جنگ" کا خطاب مرحمت کیا تھا، اور مولانا ظفر علی خاں نے انھیں "گیسو دراز جنگ" کے لقب سے ملقب فرمایا تھا۔

دوسری دفعہ انھیں مختلف لوگوں کے "چہروں" میں دیکھا اور محسوس کیا کہ یہ شخص قلم کے اعتبار سے بددیانت نہیں ہے۔

تیسری دفعہ میں ان کے آستانہ پر ملا۔ میں اور میری بیوی، ہم دونوں درگاہ نظام الدین اولیاء کی زیارت کے لیے گئے تو ایک دوست خواجہ صاحب کے ہاں لے گئے تعارف کرایا۔ قریب سے دیکھا تو محسوس کیا کہ خواجہ صاحب ان خواجاؤں میں سے نہیں جو مزدور کی رگوں کے خون سے "لعل ناب" بناتے ہیں۔ وہ واقعی خواجہ ہیں اور اس سے آگے کچھ نہیں ہیں۔

مجھ سے سوال کیا:

آپ ایڈیٹر لوگ یہ "ہم" لفظ استعمال کرتے ہیں کبھی اس کے معنی پر بھی غور کیا ہے، فرمایئے اس کے معنی کیا ہیں؟ میں سخت گھبرایا کہ یہ سادہ اردو لکھنے والا جس کی تحریریں مغلق الفاظ سے ایسے ہی خالی ہوتی ہیں، جیسے کسی بچے کی مسکراہٹ ریا کے بغیر۔ اور "ہم" کے معنی؟ ایک عام لفظ جو گنوار سے لے کر تاجدار تک روزمرہ بولتے ہیں!

خواجہ صاحب نے کہا: گھبرا گئے! آپ سیاسی لوگ اور سیاسی ایڈیٹر الفاظ کے معاملہ میں شاہ خرچ ہوتے ہیں۔ یا تو ان کو ذبح کرتے ہیں یا ان کا اسراف! اور پھر بات کو سمیٹتے ہوئے

فرمایا: ''ہم دراصل ہندو کی ''ہ'' اور مسلمان کی ''م'' سے بنا ہے۔''

احمد شاہ بخاری جن دنوں براڈ کاسٹنگ کے کنٹرولر تھے، دہلی میں ان کے ہاں کسی تقریب کا اہتمام تھا۔ سب بڑے بڑے لوگ مدعو تھے، ہندوستانی یورپین اور خالص یورپین، ان میں ایک سفید ریش بزرگ بھی فروکش تھے۔ خواجہ صاحب نے حاضرین پر ایک چھچھلتی ہوئی نظر ڈالی اور استفسار کیا:

وہ سفید ریش بزرگ کون ہیں؟

تاثیر نے کہا ''بخاری صاحب کے والد بزرگوار ہیں۔''

خواجہ صاحب مسکرائے اور فرمایا:

''اچھا تو صحیح بخاری وہ ہیں۔''

چوتھی دفعہ انور صابری کی معیت میں گیا۔ اپنے حجرۂ خاص میں فروکش تھے۔ چاروں طرف دیواروں پر سماع کے جواز میں مختلف اقوال لکھوا رکھے تھے۔ بڑے مزے کی باتیں کرتے رہے۔ انا تو خیر ہر بڑے آدمی میں ہوتی ہے۔ لیکن دلہن کے سولہ سنگار کی طرح چھوٹے چھوٹے فقرے ان کی زبان سے ایسے جھڑتے تھے گویا شاخوں سے کلیاں ٹوٹ رہی ہیں۔

☆☆☆☆☆

مولانا حُسَین احمدؒ مدنی

بعض یادوں کے ساتھ بعض تصویریں بھی دھندلا گئی ہیں۔ یقین مانیے اس وقت چشم تصور میں مولانا مدنی کی تصویر نہیں آرہی ہے، لیکن دل پر اب بھی ان کی بڑائی کا نقش کھدا ہوا ہے۔

مولانا سیّد ادریس احمد دہلوی نے جو اہل اللہ میں سے تھے، ایک دفعہ آپ کے سیاسی اشغال پر کہا تھا:

''حُسین احمد تمھاری سیاست میری سمجھ میں نہیں آتی ہے، سمجھ میں آتا تو میں تمھارے ساتھ شب و روز چکر کاٹتا...... لیکن تمھاری خالفت بھی نہیں کرتا کیوں کہ مجھے تمھارے دینی مرتبہ کا علم ہے۔ اور تمھاری مخالفت کر کے میں جہنم کی آگ نہیں خریدنا چاہتا۔''

کہتے ہیں لازماً محمود حسن شیخ الہندؒ کی بو قلموں خوبیاں قدرت نے ان کے چار شاگردوں کو بانٹ دی تھیں:

''حدیث کا علم علامہ انور شاہ کے حصہ میں آیا تھا۔ قرآن کا علم مولانا شبیر احمد عثمانی کو ملا تھا۔ سیاسیات کے فہم میں مولانا عبید اللہ سندھی اور ایثار و عمل میں مولانا حسین احمد مدنی ان کے جانشیں تھے''

مولانا مدنی واقعی ان لوگوں میں سے ہیں جن سے فقر و استغنا کا بوریہ قائم ہے یا جن سے شہنشہی کی جبینوں پر خراش آتی ہے!

مسلم لیگ نے ہندوستانی سیاسیات میں جن لوگوں کو اپنے قہر و غضب کا شکار بنایا اور مختلف الاصل ملاحیوں سے نوازا، ان میں مولانا حسین صاحب مدنی سر فہرست تھے۔ آج ہمارے سیاسی فرماں رواؤں کو ''جن نذر ہاتھوں'' سے گلہ ہے۔ وہ بہت پہلے مولانا کی داڑھی تک پہنچ چکے ہیں۔ مگر کسی مرحلے میں بھی انھوں نے اُف نہیں کی۔ بقتہ حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوری نے ایک گفتگو میں کہا تھا:

''مسلمانوں نے حسین احمد اور ابوالکلام سے جب

وشتم کا جو برتاؤ کیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہیں
حسین احمد کا تقویٰ اور ابوالکلام کا صبر انھیں لے نہ ڈوبے"

اور انسان ان سانحات سے ایک گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے کہ جن ہستیوں کو مسلمانوں نے ان کی موت کے بعد دین کے معاملے میں مستند تسلیم کیا۔ ان کی زندگی میں انھیں بُری طرح خوار کیا۔ بلکہ انھیں رسوائی کا تماشا بنانے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی!'

مولانا حسین احمد مدنی کے ذاتی عقیدت مند اس برصغیر کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔ ہر وہ طالب علم جو دیوبند کا فارغ التحصیل اور آج کسی نہ کسی مسجد کا پیش امام یا کسی نہ کسی عربی مدرسہ میں استاد ہے، ان کا ارادت کیش ہے۔

مسلم لیگ کے زمانۂ عروج میں جمعیتہ العلماء کے وجود کا نوے فیصد حصہ مولانا ہی کے ذاتی حلقہ بگوشوں کا مرہونِ منّت تھا۔ اُن کا نام تحریک پاکستان کی طرح ہندوستان کے ہر قریے میں موجود تھا۔ سہلٹ سے لے کر خیبر تک کے دیہات میں اُن کے شاگرد موجود تھے۔ اور ان کی بدولت ان کا نام بھی لیا جاتا تھا۔ وہ کوئی بڑے سیاستداں نہ تھے۔ انھوں نے انگریز دشمنی کا جذبہ ورثہ میں پایا تھا۔ اُن کا وجود ۱۸۵۷ء کے علماء کی بغاوت کا مظہر تھا۔ وہ گھنٹوں بے تکان بولتے چلے جاتے تھے، لیکن کوئی عظیم خطیب نہ تھے۔ ان کا احترام محض ان کے دینی وجود کی وجہ سے تھا۔ لوگ انھیں مالٹا کے اسیر کی حیثیت سے جانتے تھے اور انھیں معلوم تھا کہ اس شخص نے سالہا سال رسُول اللہ ﷺ کے روضے کی جالی کے پاس بیٹھ کر حدیث کا سبق پڑھایا ہے۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کا بیان ہے کہ ایک دفعہ وہ (شاہ جی) دیوبند میں میٹھی نیند سو رہے تھے کہ فجر کی اذان ہوگئی۔ وہ بدستور سوئے رہے۔ اتنے میں کسی نے پاؤں دابنے شروع کیے۔ ہاتھوں کی ملائمت سے غنودگی تیز ہوتی گئی۔ تھوڑی دیر بعد پلٹ کر دیکھا تو مولانا مدنی پاؤں داب رہے تھے۔ شاہ جی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔

"حضرت آپ گنہگار کر رہے ہیں............!!"

"شاہ جی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا آپ کو جگالوں......لیکن پھر

خیال آیا، آپ تھکے ہوئے ہیں۔ یہی مناسب سمجھا کہ پاؤں دابوں...... تھکاوٹ
دور ہوگی، آنکھ کھلے گی تو ممکن ہے نماز قضا نہ ہو"

اور یہ تھے حسین احمد مدنی، ہندوستان میں اسلاف کی آخری صدا!

☆☆☆☆☆

علّامہ حُسین میر

جسامت کے اعتبار سے فسانۂ آزاد، سر تاپا قہقہہ، طویل قہقہہ، جان دار قہقہہ۔ گول چہرہ، موٹی موٹی لیکن گھومتی پھرتی آنکھیں، طبیعت بھی شگفتہ اور مزاج بھی شگفتہ، اس سنِ وسال میں کہ بال کھچڑی ہوگئے ہیں، ابھی تک جوانی دیوانی کا کھلنڈرا پن موجود ہے۔ اگر ان کے چہرے میں سے ثلث خارج کر دیا جائے۔ تو سر سید" کے ہم شکل ہوتے ہیں علامہ ان کے نام کا حصہ ہے۔ جیسے بیدار بخت کے نام کا جزو آقا ہے۔ آج کل کے علمائے دین سے زیادہ عربی میں درک رکھتے ہیں۔ بات بات میں آیاتِ الٰہی سے استدلال کرتے ہیں، اردو بھی رواں بولتے ہیں، پنجابی بھی رواں 'انگریزی میں بھی ٹرت پھرت ہیں۔

تمام زندگی اخبارات میں ترجمہ کرتے رہے۔ جس زمانے میں ظفر علی خاں، سالک و مہر کا طوطی بولتا تھا۔ انھیں اوّل درجہ کا مدیر مخابرات تسلیم کیا گیا۔ لیکن نہ کبھی ایک جگہ ٹکے اور نہ کبھی اپنے اصولوں ہی سے انحراف کیا۔ ہمیشہ آزادی پسند تحریکوں کے ہم نوا رہے۔ لیکن ایک اچھے مقرر ہونے کے باوجود قید و بند سے گریز کیا۔

چودھری افضل حق مرحوم نے ایک دفعہ ہیر پھیری سے قید خانے بھجوا دیا کچھ دن تو اندر ٹکے رہے، لیکن کاغذ پر دستخط کیے اور باہر آگئے۔ لاہور پہنچے، دفتر احرار کی سیڑھیوں ہی سے چودھری صاحب کو للکارا چودھری صاحب نے کہا:

"حسین تم کہاں"؟

قہقہہ لگایا اور کہا:

"چھوڑ یار، جب انگریز پر لعنت بھیج چکے تو اس کی جیل پر بھی لعنت بھیج آیا ہوں، انگریز جیل میں رکھنا چاہتا تھا" میں نے انکار کیا، جب باہر عدم تعاون کر رہے ہیں تو جیل خانے میں تعاون کیسا؟ اور پھر وہی جاندار طویل و گداز قہقہے۔

یار باش بھی ہیں اور خوش باش بھی۔ میں نے انھیں کبھی آزردہ نہیں دیکھا۔ البتہ

حساس ضرور ہیں، ظالم قسم کے وہابی ہیں، کھانے میں تیز ہیں، ایک وقت میں کئی آدمیوں کی خوراک کھالیتے ہیں۔ جب تک انگریز رہا بے ٹکٹ سفر کیا۔ بلکہ ایک دفعہ بڑے بڑے لیڈروں کو بھی لکھنؤ تک بے ٹکٹ ہی لے گئے۔ جب گاڑی لکھنؤ پہنچی، تو خود جبہ و عمامہ باندھ کر پیش ہو گئے۔ لوگوں نے سمجھا، رئیس وفد آپ ہی ہیں۔ ہاروں سے لد گئے، جلوس نکلوایا، پنڈال میں پہنچے، عقدہ کھلا تو چاروں طرف قہقہوں پر قہقہے لگ رہے تھے۔

آپ کی اہلیہ رحلت کر گئیں۔ کشمیری مولوی کفن پر چاک سے کلمے لکھنے لگے۔ گو بدعت سمجھتے تھے لیکن صدمہ تھا، چپ ہو رہے۔ اتنے میں کوئی دوست آگیا۔ پوچھا میت میں کتنی دیر ہے؟ بے ساختہ جواب دیا:

"ابھی پارسل پر پتہ لکھا جا رہا ہے، اور پھر، مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر کہا: دیکھیے ٹھیک پتہ لکھیے گا"۔

مبادا وی پی واپس ہو جائے۔ اور پھر ماتمی فضا میں بھی ایک جاندار قہقہہ تھا۔

☆☆☆☆☆

آغا حشر کاشمیری

غالباً ۳۳ء یا ۳۴ء کی بات ہے۔ بشیر ہندی نے "فلمستان" کے نام سے پہلا فلمی ماہنامہ جاری کیا تھا۔ ان دنوں احسان دانش ان کے بک ڈپو میں بیس پچیس روپے ماہوار پر ملازم تھے اور اس رسالے کے طابع و ناشر بھی تھے۔ آغا حشر کے خلاف فلمستان میں مسلسل لکھا جاتا تھا۔ آغا صاحب کلکتہ میں رہتے تھے انھوں نے ۵۰۰ کے تحت مقدمہ داغ دیا۔ فلمستان کے ناشر کی حیثیت میں احسان دانش کو پولیس نے گرفتار کیا اور کلکتہ لے گئی۔

یہ پہلا موقع تھا جب مجھے آغا حشر کے متعلق پہلی دفعہ پتہ چلا کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں، ویسے ان کا نام بہت پہلے سن رکھا تھا۔ پھر جب آغا صاحب لاہور تشریف لائے اور یہیں مستقل قیام کیا تو انھیں پہلے دن ہی لوہاری دروازہ کے باہر عید میلاد النبی کے جلسے میں مدعو کیا۔ ہزار ہا لوگ انھیں دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے۔ آغا نے ڈرامائی انداز میں سیرت النبی پر چند فقرے کہے اور لوگ داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے ہوئے ان کی تقریر ختم ہوتے ہی اٹھ گئے۔

وہ لسّی کے بے حد شوقین تھے گرمیوں کے موسم میں رات گئے انار کلی کے چوک میں کھلے پشاوری تانگے پر تشریف لاتے، کبھی کنجڑے ساتھ ہوتے اور کبھی مختار۔ ایک سکھ لسّی والے کی دکان سے دو چار گلاس پیتے اور چلے جاتے۔

ہم نے اس زمانے میں "پنجاب لٹریری لیگ" بنا رکھی تھی۔ میں سکریٹری تھا اور پروفیسر علم الدین سالک صدر۔ ہم ایک مشاعرہ کرنا چاہتے تھے۔ قرار پایا آغا صاحب کو صدر بنائیں۔ اس غرض سے ایک وفد ترتیب دیا اور میں نے ان سے فون پر اگلے دن دس بجے صبح کا وقت طے کر لیا لیکن وہاں ایک بجے کے قریب پہنچے سالک صاحب نے رقعہ بھیجا تو اندر بلا بھیجا۔

بڑے تپاک سے ملے۔ پیشتر اس کے تعارف ہوتا ایک زناٹے کی گالی لڑھکاتے ہوئے کہا۔ سالک صاحب! وہ دیکھیے نا کوئی صاحب...... (گالی) شورش کاشمیری ہیں۔ انھوں نے صبح دس بجے کا وقت مقرر کیا تھا۔ اب ڈیڑھ بجتا ہے۔ اور وہ... (گالی) غائب ہیں۔ ہم سب پی گئے......،

آغا نے ڈرامے کے موضوع پر گفتگو شروع کر دی۔ جوں جوں بولتے گئے توں توں ان کی انا کا رنگ سوا ہوتا گیا۔ وہ جس بات پر زور دینا چاہتے تھے، یا اس کو قطعی سمجھتے تھے، "آغا حشر کہتا ہے"۔ وہ زیادہ تر اس بات پر زور دیتے رہے کہ ایک ڈرامہ نگار اگر کسی کافر کا مکالمہ لکھے تو اس کا فرض ہے کہ اس وقت وہ اپنے اوپر کفر مسلط کر لے اور اپنے ذاتی عقائد کو اپنی تحریر میں کبھی شامل نہ کرے۔ کچھ ایسا ہی نظریہ کرداروں کی زبان کے بارے میں تھا۔ وہ ہر کردار کے لیے اس کی استعداد کے مطابق زبان چاہتے تھے۔

انھوں نے بہت سے اچھوتے محاورات اور ان کے معانی بیان کیے۔ لیکن وہ تمام محاورات گالی دینے سے متعلق تھے۔ آغا کو گالی دینے اور گالی گھڑنے میں کمال حاصل تھا۔

مختار کو وہ بہت چاہتے تھے لیکن اس کو بھی گالی دینے سے چوکتے نہیں تھے۔ ان کا تکیہ کلام ہی گالی تھا۔ وہ اہم سے اہم مضمون اور سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع میں گالی کو نگینہ کی طرح جڑ دیتے تھے۔

انھی دنوں بھاٹی دروازہ کے باہر کراؤن ٹاکیز تعمیر کیا گیا اس کی عمارت کے خاصے چرچے تھے۔ مالکوں نے آغا صاحب کو افتتاح کے لیے بلوایا۔ آئے افتتاح کیا، لیکن چھٹتے ہی کہا:-

خلیل کی ماں...... (گالی)...... جتنا منڈوا ہے اور افتتاح کے لیے انڈین شیکسپیئر آغا حشر کاشمیری کو طلب کیا ہے......'

ساغر نظامی ایک ڈرامہ لکھ کر لے گئے۔ آغا کو دکھایا۔ آغا نے دو چار ورق الٹے اور پھر مسودے کا مسودہ پیچھے آتش دان میں پھینک دیا۔ اور گالی لڑھکاتے ہوئے کہا:

"یہ ڈرامہ لکھا ہے یا کاغذ پہ طفلک بازی کی ہے"؟

آغا کے جنازے میں ڈوم دھاڑیوں کے علاوہ ان کے دوستوں میں صرف فقیر محمد

چشتی شریک تھے۔ ناقدروں میں بشیر ہندی اور عقیدت مندوں میں راقم الحروف اور بس۔

جب ان کو میانی صاحب کے قبرستان میں دفنادیا گیا تو مختار بیگم قبر کی مٹی سے لپٹ کر کہہ رہی تھیں۔

آغاجی، تم چلے گئے اب میں کس سے لپٹوں گی؟

آغا کا قد لانبا تھا رنگ گورا، چہرہ گول، ایک آنکھ میں نقص تھا یعنی ٹیرے تھے۔ پیٹ بڑھ گیا تھا۔ کھلے گلے کی قمیض پہنتے اور نیچے تہمند باندھتے تھے۔ ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے جوانی کو اس کے شریر تقاضوں کے ساتھ بسر کیا تھا۔ ان کی متاع ان کے ڈرامے تھے یا مختار بیگم..... ڈرامے حوادثِ زمانہ کی دستبرد سے ضائع ہو چکے ہیں اور مختار بیگم ایک نوجوان قمر الزمان کے عقد میں چلی گئی ہے۔

☆☆☆☆☆

حفیظ جالندھری

شاہنامہ اسلام" لکھا تو انجمن ستائش باہمی کے ارکان نے انھیں "فردوسی اسلام" کا خطاب دیا۔

ہلکے پھلکے گیت کہے تو دوستوں نے "ابوالاثر" بنا ڈالا۔ دوسری جنگِ عظیم میں "سانگ پبلسٹی ڈائرکٹر" ہو گئے۔ عسکری ترانہ لکھا!

میں چھوری کو بھرتی کرا آئی رے

تو ملک معظم نے "خان صاحب" کا خطاب مرحمت فرمایا۔ تاثیر رحلت کر گیا تو پہلی دفعہ قریب سے دیکھا۔ راجہ حسن اختر کے کاندھوں پر بازو رکھ کر کہہ رہے تھے:

پیارے راجہ! تاثیر نہیں مرا، خدا کی قسم بازو ٹوٹ گیا ہے

جب میت کو کندھا دینے لگے تو کوشش کے باوجود آنکھوں میں آنسو نہیں آ رہے تھے۔ ہائے تاثیر۔ بعض لوگ انھیں سر عبدالقادر کی "مترنم تصنیف" سمجھتے ہیں انھیں کی بدولت لندن گئے۔ وہاں بڑے بڑے لارڈوں کو شاہنامہ سنایا اور آتی دفعہ ایک عدد بیوی نقد لے آئے۔

ایک دفعہ انگریز بیوی نے پوچھا:

مشاعرے میں لوگ آپ کے ایک شعر پر خوب داد دے رہے تھے۔ اس میں "قاتل" کا لفظ آتا تھا۔ اس کے معنی کیا ہیں............؟

فرمایا! (HEAD CUTTER)

حدیث گرچہ ضعیف است راویاں ثقہ اند

کہا جاتا ہے کہ ۱۳ راگست ۱۹۴۷ء کو آپ نے دہلی ریڈیو سے جو ترانۂ آزادی نشر کیا وہی پاکستان میں ریکارڈ سے نشر کرایا گیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اور اب تو ماشاء اللہ حک و اضافہ سے اس کا حلیہ ہی بدل ڈالا ہے۔

قامت میں جھول آگئی ہے۔ رنگ پہلے کی بہ نسبت سیاہ ہو چکا ہے۔ چہرہ شروع ہی سے "کاربن کاپی" تھا۔

جب ہنستے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کسی نے کھڑے پانی میں روڑا پھینک دیا ہے۔ آواز اس سن میں بھی پاٹ دار ہے۔ گلے میں ترنم نہ ہوتا تو یزدانی جالندھری ہوتے۔ ترنم تھا ابوالاثر ہو گئے۔ مشاعروں نے تحت اللفظ کی وہ مٹی خوار کی کہ اب مشاعروں کا مقصد اگر کچھ ہے تو وہ محض گلے بازی ہے......'

عمر کا اندازہ نہیں، البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری کے سورج کو گہن لگ چکا ہے، لے دے کے ترنم رہ گیا ہے اور وہ بھی نصف۔ سالکؔ کے شاگرد ہیں۔

مولینا غلام قادر گرامی نے انتقال کیا تو وہ ان کا ہاتھ سالکؔ کے ہاتھ میں دیتے گئے، اس وقت سے آج تک سالکؔ کو شعری مشوروں کے لیے کبھی کبھار یاد کر لیتے ہیں۔

"نیاز مندانِ لاہور" ان کو یوپی کے مقابلے میں لائے تھے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ حفیظؔ نے ہر معرکے میں ان کا خم ٹھوک کر مقابلہ کیا۔ ان کا شعر ہے:

حفیظ اہلِ زباں کب مانتے تھے
بڑی مشکل سے منوایا گیا ہوں

ان کی شخصیت تصنّع کے بغیر صفر ہے اور ان کا کلامِ ترنم کے بغیر ایک چوتھائی۔

☆☆☆☆☆

پروفیسر حمید احمد خاں

دانش گاہ پنجاب کے وائس چانسلر، قدو قامت کے اعتبار سے پرو وائس چانسلر، نامور استاد، عمر بھر اسلامیہ کالج لاہور میں معلم رہے پھر پرنسپل ہو گئے۔ آج کل پنجاب یونیورسٹی کے ناخدا ہیں۔ مولانا ظفر علی خاںؒ کے سوتیلے بھائی ہیں۔ مولوی سراج دین احمدؒ کے فرزند، لیکن ظفر علی خاںؒ سے کسی معاملے میں بھی مماثلت نہیں رکھتے۔ مولانا ادیب تھے، صحافی تھے، شاعر تھے۔ راہنما تھے غرض اپنی ذات میں ایک انجمن اور ادارہ تھے۔ حمید احمدؔ خاں میں ایسی کوئی چیز نہیں، لکھنے لکھانے کا شوق ہے۔ اچھی نثر لکھ سکتے ہیں اور کبھی کبھار سفر نامہ یا کسی پر تنقید لکھی ہے۔ مگر ایک ادیب کی لٹک کھٹک بالکل نہیں۔ مرحوم مولانا سے ان کا راستہ ہمیشہ مختلف رہا۔ بلکہ زندگی کا بہت بڑا حصہ اُن سے قطع کلامی میں گزار دیا، وہ بارہا قید و بند ہوئے یہ قید و بند کے تصور ہی سے دور رہے، بلکہ اس رخ سے سوچنا معیوب سمجھا۔ مولانا نے قادیانی نبوت کو بیخ و بن سے اکھاڑ ڈالا۔ علامہ اقبالؒ نے ان کے قلم کو تلوار سے تشبیہ دی اور لکھا کہ ظفر علی خاںؒ کے قلم نے وہی کام کیا ہے جو مصطفیٰ کمال کی تلوار نے ترکوں کے لیے کیا تھا۔ مولانا کے شاگرد شورش کاشمیری نے پنجاب یونیورسٹی میں مسند اقبال ایک قادیانی پروفیسر کے حوالے کیے جانے پر اعتراض یا احتجاج کیا اور ادب کے ساتھ توجہ دلائی کہ ظفر علی خاں کے بھائی اس اضحوکہ کے مرتکب ہوئے ہیں تو حمید احمدؔ خاں نے علیک سلیک ترک کر دی۔ ان کا خیال تھا کہ ہم ان سے سبک سر ہو کے پوچھیں گے سر گراں کیوں ہو؟ لیکن شورش کاشمیری بھی حرفوں کا بنا ہوا نہیں۔ وہ ہر معاملے میں دستبردار ہو سکتا ہے، الا مسئلۂ ختم نبوت! پروفیسر صاحب نے شورش کاشمیری کا احتجاج پڑھ کر گفتنی و ناگفتنی دونو کہہ ڈالیں۔ لیکن ہمارے دل میں ان کے لیے کبھی میل نہ آئی، کیوں کہ وہ بہر حال ایک علمی شخصیت ہیں۔ کئی نسلوں کے اُستاد اُن کے تلامذہ میں بڑے بڑے لوگ ہیں۔ ان کا اپنا علمی و ادبی مطالعہ

وسیع ہے۔ وہ معاملات کے اسرار اور رموز کو عملی سمجھتے ہیں۔ ان کا احترام نہ کرنا ہمارے نزدیک ایک معصیت ہے جس کا عنوان فی الحال قائم کرنا مشکل ہے۔ وہ ایک دھان پان شخصیت ہیں۔ ان کے دماغ میں علم ہے، چہرے پر علم نہیں، اس لحاظ سے وہ کسی غیر معروف شاعر کا خارج از بحر مصرع معلوم ہوتے ہیں۔ رنگ سفید ہے، آنکھیں ایک ذہین انسان کی چمک رکھتی ہے۔ ان کی چال ڈھال میں آکسفورڈ کے اساتذہ کی رونق پائی جاتی ہے۔ ادبیات سے انھیں والہانہ لگاؤ ہے۔ سیاسیات میں ان کی نگاہ عمومی ہے، وہ کچھ نہیں جانتے کہ سیاسی جدوجہد ہوتی کیا ہے؟ اس مقام پر وہ، ائس چانسلر کے عمق سے دور ایک سیاسی مورتی رہ جاتے ہیں۔ حقیقتاً وہ ایک شریف انسان ہیں۔ اور ان کی ذات میں ایک عالم، ایک شاعر، ایک استاد، ایک ادیب، اور نقاد کی ہیچ رنگی خصوصیتیں اس انداز سے جمع ہوئی ہیں کہ ان کا دم یونیورسٹی کی آب و ہوا کے لیے غنیمت ہو گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

حمید نظامی

ہفت روزہ قامت کا نوجوان جو ایک روز نامہ کا مدیر ہے یعنی قامت قندیل اور پیشہ نوائے وقت!

حمید نظامی اُن خاندانوں کے رخسار پر ایک زبردست طمانچہ ہے۔ جنھوں نے دولت کے بل پر عزت کے بُت قائم کیے تھے۔ آپ اس کے خیالات سے اتفاق کریں۔ یا اختلاف لیکن آپ اس کی اس خصوصیت سے انکار نہیں کر سکتے کہ اس نے اُردو صحافت کا مزاج ہی بدل ڈالا ہے۔ اس سے پہلے اُردو اخباروں کو خبروں کے لحاظ سے ساقط الاعتبار سمجھا جاتا تھا لیکن نوائے وقت نے اس نظریے پر خط تنسیخ کھینچا ہے اور اس کی خبروں کو وہی اہمیت دی جاتی ہے جو انگریزی اخباروں کو حاصل ہے۔ اور جہاں تک اس کے اداریے کا تعلق ہے ہر کہیں توجہ سے پڑھا جاتا ہے۔ غیر ملکی سفارت خانے اس کو ملکی حالات کی جاندار آواز سمجھتے ہیں۔ ملک کی حاکمیت اس کو کاملاً حزب اختلاف سمجھتی ہے۔ کئی وزیر اس کی گرفت سے کانپتے ہیں عوام میں اس کے لیے عزت ہے اور خواص اس کو اپنے ذہنی محسوسات کا عکاس سمجھتے ہیں۔ نوائے وقت واحد اخبار ہے، جس کا ہر دائرۂ فکر میں ہر صبح انتظار ہوتا ہے اور اس کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے پنجاب میں پاکستان کا سیاسی ذہن استوار کیا۔ اور آج پاکستان میں وہ حزب اختلاف کا قومی نقیب ہے۔

نظامی کی عادتیں ہی اس کی فطرت ہیں۔ مثلاً وہ کم گو ہے اس کی زندگی ایک ضابطہ کی پابند ہے۔ یعنی کم آمیز ہے۔ آپ اس کی رائے کو دلیل کے بغیر متاثر نہیں کر سکتے۔ وہ نہ تو قلم فروش ہے اور نہ ضمیر فروش۔ اس نے دولتانہ وزارت سے ٹکر لے کر اپنے استقلال کی ہیبت قائم کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج قصر وزارت کے بہت سے ستون اس سے خوفزدہ ہیں۔ اس نے حزبِ اقتدار کو لوگوں کے ذہنوں سے نکال دیا ہے۔ وہ کبھی کسی سے کوئی امید نہیں باندھتا۔ یہی سبب ہے کہ اس کو کسی موڑ پر بھی مصائب ہلا نہیں سکتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے

کہ اس نے اپنی بیوی کو بھی اپنے مصائب میں کبھی حصہ دار نہیں بنایا ہے۔ وہ ہر شے کو اس کے حدود تک محدود رکھتا ہے۔ دوستوں کا دوست ہے۔ لیکن دشمنوں کو معاف کر دینا اس کی شریعت میں حرام ہے۔ اس نے سنگین سے سنگین مرحلے میں بھی اپنے معمولات کو ترک نہیں کیا۔ اس کی اس ہمت پر اس کے نقاد اس سے حسد کرتے ہیں اور اس کے دوست رشک! وہ فی الواقعہ قلم کی عظمت کا محافظ ہے۔

سلطان عبدالمجید نے ایک دفعہ کہا تھا۔ اگر مجھے دوبارہ تخت مل جائے تو میں اخبار نویسوں کو پھانسی پر لٹکا دوں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ نظامی کے حریفوں میں سے بھی اکثر یہی چاہتے ہیں لیکن وہ بااختیار ہو کر بھی بے اختیار ہیں۔

رنگ گندمی، چہرہ گول، پیشانی کشادہ، آنکھوں پر چشمہ، دانتوں میں کھڑکیاں، لہجہ دھیما، قلم متوازی! اٹھے تو بجلی پناہ مانگے۔ گرے تو خانہ خراب کر دے۔

اور یہ ہیں حمید نظامی۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر خان صاحب

"بسکہ ہے فرصتِ کردار نفس یک دو نفس"

کی بوڑھی تصویر، جس کے چہرے پر تاریخ کے گنجلک اوراق کی طرح بکھری ہوئی جھریاں، حروفِ جوانی کی طرح تابدار ہیں۔ روشن و متحرک آنکھیں جن پر ریاکاری کا شائبہ تک نہیں لیکن۔ گرد و پیش ریا کی ایک پوری کھیپ موجود ہے۔ طبیعت میں غصہ بھی اور مٹھاس بھی۔ مزاج اکل کھرا، دل اور زبان دونوں متحد سیاستدانوں کے روایتی رنگ سے صاف، جو دل میں وہی زبان پر، اپنے ماحول سے بعجلت متاثر ہو جاتے ہیں، لیکن اپنے خیالات کی پختگی کبھی ترک نہیں کرتے۔ یوں سمجھ لیجیے کہ عمر کی طویل گردش نے ایک خاص قسم کی زندگی ایک خاص قسم کے سانچے میں ڈھال دی ہے، جس پر اب اصول و موقف کے اعتبار سے سورج کے طلوع و غروب کا کوئی عکس نہیں پڑتا، لیکن عام آب و ہوا اپنی طبعی عمر تک ضروری اثر ڈالتی ہے۔

قرونِ اُولیٰ کے کتابی تذکروں کا چلتا پھرتا صفحہ، ہر غرض سے خالی۔ ان لوگوں میں محصور جو تخت کے گرد تو حلقہ باندھ لیتے ہیں، لیکن صلیب تک ساتھ نہیں دیتے بلکہ طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔

فیاض، مہمان نواز، خطرناک حد تک مخلص، سراپا جمہوری لیکن پاکستان کے ہر دشمن کو گولی مار دینے کے حق میں القصہ۔

ہے غنیمت کہ فروزاں ہیں ابھی چند چراغ
ورنہ؟ بند ہوتے ہوئے بازار سے کیا چاہتے ہو؟

☆☆☆☆☆

خانِ ممدوٹ (افتخار الدین)

ان کی حلیہ نگاری بغایت سہل ہے اور بغایت دشوار رئیس احمد جعفری "دید و شنید" میں حک و اضافہ کرتے، تو شاید اب وہ اس سے زیادہ نہ کہتے کہ مسلم لیگ کے ہراول دستے کا وہ سفیر جو پاکستان کی سیاسی کربلا میں شہید ہو چکا ہے۔ شیش محل کے مصنف شوکت تھانوی قلم اٹھاتے تو اتنا ضرور کہتے، ایک شعلہ جو مسلم لیگ کی سیاسی چتا سے اٹھا، لیکن اس سے حزب اختلاف کے اندھیرے میں چراغاں ہو گیا۔ خواجہ حسن نظامی خامہ فرسائی کرتے تو فرماتے، ایک شمع جس سے کئی دیپ جلتے رہے ہیں۔

لمبا قد، اکہرا بدن، خوش گفتار، خوش رفتار گورا چٹا رنگ تھا۔ اب اس میں حوادث کی دستبرد سے کچھ غبار بھی جم گیا ہے۔ آنکھوں کا رس مرا نہیں لیکن اس میں سوچ کا عنصر بھی شریک ہوتا جا رہا ہے۔ ان کے خلاف یہ پروپیگنڈا عام رہا کہ وہ بولتے نہیں، لہٰذا یار ان کو پنجابی میں گونگا پہلوان کہتے رہے، جب وہ اعتماد سے بولتے اور دھیمے دھیمے، تقریر فرماتے ہیں تو ناطقہ بھی نثار ہوتا ہے۔ چوں کہ نواب ہیں۔ اس لیے عوام سے کنی کتراتے ہیں۔

ان کی عزیز متاع ان کی موٹر ہے۔ سفر میں ہوں تو فی گھنٹہ ستر اسی میل کی رفتار سے دوڑاتے ہیں، البتہ سواریوں کا خاص خیال رکھتے ہیں، ایک زائد سواری بھی انھیں گراں گزرتی ہے، دوسری چیز جس سے وہ محبت کرتے ہیں، گلوری ہے۔ اس سے صبح و شام لطف اندوز ہوتے ہیں۔ خوش پوشاک ہیں، خوش خوراک ہیں' ان کا ذاتی دشمن کوئی نہیں، البتہ خیالات کے دشمن بہت سے ہیں اور یہ ان کی ذاتی خوبی ہے کہ ان کے عقیدت مند ان پر جان چھڑکتے ہیں وہ آج بھی وزیرِ اعظم ہو سکتے ہیں، اور ان کے لیے اب بھی حکومت کے بڑے بڑے دروازے کھلے ہیں، لیکن وہ سودا بازی کے الزام تو سنتے ہیں، مگر سودا بازی کا کام نہیں کرتے۔ انھیں اپنی کوٹھی کا تخلیہ بیحد عزیز ہے، جہاں قائدِ اعظم کی گھورتی ہوئی قد آور تصویر

لشکتی ہے، جیسے کہہ رہی ہو۔

افتخار...... ہ!

بسکہ ہے فرصت گزار نفس یادو نفس
عوض یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز

☆☆☆☆

میر خورشید الزّماں

میر صاحب اصطلاحاً ''عوامی'' آدمی ہیں، اپنی طبیعت کے اعتبار سے عدالتِ عالیہ کے فیصلوں کی طرح سنجیدہ اور نطشے کے فلسفیانہ اوراق کی طرح ثقہ ہیں۔ گو آنکھوں پر دبیز شیشے ان کے ''محسوسات'' کو چھپائے رکھتے ہیں۔ اور مخاطب پا نہیں سکتا کہ ان کی باتیں اس پر کیا اثر چھوڑ رہی ہیں۔ لیکن ماتھے کی سلوٹیں ان کے شگفتہ ہونے کی چغلی کھاتی ہوئی عمر رسیدہ رخساروں کی دونوں تہوں تک پھیلتی چلی جاتی ہیں۔

خاندان کے بزرگ کشمیر سے اٹھے اور سیالکوٹ آباد ہوگئے۔ والد مرحوم سرکاری ملازمت میں تھے۔ دن کہیں صبح کہیں، رات کہیں۔

کوئٹہ سے میٹرک کیا۔ پھر علی گڑھ اسکول میں داخلہ لیا اور بی اے تک نکل گئے، آکسفورڈ سے دوبارہ بی اے کی سند لی، اور بار ایٹ لا ہو کر مراجعت فرمائے وطن ہوئے لاہور میں ۱۹۲۱ء میں پریکٹس شروع کی اور ۱۹۲۲ء میں ہائی کورٹ میں مقدمے کرنے لگے، اس زمانے میں ہائی کورٹ بار کے ممتاز وکلا میں ہندو ہی زیادہ تر سربر آوردہ سمجھے جاتے تھے۔ لیکن آپ نے معدودے چند مسلمان وکلا میں نام پیدا کیا اور اپنی شرافت و فراست کے باعث بڑے بوڑھوں میں بازی لے گئے۔

چوں کہ طبیعت میں شروع ہی سے کم آمیزی کا رنگ تھا، اس لیے ''تنہائی'' کو ''بازار'' پر مقدم رکھا۔

فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے

اصل اصول رہا۔ بعدۃ العمر سے بار ایسوسی ایشن کے نائب صدر چلے آتے تھے۔ پاکستان بنا تو ہائی کورٹ کے جج نامزد ہوگئے۔

آپ کے فیصلوں میں آپ کے تجربے کا توازن، قانون کی منشا، انصاف کی پختگی اور مشاہدے کی کھلاوٹ صاف صاف جھلکتی ہے بڑے دنوں سے پریس کمیشن کے قیام کا مطالبہ

ہو رہا تھا۔ حکومت نے اس پر صاد کیا اور آپ کی صدارت میں ایک کمیشن کی نیو رکھی۔ لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی۔ آپ کی ذات پر سبھی اخبار نویس متفق تھے۔ بلکہ ہر گوشۂ صحافت میں آپ کے مخلصانہ جذبات موجود تھے۔ مگر اخبار نویسوں کی مختلف صفوں میں تو تکار مانع رہا اور یہ "غنچہ" بن کھلے مرجھا گیا۔ اس طرح میر صاحب کے وہ رشحاتِ قلم تشنہ رہ گئے، جو کاغذ کے صفحوں پر منتقل ہوتے تو خلوتیانِ راز کا خیال ہے کہ صحافت کے لیے اہم دستاویز ہوتے۔ اب حکومت نے آپ کو مغربی پاکستان کے لیے کلیم کمشنر مقرر کیا ہے۔

چھوٹا قد، ستواں ناک، سوچتی اور بولتی ہوئی آنکھیں، چہرے پر گلابی اجالا، ماتھا کھلا، لیکن شکنوں سے داغدار، چال ستھری، ... زبان نرم، زبان دھیمے دھیمے سروں میں سندھی ہوئی کہیں ریشمی اور کہیں پاٹ دار، لہجہ شستہ بھی اور رفتہ بھی، اوڑھنا بھی قانون، بچھونا بھی قانون۔ مزاج دیکھا نہیں سنا ہے بیٹوں کی طبیعت سے قیاس ہوتا ہے منہ میں قدرے چاشنی ہے کیوں کہ بیٹا باپ کی تصویر ہوتا ہے۔ بقولِ جوش:

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں
فی زمانہ وضع کے لوگ اٹھتے جاتے ہیں۔
لگا کے آگ "انھیں" کارواں روانہ ہوا

اس وقت باسٹھ برس کے پیٹے میں ہیں۔ زمانے کے اتار چڑھاؤ دیکھ چکے ہیں سرد و گرم چشیدہ ہیں۔ غرض ان لوگوں میں سے ہیں، جو بہار و خزاں میں یکساں زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن خود مختلف الاصل موسموں نے ہر لحظہ تغیر میں باغ و بہار ہی رہتے ہیں:

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
شاید کہ تم کو میر سے صحبت نہیں رہی!

☆☆☆☆☆

استاد دامن

پنجابی زبان کا عظیم شاعر، کسی اختلاف کے بغیر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اُردو شاعری مین جو مقام و منزلت جوش ملیح آبادی کو حاصل ہے، وہی درجہ و مرتبہ پنجابی شاعری میں اُستاد دامن کو حاصل ہے۔ وہ الفاظ کا جادوگر، تاثر کا دیوتا اور لوگوں کو اپنے سانچے میں ڈھال لینے کا مناع ہیں۔ چہرے مہرے سے شاعر مطلقاً نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کوئی پہلوان ہے یا جغرافی گلوب۔ چہرہ جیسے تنا ہوا گھونسہ، آنکھیں دونالی بندوق کی گولیاں، ناک چھرا، رخسار اس سن و سال میں بھی گلاب جامن، ہونٹ کسی افریقی بت خانے کے تراشیدہ، لوگ اس کو محض پنجابی اور شاید اَن پڑھ خیال کرتے ہیں، لیکن وہ زبان اردو کی نوک پلک سے بھی واقف ہے۔ اور انگریزی بی اے تک پڑھی ہے۔ مجمعوں پر چھاجانا اور انھیں دفعتہً قہقہہ یا آنسو بنا دینا اس کی شاعری کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ یار لوگ اُسے مذاق سے ہنسی کا گول گپا بھی کہتے ہیں لیکن وہ استعمار کے زخموں پر ہنستا اور احرار کے زخموں پر روتا ہے۔ قدرت نے اس کے اشعار میں یہ تاثیر رکھی ہے کہ وہ دلوں کی تسخیر کرتے اور اُنھیں جذبہ و جوش کی زنجیر پہناتے ہیں۔ لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ اتنا بڑا شاعر ہونے کے باوجود زندگی نہیں گزار رہا، بلکہ زندگی اسے گزار رہی ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر ذاکر حسین

رادھا کرشن کی جگہ (نائب صدارت) ذاکر حسین کو دی گئی ہے۔ وہ کتنے بڑے آدمی ہیں، ہمارے ہاں کے وہی لوگ اس پر کچھ کہہ سکتے ہیں، جنھیں ان کی علمی عظمت اور شخصی وجاہت کا اندازہ ہے۔ اگر راجندر پرشاد کے لیے یہ کہنا درست ہے، کہ وہ رشی ہیں، تو ذاکر حسین اپنی کسر نفسی، ایثار روی، علمی سر فرازی اور داخلی و باطنی سنجیدگی کے باعث قرنِ اولی کی ایک ایسی شخصیت ہیں کہ ان کا شمار ان لوگوں کے ساتھ کیا جا سکتا ہے، جو ہر عہد، ہر مجلس، ہر سفر، ہر منزل اور ہر منصب پر اپنی چھاپ چھوڑ جاتے ہیں۔ قرون اوّل میں ہوتے تو صحابہ کے ساتھ ہوتے۔ راقم نے زندگی بھر اس مرتبے کا آدمی علمی خومت گزاری کے نشے میں اس طرح سرشار نہیں دیکھا۔ جامعہ ملیہ دہلی انھی کے خلوص و ایثار کا شہ پارہ ہے، جتنے فاضل و عام لوگ ذاکر حسین نے اپنے گرد جمع یا پیدا کیے، ان کا عہد ایسی مثالیں شاذ ہی رکھتا ہو گا۔ اس طرف کے بعض ہندو اخباروں کا دل تنگ نہ ہوتا، تو وہ ذاکر حسین کو اپنے عزیز ترین بتوں میں جگہ دیتے۔ لیکن ہندوستان کا انھیں اس طرح قبول کر لینا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ نفس، قلب اور دماغ کے اعتبار سے کتنے بڑے آدمی ہیں۔ جس نے جامعہ ملیہ کو اپنے فاقوں سے پالا ہو، وہ لازماً اپنے موجودہ عہدے پر ایک ایسا نقش چھوڑے گا کہ اس میں بہت کچھ جھلکتا ہو گا۔ اُن کا نائب صدر ہونا گویا سیاست کی طرف سے علم کا اعتراف اور اس کو خراج ہے۔

ذاکر حسین نے روپے پیسے کی تمنا ہی نہیں کی۔ وہ اس راہ میں ابوذر غفاریؓ کے پیرو ہیں۔ ان کی ساری کمائی جامعہ ملیہ ہے۔ اور اس کتب نے انھیں اس منصب تک پہنچایا ہے۔

بہت کم لوگوں کے حافظے میں ہو گا کہ فسادات پنجاب کے آخری دنوں میں جب آزادی کے آنے میں چند ہی دن باقی تھے، ذاکر حسین لاہور سے دہلی جا رہے تھے، اور یہ وہ دن تھے جب مسافروں کو گاڑیوں سے اتار کر قتل کر دیا جاتا تھا۔ جالندھر کے اسٹیشن پہ کہرام مچا

ہوا تھا وہاں ڈبوں میں سے مسلمان چن چن کر نکال لیے جاتے، اور اسٹیشن سے باہر چوک میں لے جا کر باری باری جھٹکا دیے جاتے۔ ذاکر حسینؔ کو بھی فرسٹ کلاس کے ڈبے سے اسی طرح اُتار اگیا۔ وہ چُپ چاپ اُتر کر ساتھ ہو گئے۔ پھر اُنھیں باہر ذبح ہونے والوں کی ڈار میں کھڑا کر دیا گیا۔ اُن کے سامنے لوگ قتل ہو رہے تھے، اور وہ جانتے تھے کہ ابھی اُن کی باری بھی آرہی ہے، لیکن اُن کے چہرے کی متانت اور دل کے یقین میں رتی بھر فرق نہ آیا۔ اپنے آپ کو خدا کی رضا پر چھوڑ دیا۔ اتنے میں ایک سکھ نوجوان نے جو غالباً کیپٹن تھا، انھیں پہچان لیا، فوراً آڑے آیا کہ ظالمو اسے قتل نہ کرنا، اس کا قتل علم کا قتل ہوگا۔ یہ ہندوستان کا بہت بڑا فرزند ہے۔ تمام قومیں اس کا احترام کرتی ہیں اور اسی طرح ذاکر حسینؔ موت کے منہ سے بچ گئے ورنہ آج یہ ساری باتیں خواب وخیال تھیں۔

''مولانا آزادؒ کی وفات پر اُنھوں نے جس خوبصورتی سے لیلا گراونڈ میں مولانا کو خراج ادا کیا تھا، آج تک اس کی گونج کانوں میں ہے۔ اُنھوں نے کہا: ''الہلال نے جو چراغ چلائے تھے، اس سے میں نے اپنی شمع کو روشن کیا تھا۔ آج وہ ہم میں نہیں، لیکن اُن کی لازوال شرافت یاد آتی ہے، تو دل کا عالم ہی عجیب ہوتا ہے۔''

فی الجملہ ذاکر ان محاسن و محامد کا مجموعہ ہیں، جو ہندوستان کی سرزمین میں ایک سرگذشت کے طور پر رہ گئے ہیں۔

☆☆☆☆☆
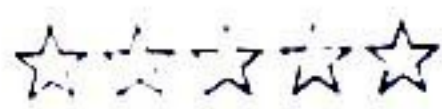
شورش مرحوم نے جس واقعہ کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے ضرورت ہے کہ اسے تصحیح و تفصیل کے ساتھ پیش کر دیا جائے۔ یہ واقعہ ڈاکٹر ذاکر حسین (داستان نجات) کے عنوان سے صدق جدید لکھنو (۳ر اکتوبر ۱۹۴۷ء) میں نقل کیا گیا ہے۔ واقعہ یہ ہے!

نئی دہلی۔ ڈاکٹر ذاکر حسینؔ صاحب شیخ الجامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کو جالندھر اسٹیشن پر جو واقعہ پیش آیا اس کی تفصیل خود اُنھیں کے ایک رفیق کار نے اپنے ایک نجی خط میں لکھ کر بھیجی ہے، جو ذیل میں اختصار کے ساتھ درج کی جاتی ہے۔ اس سے صورت حال کی نزاکت کا اندازہ ہوگا۔

ڈاکٹر صاحب کی گاڑی جب جالندھر کے اسٹیشن پر پہنچی تو وہ کیا دیکھتے ہیں اسٹیشن تمام مسافروں سے خالی ہے اور پلیٹ فارم پر مسلح فوج کا پہرہ لگا ہوا ہے۔ اتنے میں کچھ لوگ مسلح کرپان اور بندوقیں لگائے سامان کے پاس آ کے کھڑے ہوئے اور کسی نے ہولڈال لیا، کسی نے سوٹ کیس، کسی نے ٹوکری سنبھالی اور سب چل دیے۔ ذاکر صاحب نے سمجھا کہ شاید یہ مسافروں کی امداد کے لیے حفاظتی دستہ ہے، چناں چہ وہ ان کے پیچھے ہو لیے۔ ذاکر صاحب اس گروہ کے پیچھے پیچھے چلے مجمع سامان اُٹھا کے آگے جا رہا تھا جب وہ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے کے پاس سے گذرے تو ایک نوجوان نے انھیں دیکھ لیا اور وہ چپکے سے آکر ان سے بولا کہ آپ ادھر مت جائیے بلکہ میرے ساتھ کمرے میں چلیے۔ چناں چہ وہ اُس نوجوان کے ہمراہ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں جا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے دو بڑے دراز قد شخص لمبی تلواریں لیے ہوئے کمرے کے دونوں جانب آکر کھڑے ہو گئے اور ڈاکٹر صاحب کو اشارہ کرنے لگے کہ وہ باہر آ جائیں۔ ڈاکٹر صاحب اُٹھنے والے ہی تھے کہ اُس نوجوان نے پھر آکر کان میں کہا کہ آپ باہر ہرگز نہ جائیے ورنہ خیر نہیں، اس نوجوان کی یہ بات اسٹیشن ماسٹر کو ناگوار گزری اور اس کہا اچھا سب لوگ اب باہر چلے جائیں۔

اتنے میں خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ایک نوجوان سکھ فوجی سپاہی ادھر آنکلا۔ اُس نوجوان نے اس سے ذاکر صاحب کو ملایا اور کہا کہ آپ فلاں صاحب ہیں اور آپ کی جان بچانی ضروری ہے۔ اس نوجوان فوجی سپاہی نے دو گارڈ اسٹیشن سے لیے اور ذاکر صاحب کو لے کر باہر نکلا اور کہا کہ آپ میرے ساتھ فوجی کار پر چلیے۔

اُنھوں نے کہا کہ مگر میرا سامان اُدھر گیا ہے۔ فوجی افسر نے کہا ذاکر صاحب آپ سامان کو بالکل بھول جائیے۔ اس وقت آپ کو ان دو چیزوں میں انتخاب کرنا ہے کہ آپ اپنی جان بچاتے ہیں یا سامان لیتے ہیں، یہ سن کر ذاکر صاحب کو حیرت ہوئی اور سمجھے کہ معاملہ بہت ہی غیر معمولی ہے۔

جب یہ سب لوگ اسٹیشن سے باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ مسلح سکھوں کی ایک جماعت ہے اور مسلح لاریاں ہیں جو مسافر آتا ہے وہ ان کے پاس لایا جاتا ہے اور وہ اس کا سامان

وغیرہ لوٹ کر اسے ختم کر دیتے ہیں۔ ان لوگوں نے جب ڈاکٹر صاحب کو فوجی افسر کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھا تو وہ آگے بڑھے اور بولے کہ انھیں کہاں لے جا رہے ہو یہ تو ہمارے آدمی ہیں۔ اُس کو افسر نے جواب دیا کہ خبردار تم ادھر قدم نہ بڑھانا۔ انھوں نے پھر اصرار کیا اور اُس سے کہا کہ یہ تمھاری حدود سے باہر ہے۔ اتنے میں وہ فوجی امسر نامی گن سے .. اتر آیا اور M کہا اگر مقابلہ کرنا ہے تو آجاؤ، یہ دیکھ کر وہ سکھ پیچھے ہٹے اور یہ افسر ذاکر صاحب کو لے کر آگے بڑھا اور انھیں اپنے جج دوست بیدی صاحب کے یہاں لے جا کر اتار دیا جہاں فوجی پہرہ اور حفاظت کا پورا سامان تھا، رخصت ہوتے وقت اُس افسر نے کہا کہ جب پھر میری ضرورت ہو تو بے تکلف مجھے یاد فرمالیجیے۔ میں آپ کو حفاظت سے جہاں کہیں گے چھوڑ آؤں گا۔

ذاکر صاحب ایک شب بیدی صاحب کے یہاں قیام کر کے پھر اسی فوجی کی مدد سے اسٹیشن پہنچے اور اپنی جان لے کر دہلی واپس آگئے۔

☆☆☆☆☆

راج گوپال اچاریہ

انھوں نے جب گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالا، تو اعلان کیا تھا کہ وہ اس عہدے کی بھاری تنخواہ بیس بائیس ہزار کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے، وہ پانچ سو، ہزار سے زیادہ نہیں لیں گے۔ انھوں نے اپنی تنخواہ میں خود ہی رضا کارانہ ترمیم کر دی تھی۔ اس پر پنڈت جواہر لال نہرو نے پارلیمنٹ میں سربراہ ملک کی تنخواہ کا ایک بل پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ عہدے کی بلندی کا تقاضہ ہے کہ وہ کم سے کم ایک معیاری تنخواہ قبول کریں۔ آنجہانی وائسراؤں کے، قابلے میں تنخواہوں کا یہ سکیل بہت ہی کم کر دیا گیا، مگر اچاریہ نے اتنی ہی قلیل رقم وصول کی، جتنی وہ چاہتے تھے۔ باقی وہ غالباً دان کر دیتے تھے۔ پچھلے دنوں راقم الحروف کامن ویلتھ کانفرنس کے سلسلے میں مندوبین کے ساتھ مدراس گیا۔ تو اپنی گینسٹر کے ساتھ اچاریہ جی کے ہاں بھی پہنچا، وہ مقامی زبان کے ایک ہفتہ وار اخبار کے مالک کی اقامت گاہ میں ایک جھونپڑی میں رہتے ہیں، دو چار کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، چارپائی اور بستر تھا، فون تھا، اور قلم یا کاغذ، یا پھر اخباروں کے تراشے، انسان حیرت زدہ ہوتا ہے، کہ یہ لوگ کس عجز اور سادگی کے ساتھ اپنے دن گذارتے ہیں زیادہ سے زیادہ اس جھونپڑی میں تین چھوٹی چارپائیوں کی جگہ ہوگی۔ جانے بغیر قطعاً احساس نہیں ہوتا، کہ یہی شخص ہندوستان کا گورنر جنرل تھا، یا اس منحنی قامت کے اندر ہندوستان کا ایک نامور فرزند اور سیاستدان رہ رہا ہے

ڈاکٹر راجندر پرشاد

ہندوستان کے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرشاد اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے ہیں۔ وہ دوبارہ صدر منتخب کیے گئے۔ اب بھی اگر ان کی صحت اجازت دیتی اور وہ انتہائی معمر نہ ہو جاتے، تو ہندوستان انھیں تیسری بار صدر منتخب کرنا بھی اپنے لیے باعث فخر سمجھتا۔ انھوں نے اس سب سے بڑے عہدے پر دس بارہ سال کا جو عرصہ گزارا، ہندوستان کی اور ہندوستان کی سرزمین کے لیے ہمیشہ ہی یادگار رہے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ہندوستان کے سنگھٹنی عوام کشادہ دل ہوتے، اور مسلمانوں کے ساتھ وہ برتاؤ کرتے، جو آج ان کے چہرے پر رسوائی کا برص بنا ہوا ہے، تو ہندوستان کو قدرت نے گاندھی کے جانشینوں کی شکل میں جو بڑے لوگ دیے تھے اور جن میں سے اب بھی راجندر اور ونوبا جیسے لوگ حیات ہیں، ایک ایسا سرمایہ تھے کہ پورا ایشیا ان پر فخر کر سکتا ہے۔ راجندر کبھی معمولی آدمی نہ تھے انھوں نے اپنی زندگی کا آغاز ایک قانون دان کی حیثیت سے کیا تھا، گاندھی جی نے ان پر ایسا جادو کیا کہ وہ ان کے بھگت ہو کر انھی کے ہو گئے اور پھر اپنے آپ کو ہمیشہ کے لئے گاندھی جی کا تابع کر دیا۔

انھوں نے اتنے بڑے عہدے پر پہنچ کر اپنی طبیعت کے عجز، سادگی، انکسار اور فروتنی کو لحظہ بھر کے لیے بھی ترک نہ کیا، وہ ایشیا کی سب سے بڑی سرکاری عمارت یعنی ہندوستان کے قصر صدارت "راشٹر یہ بھون" کے سادھو منش صدر تھے۔ اسی زمانے میں انھوں نے اپنے گورو گاندھی جی کا تذکرہ "باپو کے قدموں میں" کے نام سے تحریر کیا، یہ تذکرہ ہندوستان کی سبھی زبانوں میں شائع ہو چکا ہے۔ آغاز اس طرح کیا ہے کہ باپو کا ذکر کرنا ایسا ہی ہے، جیسے تیرتھ یاترا کرنا!

آج سے پانچ چھ سال پہلے راقم الحروف ان سے دہلی میں ملا، تو راشٹر یہ بھون کے جاہ و جلال میں، وہ ایک فقیر کی طرح رہ رہے تھے۔ مولانا آزاد نے ان سے ملوایا تھا، جب قصر

صدارت کے جدوجہد اور دربانوں کا چکر ختم ہوا اور میں ان کے کمرے میں پہنچا، تو وہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ بعض پاکستانی دوستوں کی صحت کا پوچھا، پھر سر جھکالیا اور ہاتھ باندھ کر کہا: "آپ لوگوں کو اپنے دیش کی سیوا کرنا اپنا فرض بنالینا چاہیے، قومیں اور ملک سیوا ہی سے بنتے ہیں" وہ کھدر کے سوا پتھ نہیں پہنتے۔ راشٹریہ بھون کے تین کمرے ان کے استعمال میں تھے، اپنے یا اپنی اولاد کے لیے ان کا کوئی ٹھاٹھ نہ تھا۔ آپ نے صدر کی سب سے بڑی تنخواہ کو ترک کر کے پارلیمنٹ، کابینہ اور رفقا کے اصرار پر صرف دو اڑھائی ہزار ماہانہ قبول کیا تھا۔ لیکن پھر اس پر بھی راضی نہ ہوئے اور آٹھ سو روپے ماہوار لینے لگے۔ ان کے نزدیک گرانقدر مشاہرہ قوم کی غریبی پر ایک ظلم کے مصداق تھا۔ اب وہ پٹنہ کے صداقت آشرم میں چلے گئے ہیں، جو بہار کے ایثار پیشہ اور نیک نفس راہنما مولوی مظہر الحق بارایٹ لا نے بنوایا تھا اور مدۃ العمر سیاسی تحریکوں کا مرکز رہا۔ کئی دفعہ برطانوی سرکار نے ضبط کیا۔ اسی آشرم میں منتظمین نے ان کے لیے ایک دوسری عمارت بنوانی چاہی، ور وہ بن بھی رہی ہے، مگر مانے نہیں۔ پرانی بلڈنگ ہی کو ترجیح دی ہے اس میں بالائی منزل پر چار پانچ کمرے ان کے لیے مخصوص کیے گئے ہیں!!

ان کی اس ایثار نفسی اور عاجزی ہی کا اعتراف ہے، کہ ہمارے ملک کے بعض نمایاں اخبارات نے بھی انھیں خراج ادا کیا، اور ان کی سیرت کے اس ورق کو تقلید کے قابل قرار دیا ہے۔

واضح رہے کہ راجندر بابو ایک بہت بڑے اسکالر، مصنف اور سیاستدان ہیں۔ ان سے پہلے راجگوپال اچاریہ ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل تھے۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر رادھا کرشن

اب پہلے نائب صدر ڈاکٹر رادھا کرشن صدر منتخب ہوئے ہیں۔ رادھا کرشن بنیادی طور پر ایک عالم، فلسفی اور مصنف ہیں۔ ان کی مشہور کتاب فلسفہ شرق جس کا دیباچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے، شہرہ آفاق ہے۔ انھیں راقم الحروف نے پچھلے دنوں راشٹر پتی بھون کے استقبالیہ میں دیکھا تھا، جو سی۔ پی۔ یو کے مندوبین کے اعزاز میں دیا گیا تھا۔ سر پر مدراسی طرز کی سفید برہمنی پگڑی، بند گلے کا سفید کوٹ، نیچے سفید دھوتی۔ سادگی لیے ہوئے ہے، قد میانہ، قامت منحنی، لیکن اس میں ایک ایسا وجود چھپا ہوا ہے، جس کا مشرق و مغرب کی علمی فضاؤں میں بے حد احترام کیا جاتا ہے۔ انھوں نے بھی اپنی ماہانہ تنخواہ ڈھائی ہزار رکھی ہے، جو انکم ٹیکس، نیز دیگر کاٹ کے بعد اٹھارہ انیس سو رہ جاتی ہے۔ یعنی اصل تنخواہ کا پانچواں حصہ۔ انھوں نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ انھیں ہر شخص بدھ اور اتوار کے روز اوقات مقررہ پر بغیر اجازت راشٹر پتی بھون میں آکر مل سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کو کسی سے کوئی خطرہ نہیں۔ یہاں قوم کے یہ ارکان ہیں جو اپنے عالموں، دانشوروں، فلسفیوں اور راہنماؤں کی قدر کرنا جانتی ہے۔ رادھا کرشن کے لیے ہندوستان کی صدارت واقعی ایک بڑا اعزاز ہے، لیکن رادھا کرشن اس عہدے پر نہ پہنچتے، تو بھی اپنے رشحات قلم کی بدولت وہ مدتوں زندہ رہنے والی شخصیت ہیں۔

☆☆☆☆

رازق الخیری

رازق الخیری، راشد الخیری کے فرزند اکبر، ملیے تو خوشی ہوتی ہے۔ جس دہلی کو راشد الخیری کی کتابوں میں پڑھتے اور سر دھنتے ہیں۔ وہ ڈھونڈھیے تو بعض ہستیوں میں بھی چھلکتی ہے۔ ہر بات میں رکھ رکھاؤ ہے۔ بظاہر چپ چاپ سے دکھائی دیتے ہیں:

اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

بے ساختہ فقرے ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ اردو خانہ زاد ہے، شرافت موروثی ہے تواضع فطری ہے اور خود سر تاپا نستعلیق۔

قامت میانہ ہے، پیٹھ میں خم آگیا ہے، رنگ گہرا گندمی ہے، آنکھیں ہر لحظہ متحرک رہتی ہیں۔ سر پر ترکش کیپ، گلے میں شیروانی نیچے کھلی موری کا پائجامہ۔ القصہ زاویے بنتے ہوئے چلتے ہیں۔

پہلے جینے کے لیے مرتے تھے۔ اب مرنے کے لیے جی رہے ہیں۔ انھیں ملیے تو جوش کے اس شعر کا مفہوم ذہن میں خود بخود اترنے لگتا ہے:

بہت جی خوش ہوا کل جوش سے اے ہمنشیں مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

☆☆☆☆☆

جسٹس ایس۔ اے۔ رحمٰن

قانون، شاعری اور انشا، یہ شاذ ہی اکٹھے ہوتے ہیں، لیکن سارے پاکستان میں جسٹس ایس اے رحمٰن غالباً واحد شخص ہیں، جن کی ذات میں یہ تینوں چیزیں قدرت نے سمو دی ہیں قانون ان کے ہاتھ کی چھڑی، شاعری جیب کی گھڑی اور انشا قلم کی جھڑی ہے۔ وہ ایک شہ دماغ انسان ہیں۔ قانون کی سنگینی اور شعر و انشا کی رنگینی میں جو بُعد پایا جاتا ہے، ان کی ذات اس سے مستثنیٰ ہو گئی ہے۔ ان کے فیصلوں کی قانونی بصیرت اور اس بصیرت کے عمق کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں اس شاہراہ پر بادیہ پیمائی کا ڈھنگ آتا اور جو قانونی فیصلوں کے پیچ و خم سے آشنا ہیں اور جن کا بیان یہ ہے کہ ان کا ہر فیصلہ فہم و تدبر کی گھلاوٹ کا شاہکار ہے۔ احقر کے نزدیک ان کی شخصیت کا بھرپور اظہار ان کے مذاقِ شعر و ادب سے ہوتا ہے ان پر نثر و شعر کا کوئی سا گوشہ مخفی نہیں قدیم و جدید ادب کی تمام راہیں ان پر کھلی ہوئی ہیں۔ شاعری ان کا پیشہ نہیں، ذوق ہے۔ ادب ان کی عادت نہیں، فطرت ہے۔ وہ الفاظ کے تانے بانے نہیں بنتے بلکہ جو کچھ محسوس کرتے ہیں الفاظ کے سانچے میں اتار لیتے ہیں۔ ایک جج کی طرح سوچتے، ایک ادیب کی طرح سمجھتے اور ایک شاعر کی طرح بولتے ہیں۔ وہ مشرق کی اعلیٰ تہذیب کا ترت پھرت مجسمہ ہیں۔ ان کی روایتیں اور حکایتیں سب مشرقی ہیں۔ عجم کا حسن طبیعت، عرب کا سوز دروں قدرت نے انھیں انعامات ایزدی کے طور پر عطا کیا ہے۔ اگر یہ معلوم نہ ہو کہ جسٹس ایس اے رحمٰن مخاطب ہیں، تو انھیں دیکھ کر یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم جس شخصیت سے ہم کلام ہیں وہ ایک مجموعۂ کمالات ہے۔ ان کی شخصیت کئی شخصیتوں کا مرقع ہے۔ "نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پر سوز" اقبالؔ کے اس مصرعے کا اطلاق ان کی ذات پر بکمال و تمام ہوتا ہے۔

قامت قیامت تو نہیں لیکن بحر ہزج میں ضرور ہے۔ چہرہ حشو و زوائد سے پاک، اجلا گندمی رنگ، آنکھوں میں ذہانت اور فطانت کی دل فریبی، مرصع غزل کا بے ساختہ مطلع،

ناک ستواں رباعی کا چوتھا مصرع، ماتھا چہرہ کی تشبیب، جثہ ہلکی پھلکی غزل، چال میں قصیدے کی تمکنت، افکار میں گہرائی، گفتار میں رہنمائی، طبیعت میں صفائی، قرطاس و قلم سے آشنائی، اقبال کا شیدائی، فنونِ لطیفہ کا دلدادہ، بے نیازِ ساغر و بادہ، یمین و یسار کی مصلحتوں سے آزاد، رسول اللہ ﷺ کا خانہ زاد، توحید سے سرشار، شرک سے بیزار، اردو کا جی جان سے عاشق، لیکن نام میں انگریزی کی گرہ (ایس اے رحمٰن) ایس غالباً شیخ کا ہے اور اے عبد کا، چوں کہ خود شاعر ہیں اور شاعر جب تک شیخ کو موضوع سخن نہ بنالیں، اس وقت تک شاعری کی چھلیں ادھوری رہتی ہیں۔ لہٰذا قیاس یہ ہے کہ شیخ کو ''ایس'' کی اوٹ میں کر دیا ہے۔ تاہم یہ اوٹ کسی چوٹ کے اندیشے سے نہیں، بلکہ دستخطوں میں آسانی پیدا کرنے کی ایک ایسی روش ہے جو شاعری میں سہلِ ممتنع کہلاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

علّامہ رشید تُرابی

علّامہ فہامہ 'السنہ شرقیہ مین مہارت تامہ ایم، اے، ایل، ایل، بی کیا، لیکن قانون کے پیشے سے جی کھٹا ہو گیا۔ بقول سرشار بھاری پتھر تھا اُٹھ نہ سکا چوم کے چھوڑ دیا۔ آبائی وطن حیدر آباد دکن سلطنت عثمانیہ کا سورج ڈھل گیا تو اس کے سقوط پر کراچی چلے آئے۔ تب سے اب تک کراچی ہی میں ہیں۔ والدین نے رضا حسین نام رکھا، سینائے علم پر رشید ترابی ہو گئے۔ نتیجتہ اصل نام گم ہو گیا۔ رہا تو گھر بار کے بڑے بوڑھوں میں رہا۔ عامتہ الناس میں رشید ترابی کی دھاک بیٹھ گئی۔ ذہانت نے انگلی تھامی، فراست نے ہاتھ بٹایا، تدبر ساتھ ہو لیا، فہم نے حاشیہ باندھا، فکر نے چمکایا، نظر نے اٹھایا، علم نے بالا کیا، خطابت نے متابعت کی، زور بیان ہم کاب رہا، سیاست زبان کا زیور ہو گئی، جس موضوع کا انتخاب کیا لالہ زار کر دیا۔ ہر شخص پکار اٹھا کہ مخاطب ایک علامہ ہیں اور یہ علامہ گویا ان کے نام کا جزوِ غیر منفک ہو گیا۔ جس طرح الفاظ ان کی زبان پر آکر کھلتے اور کھلتے ہیں۔ اسی طرح علامہ کا لقب ان کے کمالات و محاسن کو یکجا کر کے ایک ایسی تصویر کا تصور جما دیتا ہے جس کی ہمنشینی کے بغیر ہم اس کی ہم سخنی کے عمق کا اندازہ نہیں کر سکتے ہیں۔

دھوم ان کی مدت سے کانوں میں پڑ چکی تھی کہ اثناء عشری علماء میں ان کے پایے کا کوئی عالم ہے، نہ خطیب، ذاکر، نہ واعظ، سحر ان کے الفاظ کی جان ہے، مطالب ان کی آن، تخیل ان کی اڑان، اور برجستہ پن ان کی شان، انھیں خطابت کی ادائیں کماحقہ آتی ہیں، آورد نام کو نہیں، لفظ ناپ تول کے بولتے ہیں اور جب بولتے ہیں تو موتی رولتے ہیں۔ انیس کے ہاں جو فصاحت ہے وہ ان کی خانہ زاد ہے اور دبیر کے ہاں جو بلاغت ہے وہ ان کے قصر خطابت میں حاجب کی خدمت پر مامور ہے۔ اقبال سے انھیں والہانہ عشق ہے۔ اپنے افکار و مطالب کو کلام اقبال سے اس طرح مزین کرتے ہیں کہ الفاظ کے فانوس خود بخود جگمگا اٹھتے ہیں۔ لاہور

میں دو تقریریں کیں، لیکن لاہور والوں کے دل موہ کر لے گئے بلکہ یوں کہیے کہ اُچک کر لے گئے۔ کوئی نوک نہیں، کوئی جھونک نہیں، اشارۃً یا کنایتہً بھی نشتر نہیں چبھوتے۔ بات اپنی کہتے ہیں، اور وہی کہتے ہیں جو ان کا من کہتا ہے، لیکن اس طرح کہتے ہیں جیسے ایک ابو ترابی کو کہنا چاہیے۔ خطابت میں اسی طرز بیان کی معراج کا نام نہج البلاغہ ہے۔ عام خطیب اس نہج ہی کو چھوڑ کر ٹھوکر کھاتے ہیں۔ رشید ترابی کے ہاں ایسی تمام ٹھوکریں، خود ٹھوکر میں رہتی ہیں۔

قامت فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلن کی بحر میں ہے۔ میانے اور لمبے قد کا حد اوسط، عمر کا صحیح اندازہ کرنا مشکل ہے۔ چہرے کی جھریوں سے قیاس ہوتا ہے، جوانی کو بڑھاپے کی گرہ لگ چکی ہے۔ لیکن آواز میں جو کرارا پن ہے، اس سے اس خیال کی تردید ہوتی اور یہ احساس اُبھرتا ہے کہ غمِ جاناں یا غمِ دوراں میں سے کوئی چیز ان کی عمر کو کجلا گئی ہے، ورنہ عناصر اربعہ کے اس پیکر میں جوانی ابھی تک سلگ رہی ہے۔ ماتھا کھلا، آنکھیں روشن، ناک ستواں، رنگ گندمی، داڑھی اور مونچھ دونوں کی تراش خراش سے چہرہ مہر د کربلائی ہو گیا ہے غم حسین سینہ میں بھی ہے اور چہرہ پر بھی، گویا ظاہر و باطن میں تضاد نہیں۔ ہائے جوش کہاں اور کس وقت یاد آگئے:

بہت جی خوش ہوا کل جوش سے اے ہم نشیں مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

ان سے رخصتی مصافحے کا لمس آج تک محسوس ہو رہا ہے اور اس قسم کے پر عظمت مافحے ہی طرفین کے معانقے کی راہ کھولتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

رئیس امروہوی

ملاقات ان سے بہت کم ہوئی ہے۔ غالباً دو یا تین دفعہ لیکن تصور میں ہر روز ملاقات ہوتی ہے۔ دو بھائی ہیں اور دونوں اُردو کے سب سے بڑے روزنامہ جنگ (بہ لحاظ اشاعت) کے چہرے کی آبرو! ایڈیٹر ہیں سیّد محمدؐ تقی کہ فلسفی زیادہ ہیں۔ عالم بھی اور ادیب بھی، دوسرے بھائی رئیس امروہوی ہیں جن کا قطعہ ہر روز "جنگ" کا نمائندۂ رخسار ہوتا ہے یوں کہہ لیجیے کہ جنگ کے ماتھے کا جھومر، چار مصرعوں میں نکتہ پیدا کرنا، بات نکالنا، طنز کر جانا، مسکرا کے نشتر چبھونا اور ساتھ ہی کہنا کہ آپ کو تکلیف تو نہیں ہوئی، رئیس کے ہاتھ کی چھڑی اور حبیب کی گھڑی ہے۔ اکبرالہ آبادیؔ آج زندہ ہوتے تو منہ چوم لیتے۔ لیاقت علی خاں کے عہد سے لے کر اس زمانے تک کے فرمانرواؤں میں سخن شناس ہوتے تو ان کا دامن موتیوں سے بھر دیتے یا پھر انھیں دار پر کھنچوا دیتے کیوں کہ اس ظالم کے چار مصرعوں نے بڑے بڑے گنبدوں کو پیوند زمین کیا ہے۔ شورش کاشمیریؔ سمیت بڑے بڑے شعراء نے ان کا تتبع کرنا چاہا۔

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

نقل نقل رہی، اصل اصل معلوم ہوتا ہے۔ شاعریؔ نے ان سے Love Marri-age کر رکھی ہے، نہ وہ ان کا پیچھا چھوڑتی ہے، نہ یہ اس کے عشق سے دستبردار ہوتے ہیں۔ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے یا گل وبلبل کا رشتہ، معلوم ہوتا ہے۔ رئیس امروہویؔ شاعری کے لیے پیدا ہوئے اور شاعری اُن کے لیے جنی گئی ہے۔ نثر میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ عجیب و غریب عنوانوں سے سیدھی سادھی زبان میں عجیب و غریب باتیں کہہ جاتے ہیں۔ آدمی پڑھتا اور سر دھنتا ہے۔ پاکستان کے روزناموں میں آج کل جتنے شاعر قلم گھسا رہے ہیں ہمعصر معاف فرمائیں! واقعہ یہ ہے کہ ان میں رئیس امروہوی سے بڑھ کر بدیہہ گو، نکتہ

ساحر لدھیانوی

نام عبدالحی، تخلص ساحر، وطن لدھیانہ۔ جاگیردار باپ کا اشتمالی بیٹا، نوعمر، نوجوان، شاعروں میں سب سے زیادہ مقبول، لیکن فیض احمد فیض کی صدائے بازگشت، اسی میں اس کی انفرادیت بھی شامل ہے۔ بڑا چپ چاپ، بید مجنوں، آنکھوں میں سگریٹ نوشی کا مٹیالا غبار، چہرے پر ماتا کے مدھم داغ، پیشانی قدرے کشادہ، لیکن شکنوں سے آلودہ، شعر کہتا نہیں جنتا تھا، کئی کئی دن ایک ہی مصرع گنگناتا رہتا۔ گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں عشق کیا، مگر ناکام، مذہب نے طنابیں کھینچ ڈالیں، لاہور میں کئی دفعہ بی، اے کا امتحان دینا چاہا، ایک دو دفعہ پرچے بھی کیے۔ لیکن عشق کے پیچ لڑتے رہے۔ اور امتحان کی شکل ہمیشہ کٹ گئی، حیدر آباد میں عشق کیا، بمبئی میں ہاتھ پاؤں بارے، مگر کہیں بھی محبوبہ کا دامن ہاتھ نہ آیا، عشق اس ذہنی احساس کی بھینٹ چڑھ گیا کہ مفلسی مانع ہے، چند لڑکیوں نے ساحر کو دھوکا دیا اور چند کو ساحر نے فریب میں رکھا۔

اس کش مکش میں وہ تقسیم ملک کے بعد بمبئی چلا گیا۔

اس کے تحت الشعور میں یہ خواہش ہمیشہ رہی کہ وہ کسی فلم کمپنی کے گیت لکھے، مکالمے لکھے، اس کے نیچے موٹر ہو اور وہ اپنی پہلی محبوبہ کی کوٹھی کے دروازے پر ہارن بجا کر کہے۔

دیکھو ...... میرے پاس بھی شورلیٹ ہے، اور پھر وہ ریڈیو پر اپنا کلام نشر کرے

اپنی تباہیوں کا مجھے کوئی غم نہیں
تو نے کسی کے ساتھ محبت نبھا تو دی

اور آج ساحر کامیاب ہے، اس کی موت کے بعد بھی اس کی دو معروف نظمیں، چکلے اور تاج محل، محو نہیں ہو سکتی ہیں۔ وہ انھی کی وجہ سے تاریخ شعر میں جگہ پا چکا ہے۔

☆☆☆☆☆

عبدالمجید سالک

پنجاب میں اردو صحافت کے عناصر اربعہ میں سے ایک! عناصر اربعہ، ظفر علی خاں، غلام رسول مہر، چراغ حسن حسرت اور عبدالمجید سالک۔ سر تاپا بذلہ، قلم میں لطافت، زبان میں شرافت اور دماغ میں فراست، بولتے نہیں موتی رولتے ہیں۔ ان کے قلم نے کبھی شعلے اور کبھی پھول بکھیرے ہیں۔ ان کی ادبی شہرت کو "افکار و حوادث" نے چار چاند لگائے ہیں۔ انھوں نے اردو کو نہ صرف بہت سے الفاظ دیے ہیں، بلکہ اچھوتی طنزیں بھی مہیا کی ہیں۔ سیاسی پھبتیوں میں ان کا جواب نہیں۔

ایک دفعہ کوئی صاحب اختر علی کی سیاسی بدحواسیوں کا ذکر کر رہے تھے، کہنے لگے: اختر علی کا ذکر چھوڑو وہ بھی تو تارا سنگھ ہی کا ترجمہ ہے۔ اسی طرح بعض سیاسی راہنماؤں کے نام بگاڑنے میں خاصا رنگ پیدا کیا۔ مثلاً سیف الدین کچلو (کیف الدین سچلو) عطاء اللہ شاہ بخاری (بخار اللہ شاہ عطائی)۔ مظہر علی اظہر (اِدھر علی اُدھر) ریمزے میکڈانلڈ (راجی کمندامل)۔ ابوالکلام (ابوالسکوت)

دلچسپ بات یہ ہے کہ "انقلاب" نے ہمیشہ فرقہ وارانہ ذہن کی آبیاری کی اور ان تحریکوں سے اجتناب کیا جو انگریزوں کے خلاف تھیں۔ لیکن سالک صاحب بذاتہٖ مرنجان مرنج ہیں۔ ان کے ہندو مداحوں کا حلقہ بہت وسیع ہے۔ اس اعتبار سے وہ درویش ہیں۔ جن ادیبوں یا شاعروں نے ان سے ذہنی تربیت حاصل کی ہے وہ سب کے سب ان کے برعکس انقلابی و سیاسی ہیں۔

بظاہر سالکؔ و مہرؔ میں امتیاز مشکل ہے۔ اور ایک زمانے میں تو بعض لوگ سمجھتے تھے کہ سالکؔ و مہرؔ ایک ہی نام ہے لیکن دونوں کی طبیعت میں تضاد ہے۔ سالکؔ طناز ہے۔ مہرؔ صحافی، سالکؔ ادیب ہے۔ مہرؔ عالم، سالکؔ ہنس مکھ ہے، مہرؔ متین۔ سالکؔ نقاد ہے، مہرؔ مورخ، سالکؔ شاعر ہے، مہرؔ مناظر، سالکؔ مجلس آراء ہے مہرؔ تخلیہ پسند ہے، سالکؔ جدید ہے، مہرؔ قدیم۔

۔ مت اپنے سیاسی خیالات کے لیے کسی سے نہیں لڑتا بلکہ وہ سیاسی خیالات کی صحت ہی کا قائل نہیں۔ لیکن مہر کے سیاسی خیالات ہی اس کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔

سالک دوستوں کا دوست ہے، وہ مہمان نواز بھی ہے اور دوست نواز بھی۔ اس نے ہزاروں دوستوں کی فرمائشوں کا ساتھ دیا ہے۔ اور زندگی بھر اتنے لوگوں کی سفارشیں کی ہیں کہ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ سفارشیں زیادہ کی ہیں یا افکار و حوادث کے کالم زیادہ لکھے ہیں۔ بہر حال سالک کے خوانِ التفات سے بے شمار لوگوں نے خوشہ چینی کی ہے۔

سالک صحافت کے سپاٹ میدان میں ایک عظیم قہقہہ ہے۔ جس کی خوشگوار گونج دور دور تک پھیلتی چلی گئی ہے۔ جس شخصیت یا جماعت کو بھی اپنی طنز سے جھنجوڑا ہے، وہ خود اس کی "دلآویزی" پر جھومتی ہے۔

☆☆☆☆☆

سجّاد ظہیر

سجاد ظہیر سے صرف دو دفعہ کی ملاقات ہے۔ دونوں دفعہ وہ اپنے پاکستانی رفیقوں سے راقم الحروف کی صلح کرانے کے لیے ملے اور کچھ عارضی مفاہمت بھی ہو گئی، لیکن پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔

سجاد ظہیر سے کبھی سیاسی رفاقت کا موقع نہیں ملا اور نہ ان کے نظریات سے، کچھ زیادہ اتفاق ہے، لیکن جہاں تک شرافت اور نجابت کا تعلق ہے، اور جس حد تک ان کے استقلال و ایثار کا سوال ہے، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ میرے نزدیک وہ کمیونسٹ پارٹی کے یوسف مہر علی ہیں، ترقی پسند ادب کے داعیوں میں سے ایک۔ کمیونسٹ پارٹی کے کرتا دھرتا، سرو زیر حسن کے نورِ نظر، علمی و ثقافتی خاندان کی ایک مشعل

گورا چٹا رنگ، آنکھوں میں مروت، لہجے میں، حیا کہ
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

تحریر میں سادگی، تقریر میں صفائی، والدین پیار سے بنے میاں کہتے تھے، اعزہ بھی بنے میاں کہنے لگے، اور اب جماعتی رفقا میں بھی بنے میاں ہی کہلاتے ہیں۔ بڑے پڑھے لکھے نوجوان ہیں۔ اپنے مقصد کی دھن میں زندگی کے شب و روز وقف کر رکھے ہیں اور شاید اسی کے لیے جی رہے ہیں۔

قیام پاکستان سے کوئی سال ڈیڑھ سال بعد کا واقعہ ہے، اپنے ایک لکھنوی افسر دوست سے ملنے گئے، ایک دوسرے کو دیکھا تو، ایسے ملے جیسے صدیوں کی جدائی ہوتی ہے، دیر تک بیٹھے رہے، تھوڑی دیر بعد، اجازت چاہی، تو افسر دوست نے کہا:

"بنے میاں! کہاں جاتے ہو، یہاں ایک مدت کے بعد تو آداب عرض سننے میں آیا ہے۔
ورنہ یہاں تو لوگ السلام علیکم نہیں کہتے پتھر لڑھکاتے ہیں"۔

سروجنی نائیڈو

ایک زمانہ تھا جب ہندوستان کی خواتین میں صرف سروجنی نائیڈو کا نام گونجتا تھا۔ ان کا سراپا ایک بلبل کا نہ تھا لیکن وہ واقعی ہندوستان کی بلبل تھیں۔

میں نے انہیں پہلی دفعہ لاہور کانگرس کے موقعے پر دیکھا تھا۔ دوسری دفعہ بریڈ لاہال کے مشاعرے میں۔ تیسری دفعہ بمبئی کے تاج محل ہوٹل میں اور چوتھی دفعہ پنڈت جواہر لال نہرو کے بنگلہ میں۔ لاہور کانگرس کے موقعے پر صرف اس نظر سے دیکھا کہ لوگ انھیں بلبلِ ہندوستان کہتے تھے اور زندہ باد کہنا ایک والہانہ صدا تھا۔

لالہ لاجپت رائے کے بت کی نقاب کشائی کے جلسے میں انگریزی تقریر کر رہی تھیں۔ میں ساتویں جماعت کا طالبِ علم تھا۔ اور میرے پلے کچھ نہ پڑتا تھا۔ مگر سامعین جھوم رہے تھے اور میں سمجھ رہا تھا کہ ایک نغمہ بہ رہا ہے۔

بریڈ لاہال کے مشاعرے میں طلبہ جوشؔ کو قہقہوں میں اڑا دینا چاہتے تھے، سروجنی بگولے کی طرح اٹھیں، سناٹا چھا گیا، اور کڑک کر کہا:

''تم جوش کی ہتک نہیں کر رہے۔ ہندوستان کے انقلابی ادب کی توہین کر رہے ہو اور نوجوان سرتاپا تعظیم ہو گئے!

مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح وہ بھی تخلیہ پسند تھیں۔ ان کے جوہر، شاعرانہ جوہر خلوت ہی میں کھلتے تھے۔ تاج محل ہوٹل ان کی بزم آرائیوں کے لیے مشہور تھا۔ بلا کی حاضر جواب، بلا کی ذہین، بذلہ سنجی میں گوہر یک دانہ، لطیفہ ساز اور لطیفہ نواز!

حیدر آباد ان کا وطن مالوف تھا۔ یوسف مہر علی نے کہیں لکھا ہے کہ کسی لطیفہ کے ملک میں پھیل جانے کا ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ سروجنی نائیڈو۔

ان کا اوڑھنا بچھونا فنونِ لطیفہ تھے۔ ان کا دل آئینے کی طرح صاف تھا۔

ان کے لغت میں ہندو مسلم نام کے تعصبات کو ذرہ برابر دخل نہ تھا وہ ان جھمیلوں سے

ماورئ تھیں، وہ سیاسیات میں رہ کر بھی سیاسیات سے کنارہ کش تھیں۔ ان کے قلم یا زبان سے "زخم" نہیں پھول جھڑتے تھے۔ وہ فی الواقعہ ایک شاعرہ تھیں۔ گاندھی جی کی ...
قائدِ اعظم کی دوست، اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں کی رعایا۔ سروجنی نائیڈو،

شاعرہ،

ادیبہ،

خطیبہ،

سیاستدان،

اور بالآخر انسان

☆☆☆☆☆

سلمیٰ

اختر شیرانی کی شاعری کا بنیادی موقف سلمیٰ تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ کوئی وجود نہیں بلکہ شاعر کا جمالیاتی ذوق اور تخیلی پرواز سمٹ کر سلمیٰ کے استعارے میں متشکل ہو گئی ہے۔ خود اختر شیرانی بھی سلمیٰ کے چہرہ راز سے نقاب اٹھاتے ہوئے جھجکتے تھے۔ ادھر ان کے دوست حضرت نیّر واسطی جو اس عشق کی ابتدائی کڑیوں کے رازدار ہیں۔ وہ بھی سلمیٰ کا سراغ دینے سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ ملکہ پکھراج کسی حد تک پتہ دیتی ہیں لیکن پھر گریز کرتی ہیں۔

سلمیٰ حیات ہیں اور نیّر واسطی کے حرم سے اب بھی ان کی ملاقات ہے۔ کشیدہ قامت، گورا رنگ لیکن ان کے پسِ پردہ غور و فکر کے طویل سلسلے جھانکتے نظر آتے ہیں۔ چہرہ کتابی، ناک ستواں، آواز میں دھیما پن۔

اختر شیرانی کے نام سے اداس چہرے پر حیا کی ایک سرخ سی لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ اختر کے متعلق کچھ نہیں کہتی، انھیں عام انسانوں ہی کی طرح ایک انسان سمجھتی ہے۔ اگر کوئی اسے اختر کے سوانح نگاروں کی طرف توجہ دلاتا ہے، تو وہ کھلکھلا کر ہنس دیتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان فطرۃً افسانہ ساز ہے وہ افسانوں سے محبت کرتا افسانوں کو ترتیب دیتا، انسانوں سے کھیلتا ہے اور ظاہر ہے کہ افسانہ و حقیقت میں اتنا ہی بُعد ہے، جتنا بُعد کہ سچائی اور جھوٹ میں ہے۔

☆☆☆☆☆

زیڈ اے سُلیری

میدانِ صحافت کے یکتا شہسوار، ایڈیٹروں کی ناک، چومکھی لڑنے میں منفرد، قلم تلوار، زبان شعلہ، دماغ حاضر، دلِ آئینہ، طبیعت رواں، دوستوں کے جگری دوست، دشمنوں کے پیدائشی دشمن۔ لوچ اور لچک سے ناآشنا۔ صبا کی طرح اڑتے اور تیر کی طرح ترازو ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں صحافت کی خصوصیت یہ ہوتی جارہی ہے کہ ایڈیٹر وزیروں سے ڈرتے ہیں، لیکن ان سے وزیر ڈرتے ہیں۔ ان کے قلم کا بانکپن خواجہ ناظم الدین کو حفظ ہے۔

خواجہ شہاب الدین جی ہی جی میں کہا کرتے تھے کہ اخبار نویسی میں ایسا بانکا پھکیت شاذ ہی پیدا ہوتا ہے۔ الطاف کے حلق کی پھانس "ٹائمز کراچی" کے مدیر، سیاستدانوں کے مشیر۔ غالباً ان کے پاس الہ دین کا چراغ ہے۔ ابھی خبر آئے گی کراچی میں ہیں دوبارہ فون کیجیے تو معلوم ہوگا کہ زیورچ جا چکے ہیں۔ وہاں ہوائی خط لکھیے تو پتہ چلے گا کہ بیروت چلے گئے ہیں۔ غرض!!

ایک چکر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں ہے

دہرا بدن، رنگ نکھرا ہوا گندمی، رخساروں پر کتابلی تہیں، آنکھیں کچھ ہنستی ہوئی اور کچھ سوچتی ہوئی، قامت درمیانہ، ناک ستواں، بول چال ٹھیٹھ پنجابی۔ بقول اقبالؔ کے:

اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر

یا پھر اگر ہو صلح تو رعنا غزال تاتاری

حسین شہید سہروردی

کل ہی کی بات ہے کہ حسین شہید سہروردی ہم میں موجود تھے اور ہم ان سے مستفید ہوتے رہے۔ تعجب ہوتا کہ ایک انسان میں کتنے ہی انسان سما گئے ہیں۔ بعض لوگ الفاظ کے معاملے میں بخیل ہوتے ہیں اور دوسروں کے محاسن کا اعتراف کرتے وقت اُن کی زبانوں کو لونی لگ جاتی ہے بعض اتنے فیاض ہوتے ہیں کہ ذرے کو بھی آفتاب کہہ جاتے ہیں۔ شہید سہروردی اُن لوگوں میں سے تھے، جن کی خوبیاں الفاظ میں نہیں آسکتیں، بلکہ الفاظ مُنہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ لوگ اُن کے بارے میں بہت سی رائیں رکھتے ہوں گے۔ کئی اُن کے قطعی مخالف ہوں گے، کئی مخلوط آرا کے مالک اور بیشتر اُن کی خوبیوں کے گرویدہ، اس قسم کے لوگ بھی موجود ہیں اور ان کی تعداد لاکھوں سے آگے نکل گئی ہے، جو انھیں دیوتا سمجھتے تھے۔ خود مغربی پاکستان میں ہزاروں انسان اس زمرے میں شامل کیے جاسکتے ہیں، جنھیں ان کے کمالات کا پرستش کی حد تک اعتراف تھا، لیکن اس افراط و تفریط کے باوجود وہ ایک انسان ہی تھے اُن کی کمزوریاں ایک جی نی اس (عبقری) انسان کی کمزوریاں تھیں اور اُن کی خوبیاں ایک انسان ہی کی خوبیاں تھیں، لیکن عظیم الشان انسان کی خوبیاں، جو قدرت اپنے کرم خاص سے کسی انسان کو کبھی کبھار عطا کرتی ہے۔ مثلاً وہ نسلاً بعد نسل قابلیت کی ایک ایسی تصویر تھے کہ اُس کے کسی خط میں کوئی نقص نہ تھا، سبھی خطوط بے عیب تھے۔ اُن کے خاندان میں علمی وجاہتوں کا ایک بازار لگا رہا۔ ایک ہی وقت میں کئی افراد خاندان علم و فکر کی مسندوں پر فروکش رہے۔ حکومتِ انگلشیہ کے عہد میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز ہوئے، ننھیال اور ددھیال دونوں طرف اعزاز و اکرام کا سلسلہ جاری رہا۔ خود ان کی والدہ عربی اور فارسی کی شاعرہ تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ وہ خاندان میں بہ لحاظ علم سب سے پیچھے ہیں۔ اپنے بڑے بھائی شاہد سہروردی کے سامنے وہ ایک طالب علم کی حیثیت سے کھڑے ہوجاتے اور آداب بجالاتے تھے۔ شاہد آکسفورڈ میں شیکسپیئر پڑھاتے رہے اور شہید کو اپنے بھائی کی اس عظمت پر عمر بھر

ناز رہا۔ وہ بڑے فخر سے بھائی کی علمی بلندیوں کا ذکر کرتے اور جھومتے تھے۔ اپنی بہن شائستہ سہروردی کی انگریزی دانی کے بارے میں بھی اُن کا یہی خیال تھا کہ وہ ان سے قابلیت میں منزلوں آگے ہیں لیکن ان کا یہ انکسار اپنے خاندان کے معاملے میں تھا، دوسروں کے مقابلہ میں وہ فروتنی کے قائل نہ تھے، بلکہ کان کتر کے چلتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ انگریزی زبان میں جو درخورِوانی انھیں حاصل تھا اور اُس کی نزاکتوں اور لطافتوں کے جس قدر وہ شناسا تھے پورے ملک میں ایک شخص بھی ان کا ہم پایہ نہ تھا۔ سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے نامور، جج محض اُن کی انگریزی سے لطف اندوز ہونے کے لیے ان کی بحث کو طول دیتے اور مختلف سوالات کر کے جوابات کے تیور دیکھتے تھے۔ انگریزی لکھنا اور بولنا، اردو محاورے کے مطابق ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ بڑے سے بڑا آدمی بھی ان کی انگریزی قابلیت کا لوہا مانتا تھا۔ بنگالی نژاد تھے لیکن اردو بولنے میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ ظاہر ہے کہ لہجہ اہلِ زبان کی طرح نہ تھا لیکن تلفظ کا پورا پورا خیال رکھتے، البتہ تانیث و تذکیر میں لطف پیدا کر جاتے۔ فارسی بھی خوب جانتے اور عربی سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ قرأت خوب کرتے، لیکن عام جلسوں میں نہیں، دوستوں کے تخلیے میں! انھوں نے تحریکِ پاکستان کی واقعتہً بڑی خدمت کی۔ قائداعظمؒ کے بعد انھیں کا نام سرِ فہرست آسکتا ہے، لیکن حالات کی بوقلمونی ان کی حریف ہوگئی اور یار لوگوں نے انھیں اُبھرنے نہ دیا، بلکہ ان کا راستہ روک کر کھڑے ہوگئے۔ پاکستان بنا تو مغربی بنگال ہی میں رہ گئے وہاں فسادات کے دوران میں ہندوستان کے مسلمانوں کو بچانے کے لیے مہاتما گاندھی کے ساتھ اتنا بڑا کارنامہ انجام دیا کہ تاریخ میں (بوجوہ) اس کارنامے کی جگہ ہو یا نہ ہو، لیکن اللہ کے ہاں اس کا اجر واقعی عظیم ہے۔ ان کی بخشش کے لیے یہی توشہ کافی ہے۔ پاکستان میں ان کی قدر ہی نہ ہوئی، نہ پاکستان نے ان کی قابلیت سے کماحقہ فائدہ اٹھایا، نہ ان کی قیادت ہی سے یہاں کے لوگ صحیح طور پر متمتع ہوئے۔ جس زمانے میں وزارت عظمیٰ کا منصب سنبھالا، اس زمانے میں انھیں سکندر مرزا جیسا دنی الطبع برطانوی گماشتہ ملا، جس کی شریانوں میں یاوہ گوئی اور سازش کا لہو دوڑتا تھا۔ اس نے اپنی عادات مستمرہ کے مطابق ان کی وزارت عظمیٰ کو جلد ہی چلتا کیا اور مدت العمر

خطرناک موڑ پر لگا دیا۔

مغربی پاکستان کے بڑے بڑے راہنما، اتنا مغربی پاکستان سے واقف نہیں تھے جتنا سہروردی نے شب و روز کی محنت سے شناسائی حاصل کی۔ وہ ایک ایک صوبے، ایک ایک ضلع، ایک ایک شہر، ایک ایک گاؤں میں گئے، لوگوں سے رابطہ پیدا کیا، لیکن برسوں کی محنت شاقہ کے باوجود مغربی پاکستان نے انھیں مایوس کیا اور یہ داستان اتنی طویل و دل گداز ہے کہ اشارۃً بھی اس "پیرائے" میں نہیں آسکتی ہے۔

وہ بڑے ہی نامور تھے۔ شاید پورے ملک میں ایک دو راہنما ہی ان کے ہم رتبہ ہوں۔ وہ چاہتے تو عام سیاست دانوں یا حکمرانوں کی طرح لاکھوں، بلکہ کروڑوں روپیہ پیدا کرتے، لیکن انھوں نے اپنی ذات کے لیے کچھ پیدا نہ کیا۔ جن مقدمات میں وکیل ہوتے، بڑی بڑی فیس لیتے، لیکن یہ تمام روپیہ اعانت خواہوں پر صرف کر دیتے، کسی شخص کی مدد کرتے وقت یہ بالکل نہیں سوچتے تھے کہ ان کا دوست ہے یا دشمن، وہ ہر انسان کی مدد کرنا اپنی سرشت کا جزوِ غیر منفک سمجھتے تھے۔ زندگی بھر لاکھوں روپے کمائے۔ بڑے سے بڑے عہدہ پر مامور رہے۔ متحدہ بنگال کے وزیرِ اعظم ہوئے۔ پاکستان کی مرکزی حکومت میں وزیر رہے، پھر وزیرِ اعظم ہو گئے سیکڑوں لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھایا اور دیکھتے دیکھتے کہاں سے کہاں نکل گئے، حتیٰ کہ لکھ پتی ہو گئے مگر اپنی ذات کے لیے انھوں نے ایک دمڑی بھی محفوظ نہ رکھی، ایک ذاتی مکان نہ بنایا۔ غالباً کراچی میں قسطوں پر ایک قطعۂ زمین کوٹھی بنانے کے لیے خرید کیا، لیکن قسطیں ادا نہ کر سکے، اور یہ اس شخص کا حال تھا، جو اپنی وکالت کے باعث ماہانہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ کما سکتا تھا، لیکن اس سکندری کے باوجود قلندری اس کے ساتھ تھی۔ ضرورت کے مطابق جتنا کماتا اس سے زیادہ ساتھیوں پر خرچ کر ڈالتا تھا۔

اس کا وجود ایک تاریخ تھا۔ وہ تحریکِ خلافت سے لے کر تحریکِ پاکستان تک ابھرتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ بالا بلند ہو گیا اس کا نام ملک کے طول و عرض میں اور ملک سے باہر گونجنے لگا۔ پھر اس کو دیارِ غیر میں قضا نے شکار کیا، اپنی ذہانت سے مغربی پاکستان کی جڑ سیاست کو سرسبز کرتا رہا، مشرقی پاکستان کا ہیرو رہا، بیروت میں دم توڑا، ڈھاکہ میں دفن ہو گیا۔

قد درمیانہ، مزاج شاہانہ، طبیعت قلندرانہ، سیرت فقیرانہ، سوچ مدبرانہ، اقدام دلیرانہ، زبان ادیبانہ، چلن شاعرانہ۔ رنگ گندمی، چہرہ کتابی، ناک کشیدہ، ماتھے پر جھریاں، آنکھیں متحرک بھی اور روشن بھی، رفتار میں تمکنت، گفتار میں صولت، دولت اس کے گھر کی لونڈی لیکن شاہ خرچ، ذوق میں تھوڑی سی رندی، جس کی آرائش شاعروں کی فکر میں پائی جاتی ہے، درویشوں میں درویش، فقیروں میں فقیر، عالموں میں عالم، سیاستدانوں میں سیاستدان اور سب سے بڑا سیاست دان، اتنی خوبیاں کہ گناؤں تو گنا نہ سکوں، اور نقص ایک ہی تھا کہ وہ ایک چشمۂ صافی تھا، جس سے انسان بھی پانی حاصل کرتے اور جانور بھی پیاس بجھا لیتے تھے۔ وہ قلندروں کے آستانے کی طرح تھا کہ سبھی قسم کے لوگ فیض پاتے تھے۔ اس کو مغربی پاکستان کے بعض "منچلوں" نے بڑے بڑے دھوکے دیے وہ حرف شکایت زبان پر لانا ہی نہیں جانتا تھا اور اگر اس میں کوئی عیب تھا تو سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ اس کے حاشیہ میں مصحفی و مضحک کی ہجو یہ شاعری کے آوارہ مصرعے بھی نکلے رہتے تھے آہ!

اب اس کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

☆☆☆☆☆

سردار شوکت حیات

کبھی شوکتِ پنجاب تھے، یاروں نے شوکتِ اسلام کا لقب بھی دے رکھا تھا۔ آج کل صرف شوکت حیات ہیں، اور افتخار الدین کے "امین احسن اصلاحی۔" بہ ظاہر پیارے نظر آتے ہیں، دل کا حال خدا جانتا ہے۔ باپ وزیر اعظم تھے، اور سچ تو یہ ہے، پنجاب سکندر حیات پیدا نہیں کر سکتا، مرحوم افرنگ کی انگوٹھی میں نگینہ تھے لیکن سچا، آج کل کی طرح نہیں کہ انگوٹھی ہے تو وہ بھی جھوٹی اور نگینہ ہے تو وہ جھوٹا اور باگ دوڑ ہے ان کے قبضہٗ قدرت میں ہے، جن کی سیاست پر جھوٹا جھول چڑھا ہوا ہے۔

جثہ لاغر ہے، قامت بالا ہے، اور رنگ افتخار الدین سے کہیں چٹا ہے۔ لیکن آنکھیں لم چھڑی ہیں، اکل کھرے پنجابی ہیں۔ جب وزیر تھے تب بھی دوستوں کے دوست تھے، اب فقیر ہیں، پھر بھی دوستوں کے دوست تھے، اب فقیر ہیں، پھر بھی دوستوں کے دوست ہیں۔ البتہ اس وقت افتخار انھیں غدار کہتا تھا، اور یہ افتخار کو روس کا غاشیہ بردار سمجھتے تھے۔ ب دونوں میں گاڑھی چھنتی ہے، دونوں کا درد مشترک ہے، اور اسی کا نام سیاست ہے، ممدوٹ کے کابینہ میں وزیر تھے۔ ممتاز کے ساتھ مستعفی ہو گئے اور افتخار کے ساتھ سرگرم سفر ہیں۔

کبھی شیروانی پہنتے ہیں اور کبھی سوٹ۔ جی چاہا تو سر پہ جناح کیپ رکھ لی۔ نہیں تو ننگے سر کو ترجیح دیتے ہیں، ہاں! والد کا طرہ غائب غلہ کر دیا ہے۔ اس بالی عمریا میں معیشت کے اعتبار سے کئی پینترے بدلے ہیں، پہلے فوج میں تھے، انگریز نے اٹھایا اور وزیر بنا دیا، کمسنی نے سیاسی مصلحتوں کے مذبح پر ذبح کر ڈالا، پاکستان بنا تو وزیر بن گئے آخر مستعفی ہو گئے کچھ دنوں سیمنٹ بیچا، پھر نیشنل بینک میں ملازمت کر لی۔ وہاں سے نکلے تو میدان سپاٹ تھا، ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارے۔ آج کل کھانڈ کی تجارت کرتے ہیں، غرض کہ خود کماتے اور خود کھاتے ہیں کبھی کبھار ممتاز دولتانہ کو دیکھتے تو زیر لب ضرور گنگناتے ہیں:

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو

☆☆☆☆☆

(۲)

"جس باپ کا بیٹا ہے بڑا نام تھا اس کا"، سردار سکندر حیات کے فرزند دل بند، فطرتاً ارجمند، نقش و نگار، رنگ روپ اور خط و خال کے اعتبار سے باپ کی ہو بہو تصویر، ان کے چہرے پر سنجیدگی زیادہ تھی اور وہ زمانے کے سرد و گرم چشیدہ تھے، یہ زمانے کے سرد و گرم ...یدہ ہیں۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ عام ہے، بلکہ اکثر و بیشتر کھیلتی رہتی ہے۔

تحریک پاکستان کے زمانۂ عروج میں جب ملکِ خضر حیات کی وزارت سے انھیں ...گ کیا گیا تو صوبہ کے گورنر نے ان پر تعلیمات کے محکمہ کی ایک لیڈی سپرنٹنڈنٹ کے ناجائز ...کر لاکھوں کی تعداد میں چلے آرہے تھے، غرض یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ممتاز دولتانہ کے ساتھ ان کا نباہ مشکل تھا، جلد ہی ان کی خوبصورت باتوں سے دل برداشتہ ہو کر الگ ہو گئے۔ میاں افتخار الدین کے پاس دو طاقتور اخبار تھے ایک انگریزی، دوسرا اردو میں، ان کے علاوہ ایک عدد پولیٹکل آرگنائزیشن "آزاد پاکستان پارٹی" افتخار کا جی جان سے ساتھ دیا بالآخر اس کو بھی چھوڑ دیا۔ کیونکہ میاں صاحب مرحوم سے ان کی اپنی ذات کا نباہ مشکل تھا۔ وزارت نے تو ان سے آنکھیں ہی پھیر لیں، یہ عروس ادھر ادھر اڑتی رہی دوبارہ ان کے عقد میں نہ آئی اور نہ شاید انھوں نے کبھی اس سے عقد ثانی یا عقد ثالث کی کوشش کی۔ کاروبار کی دوسری راہوں میں لگ گئے اور اچھا کاروبار پیدا کر لیا، اس میں جم گئے تو پھر سیاسیات میں آنکلے۔ آج کل سیاسیات میں ہیں اور پاندو کی مسلم لیگ کے مقابلے میں کورو کی مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری ہیں۔

...بدن اب بھی لاغر ہی ہے، اگرچہ پہلے کی نسبت بدن پر گوشت کی ایک پرت زیادہ چڑھ گئی ہے۔ قد بلند ہے، رنگ سرخ و سپید، آنکھیں لم چھڑی، اکل کھرے پنجابی، دوستوں کے

تبادلہ یا اسی نوعیت کے کسی اور مبادلہ کا الزام لگا کے اس طرح رخصت کر دیا، جس طرح صاحب لوگ خانساماں لوگوں کو چھٹی دے دیتے ہیں۔ لیکن ان کی وزارت سے علیحدگی پنجاب میں مسلم لیگ کے سونے پر سہاگہ ہوگئی صوبہ کے نوجوان ان پر لٹو ہو گئے جگہ جگہ شوکت پنجاب، اور شوکتِ اسلام کے ''فلک شگاف'' نعرے گونجنے لگے............! یونینسٹوں اور گلینسی کو ناگوار تھا کہ شوکت حیات ان کے مقابلے میں قائدِ اعظم کے ساتھ رہے اور ''بے قابو'' ہو کر رہے، انھوں نے پہلے تو سمجھایا بجھایا جب شوکت نے سرکش گھوڑے کی طرح پٹھے پر ہاتھ دھرنے نہ دیا، تو وزارت سے چلتا کیا، اور شوکت حیات نے بھی اس ''حادثہ'' کو ہنسی خوشی قبول کر لیا۔ یہ تھا ان کی سیاسی شہرت کا حرفِ آغاز، دہلی کے مسلمانوں نے ہاتھی پر جلوس نکالا، جونہی پاکستان بنا شوکت ممدوٹ وزارت میں شریک ہو گئے، غالباً وزیر مال رہے، طبعاً شریف نوجوان ہیں اثنائے وزارت میں ممتاز دولتانہ نے بتھے چڑھا لیا، ان کے ساتھ مستعفی ہو گئے لیکن اب نہ شوکتِ اسلام تھے نہ شوکتِ پنجاب، عامتہ الناس کو اور بہت سے حادثات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، جن میں سب سے بڑا سانحہ مہاجرین کا سانحہ تھا کہ لوگ پٹ پٹا دوست بلکہ دشمنوں کے بھی دوست، انسان ان سے ملے تو شرافت کا احساس لے کر اٹھتا ہے۔ ان کے بارے میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ منتقم ہیں، انگریزی محاورے کے مطابق PERFECT GENTLE MAN ہیں۔

☆☆☆☆☆
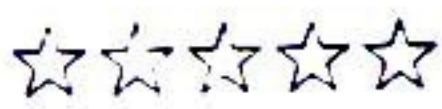
مولانا شوکت علی

کبھی، ایک زمانہ میں کہا جاتا تھا کہ مولانا شوکت علی کی خصوصیت صرف یہ ہے کہ وہ مولانا محمد علی کے بڑے بھائی ہیں اور بس! لیکن اس کا علم بہت کم لوگوں کو ہے کہ ذاتیات میں بسااوقات چھوٹے چھوٹے حادثے بڑے بڑے سیاسی طوفان بن جاتے ہیں۔

سبھاش چندر بوس، پٹابھائی کو شکست دے کر، گاندھی جی سے الجھتے نہیں، تو گاندھی جی کبھی راج کوٹ کا برت نہ رکھتے۔ سبھاش تری پور کانگریس کے بعد صدارت سے علیحدہ نہ ہوتے۔ تو شاید ذاتی کش مکش آزاد ہند فوج پر منتج نہ ہوتی۔

کراچی کانگریس کے موقع پر چوہدری افضل حق ڈاکٹر شیخ محمد عالم کی جگہ ورکنگ کمیٹی کے ممبر بن جاتے۔ تو عین ممکن تھا، مجلسِ احرار ہی نہ بنتی۔۔ اور قومی سیاسیات کا رخ بھی مختلف ہوتا۔

پنڈت موتی لال.......... نہرو پورٹ کے مذاکرات میں مولانا شوکت علی کے مرتبہ کا خیال رکھتے اور اپنے پہلو میں، مولانا ابوالکلام آزاد کو جگہ نہ دیتے، تو واقعہ یہی ہے، کہ بڑے بھیا کو شکایت کا موقع نہ ملتا۔ اور وہ اپنے چھوٹے بھائی محمد علی کی مراجعت لندن سے پہلے، ایسا بیان نہ داغتے جس سے محمد علی کو طوعاً یا کرہاً، کانگریس سے الگ ہونا پڑتا اور پرانے رفیقوں کا ساتھ چھوٹ جاتا۔

بظاہر یہ ایک معمولی سا واقعہ تھا۔ لیکن ادنیٰ سی خفگی نے ملک کی سیاست کو الف تا ی بدل ڈالا، اور آج اسی کے برگ وبار سے ہم متمتع ہو رہے ہیں۔ تاہم مولانا شوکت علی مجاہدین صف شکن میں سے تھے۔ مولانا ابوالکلام نے ایک دفعہ ان کی اہمیت کے متعلق کہا تھا کہ۔

> "ملک میں کسی قومی تحریک کا کوئی قلعہ تیار کرنا ہو، تو انھیں اور ظفر علی خاں کو چھوڑ دو۔"

برسوں کا کام ہفتوں میں کردیں گے۔ لیکن
جب قلعہ بن جائے تو ان دونوں کو کان پکڑ کر
باہر نکال دو۔ورنہ یقین ہے کہ یہ اسے ڈھادیں گے۔"

قد کے اعتبار سے شجر سایہ دار تھے، رنگ سفید تھا، آنکھیں گول، لیکن موٹی تھیں۔ بغیر فل اسٹاپ کے بولتے تھے، لیکن ان کے الفاظ ایک دوسرے میں مدغم ہونے کے باعث سمجھ میں نہیں آتے تھے، بدن دوگنا ہی نہیں تین گنا تھا۔داڑھی کے بال کھچڑی تھے۔

لاہور میں شہید گنج کانفرنس کی صدارت کے لئے تشریف لائے بڑے ٹھاٹھ کا جلوس نکلا، رات کو کانفرنس کا اجلاس ہوتا رہا۔ نوجوانوں نے راہنماؤں کی عیاری سے دل برداشتہ ہوکر بغاوت کا جھنڈا اچھالا، پہلے یعسوب، پھر ابوسعید انور، پھر آقا بیدار بخت اور آخر میں راقم الحروف، عام لوگوں نے بھی نوجوانوں کا ساتھ دیا۔ شوکت، ظفر علی خاں کا بازو کھینچتے رہے، ہانپتے رہے اور کہتے رہے :

بازی بازی بار لیش بابا ہم بازی

اور پھر نوجوان مقرروں کو ایک دلچسپ گالی۔

دوسرے دل خلیفہ شجاع الدین کے مکان پر کچھ دوست اُن کے سلام کو حاضر ہوئے، مجھے دیکھا تو بے اختیار، بوسہ دیا۔

جیتے رہو، اب ہمارا نہیں تمہارا زمانہ ہے ہم بوڑھے ہوچکے،
میری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔ ماشاء اللہ خوب تقریر کی ہے۔

اور میں ان کے ہاتھ کو بوسہ دے کر الگ ہوگیا۔ ۱۹۴۶ء میں مجھے دہلی جانے کا اتفاق ہوا تو، ایک دوست کے ہمراہ اُن کے مزار پر گیا، جامع مسجد سے قلعہ کے رخ پر درخت کی چھاؤں میں مٹی کا ایک ڈھیر پڑا تھا۔ دوست نے کہا۔

یہ مولانا شوکت علی کی قبر ہے۔

نے   چراغ   نے   گلے
ادھر فقیروں کی ٹولیاں تھیں، اُدھر قوال

"وہ گئے جھٹک کے دامن میرے دستِ ناتواں سے "گا رہے اور دو چار گز کے فاصلے پر، جامع مسجد کی سیڑھیوں کے آس پاس، بہشتی ٹھنڈے پانی کا کٹورہ بجا رہے تھے۔ اور اردو پارک کا وسیع سناٹا دھیمے سروں میں! لاپ رہا تھا......

بولی اماں محمد علی کی

جان بیٹا خلافت میں دے دو

☆☆☆☆☆☆

ظہور عالم شہیدؔ

تخلص سے نہیں نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقصائے عالم سے ہوتے ہواتے پاکستان پہنچے، پاکستان نے لاہور میں ٹکادیا، لاہور نے ہیڈن روڈ پر بسایا، ہیڈن روڈ نے "نوائے وقت" سے چپکایا، پھر ایسے چپکے کہ اسی کے ہوگئے۔ نظامیؔ مرحوم کے کلاس فیلو ہیں۔ اکثر ہم جماعت بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہیں اور ان سب کے دل میں ان کا احترام ہے۔ لیکن اپنا مقام کبھی ترک نہیں کرتے، نہ کسی دروازے پر دستک دیتے، نہ کسی مقام پر سبک سر ہوتے اور در کعبہ اگر وانہ ہو تو اُلٹے پھر آتے ہیں۔ غالبؔ شاعر تھے، پریذیڈنٹ کے ہاں پالکی میں بیٹھ کر چلے گئے، لیکن یہ پریذیڈنٹ بھی نہیں جاتے۔ بندگی میں بھی آزادہ و خود بیں ہیں۔ چہرہ جنگ مہرہ دہنگ، ماتھا فرہنگ، آنکھیں غلافی لیکن کافرانہ، ناک مکسور لیکن شاعرانہ، قد کشیدہ، طبیعت سنجیدہ، قلب طپیدہ، بدن دو غزلہ، تخلص شہید، لیکن یہ معلوم نہیں کہ کس زمانے میں شعر کہتے رہے ہیں۔ نہ ان کی شاعری کا حال معلوم ہوا ہے، نہ بشیر احمد ارشد ہی کی شاعری کا پتہ چلتا ہے۔ کب شروع ہوئی اور کہاں ختم ہوگئی۔ بعض عوام کے لیے شعر کہتے ہیں، بعض انعام کے لیے، بعض اپنی ہی ذات کو خوش رکھنے کے لیے بعض اپنے محبوب کو ڈھب پر لانے لے لیے، شہیدؔ صاحب عوام کے شاعر نہیں، انعام کے خواہاں نہیں، اپنی ہی ذات کو خوش رکھنے کے لیے ان کے پاس اور بھی چیزیں ہیں۔ رہا محبوب کو ڈھب پر لانے کا سوال، تو اس سلسلے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ ایسا مرحلہ درپیش ہوتا، تو غازیؔ تخلص کرتے، شہید ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ نگہ ناز نے ہلاک کیا ہے، وہی نگہ ناز جس کی قیمت جگرؔ نے ایک تجلی، ایک تبسم اور ایک نگاہ بندہ نواز قرار دی ہے!

نیوز ایڈیٹر اس پائے کے ہیں کہ خبروں کا جگر چیر لاتے ہیں۔ جب سے اس وادی میں قدم رکھا ہے "نوائے وقت" کے چیف نیوز ایڈیٹر ہیں۔ اور بہت سوں کو نیوز ایڈیٹر بنادیا ہے

ان کے ظہور کی نشانیاں کئی ہیں۔ ظہور آذر ہوتے تو ہم ان کے شاگردوں کو بتانِ آزری کہہ سکتے تھے۔ لیکن مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات" قلم پر انھیں قابو ہے، زبان ان کے ہم پہلو ہے، طبیعت یکسو ہے، کسی سے الجھتے نہیں، الجھتے ہیں تو سنورتے نہیں۔ بس اپنے ہی ڈھب کے انسان ہیں۔ ایڈیٹر نہ ہوتے تو افسر ہوتے، اور افسر ہوتے تو خطرناک ہوتے۔ قدرت نے انھیں دل گداختہ دیا ہے، جس سے حسن فروغ شمع سخن بھی ہے۔ غرض ایک اچھے دوست، سچے دشمن اور ایک مخلص ساتھی ہیں۔ اور ان تینوں خوبیوں کے حدِ اوسط کا نام ظہور عالم شہید ہے۔

☆☆☆☆☆

مولانا صلاح الدین

مدیر "ادبی دُنیا"

نکلتا ہوا قد، کتابی چہرہ، دوہرا بدن، سفید رنگ، روشن آنکھیں، کنک لہجہ، ریش غائب بروت حاضر۔ یعنی مونچھیں نشتری ہیں، حیدر آباد دکن میں ہوتے تو بابائے اردو کہلاتے پنجاب میں ہیں لہٰذا۔

یک حرف کاشکے کہ بصد جا نوشتہ ایم

ان کا سراپا الف تا ی اردو ہے۔ ان کی تصانیف کتابیں نہیں مصنف ہیں۔ پچھلے پندرہ برس میں جتنے افسانہ نویس بھی ابھرے ہیں، ان کی نوک پلک سنوارنے میں ان کا ہاتھ نمایاں رہا ہے۔ دماغ و دل دونوں آئینہ ہیں۔ تحریکِ خلافت میں پولیس کی ملازمت کو نثار کیا۔ ورنہ آج کسی صوبہ میں انسپکٹر جنرل پولیس ہوتے۔ ایک مدّت تک ادبی دنیا کی کاشت کرتے رہے ہیں اور اب بھی کبھی کبھار اس کھیتی میں ہریالی لے آتے ہیں۔ حالات نے ایسا دل برداشتہ کیا ہے کہ آج کل نمک بیچتے اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود لاہور میں ادبی محفلوں کی بہت سی رونقیں ان کے دم قدم سے ہیں۔ ہر وقت ان کے چہرے پر ایک شریفانہ مسکراہٹ بکھری رہتی ہے۔

بعض لوگوں کو ان کے قد قامت اور چہرے مہرے پر چراغ حسن حسؔرت کا شبہ ہوتا ہے۔ اور بعض چراغ حسن حسؔرت کو صلاح الدین احمد سمجھ کر دھوکا کھا جاتے ہیں۔ مگر دونوں میں وہی فرق ہے جو میرامن کی باغ و بہار اور رتن ناتھ سرشار کے فسانہ آزاد میں ہے۔

میں نے ذوق کے ہاں شعر و شاعری کا لطف عنقا پایا ہے، لیکن یہ شعر صلاح الدین کے ضمن میں بارہا یاد آیا کہ ....

یوں پھریں اہل کمال آشفتہ حال افسوس ہے!
اے کمال افسوس ہے! تجھ پر کمال افسوس ہے!

☆☆☆☆☆

ضمیر جعفری

فکر موج میں یعنی شاعر، خود فوج میں یعنی میجر، اس پرانے نظریے کی کاملا تردید کہ دو ضدیں یکجا نہیں ہو سکتی ہیں، قلم اور تلوار دونوں کے رازدار، عسکری رعایت سے جنگ نژاد اور شعر کی نسبت سے "رنگ نہاد" چال میں چپ وراس کا دبدبہ، ڈھال میں یمین، وسار کا دغدغہ آنکھیں کٹار" ساغر کو ذرا ہاتھ سے لینا کہ چلا: تصویر، فی الجملہ بھری ناٹ تھری کی دو گولیاں جو بہر حال نہ ختم ہونے والی مار رکھتی ہیں۔ قد کڑی کمان، ماتھا چہرے کی ڈھال، ناک کشیدہ، لیکن نتھنے دونالی بندوق کے مانند، دہانہ چوڑا کان ہر آن کھڑے رکھتے ہیں، ذات سید، ضرب ید اللٰہی طبیعت میں، بوے اسد اللٰہی یعنی ملکی اور ملی دشمن کے سوا کسی کو ضرر پہنچانا جانتے نہیں۔ پچھلی جنگ عظیم میں چراغ حسن حسرت کے ساتھ مشرق بعید کے کئی ملکوں میں گھومتے پھرے، ملایا میں عرصے تک ٹکے رہے، اس سرزمین رنگ و بو سے گیتوں کے جواہر پارے اپنے دامان تخیلی میں چنے اور بھرے، ان یادوں نے مراجعت فرمائے وطن ہونے کے بعد جھنجوڑا تو انھیں اپنے ترنم الفاظ میں ڈھالا اور اس خوبی سے ڈھالا کہ دیکھی آنکھوں مروارید کی لڑیاں تیار ہوگئیں۔ یہ دلفریب، دلگداز، دلنواز اور دلشکن یادیں بہ عنوان "جزیروں کے گیت" مرتب ہو کر قبول خاص و عام حاصل کر چکی ہیں ان کے پڑھنے سے بشر طیکہ وجدان ساتھ ہو، تنہائی میں ایک ایسی کسک دل کے دروازے پر دستک دیتی ہے کہ حساس طبیعت کے لیے عشق ورسوائی کے بہت سے دروازے کھل جاتے ہیں۔ مصنف بہت سی کتابوں کے ہیں! "جنگ کے رنگ" ہیں، "لہو ترنگ" ہے "اڑتے خاکے ہیں" "نشاطِ تماشا" ہے، "پاک فوج کو سلام" ہے۔ غرض ہر کتاب میں ان کا بہار آفریں قلم موضوع کے پھول کھلاتا، موجِ صبا کے روپ میں اڑا چلا جاتے۔ نام ضمیر، طبیعت فقیر، مزاج بے نظیر، دل زلفِ گرہ گیر کا اسیر، قلم میں نالہ شبگیر اور نعرہ تکبیر، جس بزم کے دولھا تھے، وہ رفتہ رفتہ ویران

ہو گئی۔ ایک ایک ساتھی بچھڑ گیا یا چھڑ گیا۔ چراغ حسن حسرت المعروف سندباد جہازی ان کے جانی جگری تھے ان کی رحلت کے بعد لاہور میں ان کی آمد و رفت موقوف ہو گئی اور اگر کبھی قصد کیا بھی تو یاران سر پل کا ہدیہ اخلاص لیے بغیر لوٹ گئے۔ طبعاً مسلمان ہیں، اسلام کو روح و دل سے مانتے ہیں۔ اگر انجمن ہائے ستایش باہمی کے نٹ کھٹوں کی معیت میں ہوتے تو اس وقت پاکستان کے مزاح نگاروں میں سر فہرست ہوتے، چوں کہ ادب میں تخلیے کے عادی ہیں، اس لیے ان کے کلام و پیام پر تھڑدلے نقادوں کی نظر نہیں جاتی، مسکراتے ہوئے الفاظ میں بھرپور طنز کرنے کا جو ڈھنگ اور رنگ انھیں آتا ہے، اس سے سارے پاکستان میں شاذ ہی کوئی شخص بہرہ مند ہو۔ زبان، بیان اور جان تینوں کے اعتبار سے وہ ایک ذیشان انسان ہیں۔

☆☆☆☆☆

طاؤس خان

لاہور کے مزدوروں کا راہنما، حروفِ ابجد سے بھی ناآشنا، لیکن ملکی و غیر ملکی سیاسیات کے اُتار چڑھاؤ کی ایک ایک ادا کا نبض شناس، آپ اس سے گھنٹوں گفتگو کرتے رہیے آپ اس کے لباس سے تو لازماً اس شبہ کا ضرور شکار ہوں گے کہ پڑھا لکھا نہیں، لیکن اس کی بول چال اور لب و لہجہ سے مطلقاً معلوم نہ کر پائیں گے کہ چٹا ان پڑھ ہے۔ قدرت نے اس کو بلا کا حافظہ دیا ہے۔ صبح بستر سے اٹھتے ہی اردو کے تمام اخبارات سنتا، پھر اداریوں سے لیکر خبروں کے متن تک کی عبارتیں اس کے حافظے کی لوح پر نقش ہو جاتی۔ ایک جتیا جاگتا انسان، تین زبانوں کا ایک ایسا مقرر جس کے ہاں نہ فالتو جذبات ہیں، نہ فالتو الفاظ۔ اردو اس کی پنجابی ہوتی ہے اور اس پنجابی نما اردو میں بڑے رکھ رکھاؤ سے تقریر کرتا ہے۔ خود پنجابی اس کی سکونتی زبان ہے، اس میں بڑے ٹھاٹھ سے بولتا ہے۔

پشتو اس کی مادری زبان ہے اور اس میں اس شستگی اور روانی سے تقریر کرتا ہے کہ محاذ جنگ کا نقشہ بندھا رہتا ہے۔

نکلتا ہو قد، دوہرا بدن، ماتھے پر جھریاں، آنکھوں میں چھریاں، رنگ کھلتا ہوا گندمی، چہرے پر داڑھی اور مونچھیں لیکن دونوں کھچڑی، ناک کشیدہ، مختلف تحریکوں کا چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا، زبان قینچی، طبیعت میں استغنا، صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں میاں معراج دین کا مقابلہ کرنا چاہا تو لوگوں نے اس کے افلاس کا مذاق اڑایا۔ ایک بھوکا ننگا اور صوبائی اسمبلی میں پہنچنے کی خواہش؟ کہاں کلچڑی گنجی اور کہاں بلبل بستاں کی نوانجی؟ سبھی جتن کیے گئے کسی نے ڈرایا، کسی نے دھمکایا، لیکن یہ تمام دباؤ اس کے لغت سے خارج تھے۔ انگریزوں کے زمانے میں مدتوں قید رہ چکا تھا۔ ہر دباؤ کو قہقہوں میں اُڑایا۔ (پھر جب اس کے افلاس کا مذاق اڑایا۔ ایک

بھوکا ننگا اور صوبائی اسمبلی میں پہنچنے کی خواہش ؟ کہاں کلچرڑی گنجی اور کہاں بلبل بستاں ؟ سبھی جتن کئے گئے کسی نے ڈرا ما کسی نے دھمکایا لیکن یہ تمام دباؤ اس لے لعنت سے خارج تھے۔ انگریزوں کے زمانے میں مدتوں قید رہ چکا تھا۔ ہر دباؤ کو قہقہوں میں اڑا دیا۔) پھر جب اس کے مخلصین نے دستبرداری پر آمادہ کیا اور اس کو بعض دوستوں نے اپنے طور پر ایک معقول رقم پیش کی تو اس نے جواب دیا آپ لوگ میرے دوست ضرور ہیں لیکن میرے افلاس کی غیرت پر طمانچہ نہ ماریں۔ میں نے نشست سے دستبرداری قبول کی ہے، اپنی حمیّت سے دستبردار نہیں ہوا!! ایک بہت بڑے پولیس آفیسر نے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ میرے دل میں اس ملنگ کی انتہائی قدر پیدا ہوئی ہے کہ اس ویرانہ آباد میں اس قسم کے انسان بھی موجود ہیں جن کے گھر میں دوسرے وقت کی روٹی نہیں، تن پر کپڑا نہیں، روپے کا ڈھیر سامنے لگا ہے اور وہ کہتا ہے یہ رقم میرے افلاس کو خرید نہیں سکتی۔ طاؤس خان زندہ باد! اور اس کا نام ہے طاؤس خان۔

☆☆☆☆☆

سراج الدین ظفؔر

قامت بحرِ طویل میں۔ جثہ قصیدے کی طرح بوجھل۔ آنکھیں عمر خیامؔ کی طرح۔ پیشانی میں تشبیب کا بانکپن۔ ناک ستواں یعنی جوش کا خراباتی مصرع، لہجے میں تمکنت، چلتے ہیں تو نظم معریٰ، دوستوں کے دوست بلکہ دشمنوں کے بھی دوست۔

ایڈووکیٹ تھے لیکن ہاتھ اٹھالیا۔ عزیزوں نے سبب پوچھا، کہنے لگے ایک تو جھوٹ نہیں بولا جاتا دوسرے سائل کے کپڑے اتارنا میرے بس کا روگ نہیں۔ ایک زمانے میں ملٹری کے کیپٹن رہ چکے ہیں۔ آج کل فیروز سنز، کراچی شاخ کے جنرل منیجر ہیں۔

بڑے دنوں کی بات ہے، یعنی آج سے بائیس تیس برس پہلے کی بات۔ اس زمانے میں ایف سی کالج نیلہ گنبد سے آگے مال روڈ پر واقع تھا آج کل سلائیٹ بلڈنگ اور اس کے عقب کی تجارتی عمارتیں ہیں۔ سراج الدین ظفؔر یہیں پڑھتے تھے۔ ادھر اتفاقاتِ حسنہ کی بدولت کچھ نامور شاعروں نے کالج کی عمارت کو سجدہ گاہ بنا رکھا تھا۔ اس راز کا انکشاف تب ہوا جب کالج ہی کے ایک نوجوان نے ''یونگ ہال'' پر معرکہ کی ایک نظم لکھی۔ یہ نظم ''ہمایوں'' میں چھپی۔ اور شہر کے منچلوں میں عام ہوگئی۔ اس وقت کے پرنسپل نے ترجمہ کروایا۔ طلبہ نے احتجاج کیا۔ ہمایوں سے پانچ سو کی ضمانت طلب کرلی گئی۔ یہ تھا ظفر صاحب سے پہلا تعارف۔ دوسرا تعارف سیاست مرحوم میں ہوا۔ ''سیاست'' اور ''پرتاب'' میں آویزش کا الاؤ ہمیشہ گرم رہتا۔ ظفر صاحب نے ''گوری دیوی'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی، اس پر تمام ہندو پریس چلا اٹھا۔ حکومت نے ضمانت طلب کرلی۔ اور نظم ضبط ہوگئی۔

شاعری کو انھوں نے اختیار نہیں کیا، بلکہ شاعری نے انھیں اختیار کیا ہے، ادبی و شعری مذاق انھیں ورثہ میں ملا ہے۔

ظفؔر صاحب کا حقیقی میدان غزل تھا۔ آغاز میں مرزا فہیم بیگ چغتائی سے مشورہ لیا پھر

ان سے کھٹ پٹ ہو گئی اور سیماب سے تلمذ اختیار کیا، لیکن ان کی طبیعت کے جوہر اتنے چمکیلے تھے کہ استادی شاگردی سے بے نیاز ہی رہے۔ ان کا استاد ان کی طبیعت ہے۔ وہ طبعاً حُسن پرست ہیں اور حسن ان کی شاعری میں چھلکتا ہے۔

انھیں خوبصورت چہروں سے لے کر خوبصورت غاروں تک سے اُنس ہے۔ وہ اس معاملے میں اتنے بے قابو ہیں کہ نظر کا ایک وار بھی سہہ نہیں سکتے۔ ایک سرمئی نگاہ ان سے بھرپور غزل کہلوا لیتی ہے۔

سراج الدین ظؔفر ان کا پورا نام ہے۔ اس وقت ان کی عمر ۴۸ برس ہے۔ والد ریلوے میں انجینئر تھے والدہ ایک مشہور فسانہ نگار خاتون ہیں۔

☆☆☆☆☆

سردار محمد ظفراللہ

وطن اخبار کے نامور مالک و مدیر مولوی انشاء اللہ خاں خلد آشیانی کے فرزند مرحوم مسلم لیگ کے شیدائی، قائدِ اعظم کے فدائی، نظریۂ پاکستان کے معاملے میں ابو مسلم خراسانی ملے ان کے بس میں ہو تو ان سب لوگوں کو توپ دم کرادیں، جو مسلم لیگ کی تحریک میں شامل نہیں رہے، لاہور میں دولتانہ کے دست و بازو، ایک آدھ دفعہ ان سے کٹ گئے تھے۔ لیکن بعجلت اسی دستار کا طرہ ہو گئے۔ تحریکِ پاکستان کے سرگرم اور مخلص کارکن، جو دل میں وہی منہ پر، تاریخ سے زیادہ جذبات پر جیتے اور اپنے خیالات کی سیر گاہ میں صبح و شام چہل قدمی کرتے ہیں۔ اپنے سوا کسی کو دیانتدار نہیں سمجھتے۔ پریکٹس سے زیادہ پالیٹکس لڑاتے ہیں ذہن مسلم لیگ کا ہے، لیکن زبان کمیونسٹوں کی، کہ جس کو اپنے ڈھب پر نہ پاؤ، اس کو حکومت کا زر خرید یا امریکی ایجنٹ کہو، کافی ہاؤس ان کا تکیہ ہے۔ وہاں بیٹھ کر چہلیں بھی کرتے، چونچیں بھی لڑاتے اور فسانے بھی گھڑتے ہیں۔ خیالات کی شدت کے باوجود ان میں خاندانی انسانوں کی سی خوبو ہے۔

ضخامت اور قد کے لحاظ سے دولتانہ ہیں، دل و دماغ کے لحاظ سے خاں عبدالقیوم، زبان و بیان کے معاملے میں ان کی اپنی ایک شخصیت ہے، جو انھیں ہمعصروں میں متمیز کرتی ہے۔ چال ڈھال میں ذرہ سی رعونت نہیں۔ رنگ سفید نہ کالا، چہرہ پر پھلجھڑیاں، آنکھیں اس عمر میں بھی پٹاخہ دانت انار، ناک مہتابی۔ کسی زمانے میں پنجاب اسمبلی کے رکن تھے۔ دوبارہ الیکشن لڑا تو دوستوں کی بدولت ہار گئے، آدمی حسابی نہ کتابی اس انسان کی طرح جو تمام دنیا کو اپنے خیالات کے سانچے میں ڈھال لینا چاہتا ہو اور جب دنیا نچے اس کے ڈھب کی نہ ہو تو احتجاج کرتے کرتے خود ایک احتجاج ہو جائے۔

☆☆☆☆☆

ظفر علی خاں

مولانا ظفر علی خاں پاکستان کے معمر ترین راہنما ہیں۔ آپ نے الحاج خواجہ ناظم الدین اور چودہری محمد علی کے سن پیدائش سے دو سال پیشتر، شہید سہروردی اور ظفر اللہ خاں کے سن پیدائش سے ایک سال پیشتر، ملک غلام محمد اور خان لیاقت خان کے سن پیدائش سے تین سال پیشتر اور علامہ مشرقی و مولانا ابوالکلام آزاد کے سن پیدائش سے چار سال بعد علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے کیا تھا۔ جن دنوں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی حیدر آبد دکن میں پیدا ہوئے تھے ان دنوں مولانا ظفر علی خاں میر عثمان علی خاں کے نائب اتالیق تھے اور جب میاں ممتاز دولتانہ پیدا ہوئے یعنی ۱۹۱۶ء میں، تب مولانا سر مائیکل اوڈوائر کے قہرمانی حکم کی بدولت اپنے گاؤں کرم آباد میں نظر بندی کے دن گزار رہے تھے۔

اس وقت جو لوگ پاکستان کی مرکزی حکومت میں شریک ہیں یا جن کے ہاتھ میں صوبوں کی وزارتی باگ ڈور ہے۔ ان میں سے نصف مولانا کی سیاسی زندگی کے نصف اول کی پیداوار ہیں۔

اب تو مولانا لے دے کے زندگی کا ایک سایہ ہیں۔ یا ماضی کی ایک سبکدوش عظمت، لیکن جب مولانا جوان تھے تو شمالی ہندوستان میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ مغربی پاکستان کی ذہنی ہنگامہ آرائیوں اور سیاسی تحریکوں میں سے ظفر علی خاں کو خارج کر دیں تو ان کی تاریخ عشر عشیر بھی نہیں رہتی۔

مولانا فی الواقع جامع الصفات تھے۔ ان میں تلون نہ ہوتا، یا یہ کہہ لیجیے کہ شاعر نہ ہوتے تو ابوالکلام کے ہم مرتبہ ہوتے، یا جناح کے ہم مرتبہ۔ لیکن ان کی سیمابی طبیعت نے انھیں کہیں بھی ٹکنے نہ دیا۔ جہاں پہنچنا چاہتے تھے یا انھیں پہنچنا چاہیے تھا، وہاں پہنچ نہ سکے اور جن ہمراہیوں پر بھروسا رکھتے تھے، وہ کسی نہ کسی مرحلہ میں الگ تھلگ ہو جاتے تھے۔

تمام زندگی چومکھی لڑتے رہے ادھر ہندوؤں سے نبرد آزما ہیں، تو ادھر انگریزوں سے

دو... تھ لڑ رہے ہیں۔ ابھی رجعتی مسلمانوں سے زور آزمائی ہے اور ابھی اپنوں ہی سے دست و گریباں ہیں۔ اسی خصوصیت کے باعث ایک دفعہ مولانا ابوالکلام نے کہا تھا، اگر ملک میں کسی تحریک کے لیے ہنگامہ پیدا کرنا ہے تو ظفر علی خاں اور شوکت علی کو چھوڑ دو۔ وہ برسوں کا کام ہفتوں میں ختم کر دیں گے۔ لیکن جب وہ قلعہ تیار کرلیں تو زبردستی اس سے نکال دو۔ مبادا وہ خود ہی آگ لگا دیں اور آپ منہ تکتے رہ جائیں۔

ظفر علی خاں نے بیسیوں تحریکیں پیدا کیں، بیسیوں ایڈیٹر بنائے اور بیسیوں قومی کارکن اٹھائے، لیکن اس کے باوجود تاریخ کے صفحوں نے ان کی کوئی قدر نہیں کی بلکہ ان کے نام پر ایک بے نام سا غبار پڑا ہوا ہے۔ ایک دوہرے بدن کا چھریرا نوجوان جس نے علی گڑھ سے بی اے کی سند حاصل کی، وقار الملک کی مصاحبت میں رہا۔ حیدر آباد کی ریاستی آب و ہوا کا لطف اٹھایا اور ایک ایسے گھرانے میں پلا، جو بہر حال کوئی انقلابی گھرانا نہ تھا، لیکن اس نے ہندوستان کے ایک ایسے صوبے کی سیاسی زندگی کو جھنجھوڑا جس کی وفاداری پر برطانیہ کو ناز تھا۔ اور انگریز سمجھتے تھے کہ ہندوستان ان کی سلطنت کے لیے سونے کی چڑیا ہے، تو پنجاب اس کی عسکری روح ہے۔

ہمارے ماضی کی خلاف سامراج تاریخ کا نام محض ظفر علی خاں ہے۔ اور پھر جو کچھ بھی ہے، وہ اپنی تمام وسعت و قوت کے باوجود بعد کی چیز ہے۔ ظفر علی خاں شمالی ہندوستان میں اردو صحافت کے برگزیدہ راہنما ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں کئی خوبیوں کے مالک تھے۔ نظم میں منفرد، نثر میں صاحب طرز اور خطابت میں شعلہ بیان۔ ان کی نثر میں علم ہوتا تو ابوالکلام ہوتے۔ شاعری میں فکر ہوتا تو اقبال ہوتے۔ خطابت میں تنوع ہوتا تو عطاء اللہ شاہ کو پیچھے چھوڑ جاتے۔ لیکن وہ ان میں سے کسی کے بھی تابع نہ تھے۔ ان کا اپنا رنگ اور اپنا پیرایہ تھا۔ اقلیم انشا کے شہنشاہ، میدان شعر کے شہسوار، عرصہ خطابت کے سالار۔ جو قوافی انھوں نے پیدا کیے وہ رنگ اردو شاعری میں یا تو محمد رفیع سودا کے ہاں نظر آتا ہے یا میر انشاء کے خریطۂ شعر میں اس کی نظیریں موجود ہیں۔ اور یا پھر اکبر الہ آبادی اسی اشہب کے سوار تھے۔ ظفر علی خاں غالباً پہلے شاعر ہیں جنھوں نے طنز کو عملی سیاسیات میں تیر و نشتر کی حیثیت سے استعمال کیا۔

انھوں نے نہ صرف تحریکوں ہی پر قہقہے لگائے، بلکہ افراد کو بھی ہدفِ تضحیک بنایا۔ جو بعض نقادوں کے نزدیک ممکن ہے قابل اعتراض ہو۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ظفر علی خاں نے اس ہتھیار سے بڑے بڑے معرکے سر کیے ہیں۔ حسن نظامی کا کہنا ہے کہ قیامت کے دن ظفر علی خاں کی بخشش کا توشہ ان کا نعتیہ کلام ہے۔ جس میں عشقِ رسالت جھلکتا نہیں دھڑکتا بھی ہے۔ چراغ حسن حسرت نے سچ کہا تھا۔ جو لوگ آج ان پر اعتراض کر کے خوش ہوتے ہیں وہ کل انھیں یاد کر کے رویا کریں گے۔ کیوں کہ ظفر علی خاں روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ ان کا ماضی ہمارے حال سے بہتر ہے:

شاید کہ تم میر سے صحبت نہیں رہی

☆☆☆☆☆

ظہیر کاشمیری

قد و قامت کے اعتبار سے نظم آزاد اور چال ڈھال میں نظم معریٰ، لیکن لب و لہجہ میں قصیدے کی تمکنت اور چہرے مہرے پر غزل کی ہلکی ہلکی آنچ۔ اس کا سراپا اس کے اسلوب کی طرح منفرد، دماغاً اشتمالی، قلباً مومن، بہ الفاظ دیگر۔

قلبِ او مومن دماغش کافر است

الف تا ی شاعر۔ دشمن جس سے زچ ہوتے اور دوست جس پر وار کرتے ہیں لیکن کی پیشانی کے اتار چڑھاؤ یکجا کرلیں تو حاصل کلام مسکراہٹیں ہوتا ہے۔

وہ قدیم الایام کے یونانی تبکدوں کا ایک مجسمہ ہے، جسے ع ب ے عزیٰ شکن شہسواروں نے ایتھنز سے اڑ نچھو کیا، کچھ دیر روما کے کلیسائی رنگ و روغن سے سنوارا۔ پھر اسے بغداد و غرناطہ کے علم و ادب سے استوار کیا۔ یہاں تک کہ زمانے نے کروٹ لی اور وہ انگلستان کی راہ سے ماسکو چلا گیا۔ اس احمرین گردش نے اسے ہندوستان پہنچادیا۔ امرتسر سے اٹھا لاہور نے اس کو اپنالیا۔ لوگ اُسے تماشا سمجھتے ہیں لیکن وہ ہر لحظہ بدلتی ہوئی کائنات کا تماشائی ہے۔

اس کے شعر قہقہے ہیں یا طمانچہ۔ مصلحت اور مصالحت اس کے ہاں سیاسی اور ادبی کفر کے دو زاویے ہیں۔ وہ شاعر بھی ہے اور انقلابی بھی لیکن اس کے نقاد شاعر ہیں نہ انقلابی بلکہ حسد کا بول اور تہمت کا غبار۔

ان سے ملیے! یہ ظہیر کاشمیری ہیں۔

☆☆☆☆☆

عابد علی عابد

طویل البحر انسان، لیکن عمر کی تفریط اور شراب کی افراط نے بہت سے رکن ساقط کر دیے ہیں۔ چہرے پر مصنوعی سنجیدگی، آواز میں پہلے خروش تھا اور جوش بھی، اب شمع کا آخری سنبھالا ہے۔ جوش رحلت کر چکا خروش جانکنی کے عالم میں ہے۔ تمام زندگی پڑھنے پڑھانے میں گزار دی، لیکن علم و ادب میں جتنے کم بنتے زیادہ ہیں۔ جب تک تاجور کا فیض رہا قلم نے بانکپن دکھایا ان سے کٹے تو گھر کے رہے نہ گھاٹ کے، شراب ان کی بھی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ سید کہلاتے ہیں لیکن پینے پلانے کو اپنی شرع میں حلال سمجھتے ہیں۔ خوب آدمی ہیں۔ ماضی پر ندامت ہے نہ حال پر، رہا مستقبل، تو اس کی پروا نہیں، ہر چہ باد اباد کا کھلونا ہیں۔ دیال سنگھ کالج میں فارسی کے پروفیسر رہے، تقسیم کے بعد جوڑ توڑ کر کے پرنسپل ہو گئے۔ لیکن جلد ہی شاہد و شراب کی لہروں میں ناؤ ڈوب گئی۔ کوچۂ تعلیم سے کوچۂ رسوائی کی طرف نکلے، [illegible] ان [illegible] یل نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کسی نے مجلس ادب سے چپکا دیا کسی نے مجلس اقبال سے [illegible] ملا [illegible] کوئی برخوردار سلمہ اللہ تعالیٰ تعلقات عامہ کے شعبۂ مطبوعات میں لے گیا۔ ریڈیو نے دستگیری کی، غرض عابد علی عابد تبرک کی طرح تقسیم ہونے لگے، تخیل تو ان کی [illegible] میں ہے نہیں، الفاظ کا زور ہے یا پھر لہجہ کا شور، اس سے کلام سجا بنا لیتے ہیں۔ فن کے لیے کم لکھا ہے پیٹ کے لیے زیادہ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم و نثر میں کوئی چیز بھی پائیدار نہیں۔ نثر تو ان کے بس کا روگ نہیں، تاجور کی ہم سینی سے فقرہ تراشی آگئی، لیکن ربط پیدا کرنا نہ آیا۔ تکرار عام ہے۔ انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں، جن میں سرقہ زیادہ ہے۔ پروفیسر نہ ہوتے تو پولیس افسر ہوتے اور طلبہ پر لاٹھی چارج کرتے، شاعر نہ ہوتے تو ذاکر ہوتے۔ بزرگوں کے حسب نسب میں کیڑے ڈالنا ان کا شیوۂ قدیم ہے۔ حکام کے چپ و راست رہتے اور خوردوں پر تبرا تولتے ہیں اور ان سے یوں ملتے ہیں جیسے بلو [illegible] میں

سر کہ ہو۔ اب چال ہے نہ ڈھال، رنگ گورا، لہجہ کورا، کوئی ادبی ادارہ یا خود صدر مملکت انھیں پنشن دے کر قرطاس و قلم کو چھٹی دلوادیں، تو نہ صرف ان کی اس عمر پر احسان ہوگا بلکہ شعر وانشاء اور نقد و نظر کو بھی چین آئے گا کہ اس کی آبرو محفوظ ہو گئی ہے اور اسی کا نام ہے عابد علی عابد۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر شیخ عالم

ڈاکٹر شیخ محمد عالم جاگیر دار گھرانے میں پیدا ہوتے تو افتخار الدین ہوتے اور افتخار الدین سرگودھا کے قانون گو خاندان میں نشو و نما پاتے تو ڈاکٹر شیخ محمد عالم ہوتے۔

عالم اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور افتخار الدین آج کل انگلستان میں ملکۂ معظمہ کا جشن تاجپوشی دیکھنے تشریف لے گئے ہیں۔ ایک آنجہانی ہیں، ایک ایں جہانی ہیں، لیکن دونوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں مثلاً دونوں دوستوں کے معاملے میں غیر مخلص، سب کے دوست لیکن حقیقتاً کسی کے بھی دوست نہیں۔ دونوں کے قول و فعل میں تضاد، لم تقولون مالا تفعلون کی دلچسپ تفسیر۔ دونوں نے سیاسیات کی وادی میں کھاٹ کھاٹ کا پانی پیا لیکن اپنی گرہ کے پکے، دونوں عوام کی قیادت کا دم بھرتے، لیکن دونوں عوام کو کالانعام سمجھتے۔ دونوں الفاظ کے شعبدہ باز۔ عالم نے اخبار نکالا تو ڈبو دیا۔ افتخار الدین نے پروان چڑھایا دونوں سیاسی کارکنوں کو استعمال کرنے میں مرد ِ دبنگ، البتہ قابلیت کے اعتبار سے دونوں میں زمین و آسمان کا فرق!

عالم ایک بڑا کامیاب بیرسٹر ایک تیز مقرر اور ایک زمانہ ساز سیاست دان تھے۔ افتخار ایک ناکامیاب بیرسٹر، ایک روکھا پھیکا مقرر اور ایک موقعہ پرست سیاست دان ہے۔ قامت میں یکساں، جثے میں افتخار سے نصف، چہرہ پر عمر رفتہ کی صدائے بازگشت کا اضمحلال، آنکھوں میں ان کہی روداوں کا غبار، قائداعظم نے ملک خضر حیات کو نکال باہر کیا تو مختلف ایم۔ ایل۔ اے کو لیگ اسمبلی پارٹی میں شمول کے لیے طلب فرمایا۔ ان میں ڈاکٹر عالم بھی تھے۔

"قائدِ اعظم: عالم! تم لیگ اسمبلی پارٹی میں شامل ہو جاؤ۔

عالم:۔ قائد اعظم! یہ فیصلہ تو سوچ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔

قائدِ اعظم: عالم! تمھیں بھی پارٹی بدلنے کے لیے سوچنے کی ضرورت ہے؟

اور عالم اپنا سامنہ لے کر واپس آ گئے۔ عالم کانگرس کے مخلص ہوتے تو عجب نہ تھا کہ

صدارت کی کرسی تک پہنچ جاتے۔ لیگ میں رہتے اور عمر وفا کرتی تو ممکن تھا کہ آج پنجاب کے وزیرِ اعظم ہوتے۔ لیکن وہ ہمیشہ نہ جھکتے رہے۔ جو تشیوں کو ہاتھ دکھاتے دکھاتے عمر بیت گئی۔ لیکن وزیر نہ بن سکے۔ اور بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ قرار دادِ پاکستان کے چند موجدین میں ڈاکٹر عالم بھی تھے۔

☆☆☆☆☆

جمیل الدین عالی

آجکل بدن دوہرا ہو گیا یعنی مصحفی کی طویل البحر ہجوؤں کا مصرع آوارہ ہیں۔ ایک زمانے میں جب دہلی مرحوم کا بول بالا تھا۔ یعنی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر کٹورہ بجتا تھا اور چاوڑی میں اچھن میاں کی بیٹی کجن بائی ستارہ بجاتی تھی۔ تو یہ میر تقی میر کے ہلکے پھلکے مصرعوں کی طرح چاندنی چوک میں اڑے پھرتے تھے۔ آہو چوکڑی بھول جاتے، شاعر حواس کھو بیٹھتے۔ پاکستان میں ان کا ستارہ قدرت اللہ شہاب کے غیبی فیضان سے اس طرح چمکا کہ دیکھتی آنکھوں زہرہ و مریخ سے چشمک کرنے لگا۔ واجد علی شاہ کے درباریوں کی تصویر اُبھر آئی زبان کترنی کی طرح چلتی ہے۔ اردو اس طرح بولتے ہیں جس طرح بے نکاحی رکھی ہو، انگریزی میں کرنل جانسن کی ڈائری کا ہو بہو عکس ہیں۔ زمین پر قدم رکھتے ہیں تو مخرام کا نقشہ کھنچ جاتا ہے، ماتھے پہ داغ کے روایتی محبوب کی تیوریوں کا جھرمٹ، ناک کٹ جائے تو مضائقہ نہیں، جرم ضرور ہے، لگی رہے تو امجد حیدر آبادی کا چوتھا مصرع۔ خود بیخود دہلوی کے کلام کا مرقع، خون میں سائل دہلوی کے دیوان کی ہلچل۔

قدرت اللہ شہاب رخصت ہو گئے تو ان کا ستارہ بھی گردش میں آ گیا۔ بہت چاہا ان کے جانشینوں کے حاشیے میں چلے جائیں لیکن انھوں نے پٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیا، آج کل بابائے اردو کی بیوہ یعنی انجمن ترقی اردو کے لے پالک یعنی معتمد ہیں۔ ہمارے محترم ممتاز حسن (نیشنل بنک والے) بھی اسی کتاب کو مستند گردانتے ہیں، جن کی تصدیق یہ کرتے ہوں اور اسی زبان کو بامحاورہ سمجھتے ہیں، جس پر ان کے قلم سے دستخط ہوں۔ بروایت ان کا خیال ہے کہ شاہد احمد دہلوی بھی ان کے آگے ہیچ ہیں۔ وہ ڈپٹی نزیر احمد کے کہن سال محاوروں پر جی رہے ہیں اور یہ آخری دور کی دہلی کے گوہر شب چراغ ہیں۔ زبان ان کی، یہ زبان کے۔ دونوں میں توام اولاد کا رشتہ ہے۔ آواز اچھی پائی ہے۔ چند دوہے لکھ کر صفِ اوّل کے شعراء کی فہرست میں آ گئے ہیں۔ ان کے بس میں ہو تو ان سب لوگوں کی زبان کھینچ لیں، جو اہل [illegible] انکو

ٹیکس کے محکمہ سے نیشنل پریس ٹرسٹ میں آئے ہیں۔ ان کے نزدیک نیشنل پریس ٹرسٹ امپرومنٹ ٹرسٹ ہے اور یہ وہاں ایگزیکٹو انجینئر! انکم ٹیکس کے محکمہ سے منتقل ہونا تو خیر کوئی عیب نہیں، اس محکمہ میں شعر و انشاء کے اعتبار سے بہت سے لوگ عبقری ہیں۔ مثلاً تجمل حسین الطاف گوہر کے بھائی، عبدالعزیز خالد جن کا قلم چرخِ ہفتمیں میں سے پھول توڑ لاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ جمیل الدین عالی عبدالعزیز خالد کی شاعری کے صحیح ہجے ہی نہیں کر سکتے، کیوں کہ خالد پیغمبروں کی زبان میں شاعری کرتے ہیں، اور عالی مٹیا محل کی سمن والیوں کے لہجہ میں! عالی کا سرمایہ، فکر چوں کہ چناں چہ سے شروع ہو کر آداب عرض کرتا ہوں کی سرحد پر ختم ہو جاتا ہے۔ خالد کا راہوار تخیل عرش پر شہپر جبریل لے کر اڑتا ہے۔

چہرے مہرے میں چاندنی چوک کے اُن جوہری بچوں کی دلکشی ہے، جو غالب کے ہاں جو اکھیلا کرتے اور نال نکالتے تھے، آنکھیں نیم باز ضرور ہیں۔ لیکن شراب کی مستی نار بھیا کہہ کے لے گئی ہے۔ ناک اور ہاڑ دونوں مغلئی ہیں۔ اس عمر میں کسی لٹے ہوئے عیش کی تصویر معلوم ہوتے ہیں۔

نثر بھی لکھتے ہیں نظم بھی، نثر میں ہاپوڑ کے پاپڑوں کی خستگی ہوتی ہے۔ نظم میں دلی کی نہاری کا مزہ، بذاتہ کھر اکھیل فرخ آبادی ہیں۔ خوبی ان کی یہ ہے کہ ہر شخص انھیں اپنا ہی سمجھتا ہے اور وہ بہ قول غالب:

عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

☆☆☆☆☆

عالی رضوی

ماں باپ کا رکھا ہوا نام کیا ہے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اکثر اہلِ قلم کے نام پسِ پردہ چھپے گئے، اور تخلص اُبھر کے روشن ہو گئے بلکہ نام بن گئے ہیں اسی طرح بیشتر ایڈیٹروں کے والدینی نام غفرلہ ہو گئے اور پڑھ لکھ کے جو نام خود وضع کیے، معروف ہوتے گئے، حتیٰ کہ جزو لانیفک ہو گئے۔ عالی اسم بامسمیٰ ہیں۔ خود عالی، طبیعت خیالی، مزاج جمالی، قلم جلالی تحریر بلالی، "کوہستان" کے ایڈیٹر کہ مالی، ہر صبح کا اخبار خیالات کی ڈالی، مذہباً غالی" قلب او مومن دماغش کافراست "صورت بھولی بھالی، اور......'

بھولی بھالی صورت والے ہوتے ہیں جلاد بھی۔

ہنس مکھ بلکہ نین سکھ، شکل مدیرانہ، عقل مدبرانہ، سیرت دلبرانہ، فطرت عاشقانہ، روش قاہرانہ، ترقی پسند ہو کے اُٹھے تھے لیکن اسلام پسند ہو کے چمکے، اداریہ نویسی پر انھیں قدرت حاصل ہے۔ اخبار اپنا ہوتا، فضا ۔زگار ہوتی، رکھ رکھاؤ سے پرہیز کرتے، نہ کسی سے دبتے نہ کسی سے ڈرتے تو ان کے قلم کی جولانی، طغیانی ہوتی۔ روانی اب بھی ہے۔ لیکن وہ اس دور کے ایڈیٹر ہیں جس دور میں ذہانت خود سوال بن جاتی ہے۔ بڑے پڑھے لکھے نوجوان ہیں۔ چشمِ بددور، تحریر و تقریر دونوں میں ملکہ رکھتے ہیں۔ منجھی ہوئی تقریر کرتے اور سلجھی ہوئی تحریر لکھتے ہیں۔ قوت فیصلہ ذرا کمزور ہے، لیکن قلم بزاشہ زور ہے۔ دل میں کھوٹ نہیں، کسی پر چوٹ نہیں۔ اپنی بات کہتے اور اپنی ہی لے میں کہتے ہیں۔ کمال ان میں یہ ہے کہ مرنجاں مرنج ہیں۔ نقص ان میں یہ ہے کہ جب "کوہستان" کا قبیلہ اُٹھا تھا، تو انھوں نے بعض ایسے دانش خوردہ لوگوں کو تصویریں اور تقریریں چھاپ کر اُجالنا شروع کیا، کہ اب وہ قوم کے حلق میں کانٹے کی طرح اٹکے ہوئے ہیں، اور اُن کا اُگلنا مشکل ہو رہا ہے۔

ہیں باغ و بہار بلکہ یارِ غار اور یار بھی ایسے کہ یارِ شاطر نہ کہ بارِ خاطر، مسکرانا ان کی عادت ہے، بلکہ فطرت، اور یہ فطرت اتنی پختہ ہے کہ مسکراہٹ ان کا عرف عام ہو گئی ہے۔

قہقہے بھی لگاتے ہیں اور نوحہ بھی کرتے ہیں۔ لیکن ان کے نوحوں میں بھی حسن ہوتا ہے۔ سیدؔ بھی ہیں، جیدؔ بھی اور گردو پیش کے حالات میں مقید بھی۔ خزاں کی طرح صَرصَر کا جور سہہ جاتے اور بہار کی طرح یمین و یسار کو کھلاتے چلے جاتے ہیں۔ ملک محمد رفیق مالک "ادبستان" کا بیان ہے کہ اصل نام ان کا علی رضوی ہے۔ الف نے مداخلت کی اور ع کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس طرح چپکا کہ عالی ہو گیا، واللہ اعلم بالصواب۔ بہر حال عالیؔ رضوی اپنے نام کی تصویر ہیں اور اس تصویر کا نام عالی رضوی ہے۔

☆☆☆☆☆

مولانا عبدالحامد بدایونی

یادش بخیر مولانا عبدالحامد بدایونی، یادگار زمانہ بزرگوں میں سے ہیں، عمر کتنی ہے اللہ بہتر جانتا ہے، لیکن اس سن و سال میں بھی معرکہ آرا واعظ ہیں، منبر پر تقریر کرتے ہوئے دائرے بنتے اور نشست پر گفتگو فرماتے ہوئے غبارے اُڑاتے ہیں۔ جہاں تک علم دین کا تعلق ہے اس سے اتنی ہی شناسائی ہے جتنی آشنائی اقبالؔ سے سردار جعفری کو ہے۔ میلاد خواں مولوی ہیں، امام مسجد، وہابی ہو تو اس کے اقتدا میں نماز نہیں پڑھتے، افسر دہریہ ہو تو اس سے معانقہ کرنے کے بعد یوں محسوس کرتے ہیں جیسے طورِ سینا سے ہو آئے ہیں۔ واعظ اچھے ہیں الفاظ کی کتر بیونت میں خوب ہیں، مطالب سے کچھ زیادہ سروکار نہیں رکھتے، کراچی کی شرعی جاگیروں میں سے ایک زرخیز جاگیر کے مالک ہیں۔

بوٹا قد لیکن کمر کی شاخیں صرصرِ عمر کے تھپیڑے کھا کھا کے جھک گئی ہیں، چہرہ پان کا پتا ہے، آنکھیں اس عمر میں بھی گلاب کے کٹورے، ناک چنبیلی کا پھول، ہونٹ شاہی ٹکڑے، دانت انار کے دانے، لیکن ان میں کھڑکیاں پڑ گئی ہیں، پانوں کے چسکے نے سفیدی پر سیاہی جمادی ہے۔ سر پہ سبز عمامہ رکھتے، چوغہ اور کرتا کھجور کے درخت کی طرح لمبا پہنتے ہیں۔ دماغ میں کوئی خاص خوبی نہیں، زبان کترنی کی طرح چلتی ہے۔ دل کا حال اللہ کو معلوم ہے فی الجملہ ایک شریف انسان ہیں۔ ان سے مل کر اگر خیال بلند نہیں ہوتا تو ملال بھی نہیں ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆
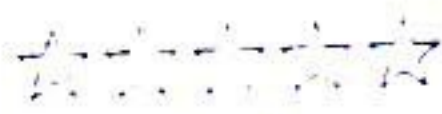
سردار عبدالرشید

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

جوش کے اس مصرعے کا سراپا، حیرت ہوتی ہے کہ ایک وجود جو پولیس کے تبکدہ سے اٹھا، اب سیاستدانوں کے منبر تکبیر کی صدا ہے، لیکن چپ چاپ۔ پاکستان کے دسار سیاسیات میں پولیس کے تین شہسوار (دوسرا کوئی لفظ اس وقت ذہن میں نہیں آرہا) ابھرے اولاً خان قربان علی خاں، جو انسپکٹر جنرل پولیس تھے تو سیاست تھے۔ وزیر نے تو پولیس افسر ہی رہے۔ ثانیاً بی احمد، جن کی زہانت ان کے لیے ابتلا ہو گئی۔ آج کل متروکات سخن میں سے ہیں۔ ثالثاً سردار عبدالرشید، جو سیاسیات میں آئے نہیں لائے گئے ہیں:

میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

قربان علی خاں دھڑے کے پکے تھے

سردار رشید زبان کے پکے ہیں۔ قول و فعل میں تضاد نہیں۔ انھیں پاکستان سے اتنی ہی محبت ہے، جتنی ایک شیر خوار بچے سے ماں کو ہوتی ہے۔

بادشاہ خاں کے احتساب سے کوئی شاذ ہی بچتا ہے انھیں سیاسی افق کے ہر ستارے کا زائچہ معلوم ہے۔ تمام سیاسیین کی تاریخ اور جغرافیہ جانتے ہیں۔ جن دنوں سردار رشید سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے۔ بادشاہ خان نے راقم سے کہا تھا:

”رشید انتہائی نیک ہے۔ بھلا وہ اس بوجھ کو کیوں کر اٹھا سکتا ہے۔ میاں! دیانت دار ہونا انتہائی خطرناک ہے“۔

طویل قامت، کھلا ماتھا، سوچتی آنکھیں، متحرک شکنیں، چوڑا سینہ، بات کے کھرے، سننے کو، صاف دل، آصف علی (مرحوم) کی طرح یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بولتے بھی ہیں۔ کم

سختی بے سختی کی حد تک ...... الغرض

چراغِ لالہ جلاؤ کہ رات باقی ہے!

کا سر عنوان!

☆☆☆☆☆

خان عبدالغفار خان

بالا قامت، سپید رنگ، لیکن عمر کی کہنگی سے چہرہ پر جھریاں ابھر آئی ہیں۔ آنکھیں متحرک بھی ہیں اور روشن بھی۔ ایک درویش، ایک فقیر، تمام عمر غیر ملکی سامراج کے خلاف جدوجہد میں بسر کی، موٹا جھوٹا پہنا، روکھا پھیکا کھایا، لیکن طبیعت میں انکساری کے باوجود گردن میں کوئی خم نہیں ہے وہ پہلے بھی خدائی خدمت گار تھے اور آج بھی خدائی خدمت گار ہیں۔ کانگرس کی صدارت قبول لنے سے ہمیشہ گاندھی جی کی خواہش کے باوجود انکار کیا۔ ان کے قول و فعل سے کسی کو کبھی کوئی اعتراض نہیں رہا۔ البتہ ان کی شخصیت بعض خود بین حضرات کے لیے ضرور مشتبہ یا مہلک ہے۔ ان کی عمر کا نصف قید ہے اور نصف جدوجہد۔

سرحد کی تاریخ آزادی سے عبدالغفار خان کو حذف کر دیا جائے تو جو کچھ باقی بچتا ہے وہ محض حرفِ اعتذار ہے یا چند غیر منضبط اوراق، جن میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔

مجھے ان کی ایک ادا کبھی نہیں بھولتی۔ بہار کے فسادات میں وہ پشاور سے پٹنہ پہنچے انھیں اسٹیشن پر لینے کے لیے وزیر اعظم بہار اور ان کی کابینہ کے بعض دوسرے ارکان موجود تھے۔ ایک لمبا تڑنگا انسان تھرڈ کلاس کے ڈبے سے اترا، اپنا بستر خود اٹھایا اور عقیدت مندوں کے اصرار کو پروا میں نہ لاتا ہوا باہر نکل گیا۔ اگلے دن متاثرہ علاقے کا دورہ کرنے کے لیے روانہ ہونے لگے تو وزارت بہار نے ان کے لیے بڑی عمدہ موٹر کا انتظام کر رکھا تھا اور معیت میں حفاظتی دستے لگا دیے ہو گئے تھے لیکن آپ نے سختی سے انکار کیا۔ ایک جیپ جن لی اور دو چار رضا کاروں سمیت روانہ ہو گئے۔ ہر کہیں ہجوم نے خیر مقدم کیا اور فواکہات و مشروبات پیش کرنا چاہے، لیکن آپ نہایت نرمی سے پوچھتے کہ میری قوم کو تو آپ بے گناہ مارتے ہیں اور مجھے فواکہات و مشروبات پیش کرتے ہیں، آخر اس عقیدت اور اس شقاوت کا مطلب کیا ہے؟ آج ہندوستان اور پاکستان دونوں آزاد ہیں۔ لیکن بادشاہ خاں ابھی تک اپنی شام زندگی میں صبح آزادی کی راہ دیکھ رہے ہیں۔

مولانا عبدالقادر قصوری

مولانا عبدالقادر قصوری کا وجود اس قحط الرجال میں غنیمت تھا۔ ان سے لوگوں کو اختلاف بھی تھا اور اتفاق بھی، لیکن جہاں تک ان کی ذہنی قابلیت اور ذاتی ایثار کا تعلق ہے اس زمانے میں بھی جب زعمائے احرار (اس سے مراد مجلس احرار نہیں) کاسہ لیسانِ سرمدی کی تنقید کا نشانہ تھے، مولانا عبدالقادر قصوری کو ہر کہیں احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ اگر قوم کی ذہنی فضا مکدر نہ ہوتی تو ان کا مسلمانوں میں وہی درجہ ہوتا جو لاجپت رائے کا ہندوؤں میں تھا۔ وہ اہلِ حدیث کے پیشوا تھے۔ انھیں پنجاب میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نائب سمجھا جاتا تھا۔

ان کی قابلیت کے متعلق ایک دفعہ لاہور ہائیکورٹ کے ایک چیف جسٹس نے کہا تھا:

"عبدالقادر ان ہندوستانی سیاستدانوں میں سے ہے، جن کو انگلستان کے لوگ سن لیں تو ذہنی مسرت محسوس کریں۔"

ان کی سیاسی سوجھ بوجھ کا ہر کہ ومہ کو اعتراف تھا۔ وہ ایثار نفس اور ایثارِ ذات کا ایک قابل عزت نمونہ تھے۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ انھی کی سفارش پر کراچی کانگرس میں ڈاکٹر عالم کو ورکنگ کمیٹی کا ممبر بنایا گیا تھا۔ احرار نے اس کو محسوس کیا اور الگ ہو گئے اور پھر کبھی خلافت کے "بقیۃ السیف" زعما میں وہ یکجہتی پیدا نہ ہو سکی۔ جو کبھی ان کا طغرائے امتیاز تھے۔ آخر عمر میں سیاسیات سے کنارہ کش ہو گئے اور تمام وقت یاد اللہ میں بسر کیا۔ پابند صوم و صلوٰۃ، بلکہ تہجد گذار تھے۔ شرعی صورت، اجلی داڑھی، نکلتا ہوا قد، روشن آنکھیں، لہجہ میں علم، زبان میں شرافت انھیں تو .... بیٹھیں تو ! (۱)

☆☆☆☆

(۱) افسوس! آخری جملہ تراشے میں کٹ گیا۔

خان عبدالقیوم خان

کچھ گفتنی، کچھ ناگفتنی! اور جو گفتنی ہے، وہ یہ ہے!

دراز قامت، گورا رنگ، لیکن اس میں کسی قدر نمک بھی شامل ہے۔ موٹی موٹی آنکھیں، جن کے پیچھے کچھ عجیب سی چمک رہتی ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکے ہیں۔ کانگرس میں تھے تو اس سے بھی دس قدم آگے تھے۔ آج مسلم لیگ میں ہیں تو سرحد کے سیاسی ویرانے میں ایک سنگین ہیں۔ بیرونِ سرحد کے عوام میں اپنی عجیب و غریب شخصیت کے باعث خاصے معروف ہیں، لیکن بذاتہ ایک پرابلم ہیں۔ اور صوبہ سرحد کو پورے ملک کے لیے ایک پرابلم بنا رکھا ہے۔ مزاج کوہستانی ہے۔ یعنی اس میں اکل کھرا پن ہے۔ زبان بے قابو ہے۔ گونجتا بھی ہے اور گرجتا بھی، لہجہ افغانی ہے، نسلاً کاشمیری ہے، عملاً پٹھان۔ اس کے سیاسی لغت میں عفوودرگزر کا نام نہیں۔ جو کرتا ہے وہی کہتا ہے۔ کوئی قدم اٹھالے تو اس پر پریشان نہیں ہوتا۔ بلکہ اپنی غلطیوں پر بھی فخر کرتا ہے۔

وہ پرایوں پر وار کرتا ہے، لیکن اپنوں کو خوف زدہ کرتا ہے۔ وہ ایک کوہستانی ڈھول ہے، اور دور کے ڈھول ہمیشہ سہانے ہوتے ہیں۔ اس نے پہلی لڑائی پانی پت میں نہیں، چارسدہ میں لڑی ہے۔ اور اب تک بیسیوں چھوٹے چھوٹے "غزوات" میں حصہ لے چکا ہے۔ اس کے "سیاسی مقتل" میں کئی دھڑ لٹکتے نظر آتے ہیں۔ عبدالغفار خاں ہیں، پیر مانکی شریف ہیں، یوسف خٹک ہیں، رنگارنگ کا سیاسی گوشت، المختصر خان عبدالقیوم خان کی بدنی جسامت اور سیاسی جسامت میں چنداں فرق نہیں۔ فربہ ہیں اور آپ جانتے ہیں ایک فربہ انسان کی خلوت و جلوت میں دوغلہ پن نہیں ہوتا۔ وہ ایک دبنگ انسان ہیں۔ جو منہ میں آتا ہے بے روک ٹوک کہہ دیتے ہیں۔ کبھی منہ ملاحظہ کی بات نہیں کرتے۔ ان کے قول و فعل میں بظاہر بڑی ہی یکسانی ہے۔

☆☆☆☆☆

میر عبدالقیوم

ہمارے ملک میں میروں، پیروں، وزیروں، مدیروں اور فقیروں کی کمی نہیں۔ میروں میں میر غلام علی تالپور ہیں۔ جن کے بارے میں عام خیال ہے کہ

جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یوں بھی اور یوں بھی

میر علی احمد تالپور ہیں کہ

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں!

میر انور سعید ہیں کہ سیاسی "قلندرے" نہ سہی "ادبی قلندرے" تو ہیں ہی اور بہ قول شخصے۔

تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے!

لیکن ہمارے میر، میر بھی ہیں اور عبدالقیوم بھی، انھیں نہیں ہمیں گلہ ہے کہ وزیر ہوتے ہوتے رہ جاتے ہیں۔ جب وزیروں کی فہرست میں ان کا نام زیرِ غور ہوتا ہے، تو وزیر ہونے کے لیے جو خصوصیتیں درکار ہیں ان سے یکسر خالی نظر آتے ہیں۔ مثلاً

تلفظ میں عبدالحمید دستی نہیں۔ قد عابد حسین کی طرح لمبا تڑنگا ہے۔ لیکن عابد حسین نہیں۔ کیوں کہ اپنے دماغ سے سوچتے اور اپنی زبان میں بولتے ہیں۔ رنگ حسن محمود کی طرح چٹا ہے، لیکن عمر ڈھل چکی ہے۔ چلتے ہیں تو موجِ خرامِ یار شرما جاتی ہے۔ لیکن پیدل چلتے ہیں۔ حالاں کہ وزیر ہونے کے لیے کسی سہگل سے پیشگی موٹر لینا ضروری ہے۔

کبھی گھی کا بیوپار نہیں کیا۔ خون میں نجابت ہے۔ اس باپ کے بیٹے ہیں جس کا تحریک خلافت میں طوطی بولتا تھا۔ ان کے وقتی خیالات میں ضرور پیوند نظر آتے ہیں اس لیے کہ سیاسیات میں بھی "مرنجان مرنج" ہیں لیکن جن سیاسی قدروں پر یقین رکھتے ہیں، ان سے کبھی ادھر ادھر نہیں سرکتے بلکہ ان کی حاضر و غائب تبلیغ کرتے ہیں۔

ہیں وہابی، لیکن ان کے والد مدظلہ دین میں وہابی ہیں، یہ سیاست میں۔ اتنے متشدد وہابی

ہیں کہ رجعت پسندوں سے "ناتے" باندھ کر بھی ان کی روایت و درایت کو تسلیم نہیں کرتے۔ بلکہ فقہ و اجتہاد سے کام لیتے ہیں۔ لیکن جن بنجر زمینوں میں بزعم خود انھوں نے بیج دیا ہے وہ کبھی سر سبز نہیں ہوئی ہیں۔

تراچہ حاصلے کشتِ خرابے!

ایک شخص بھی ری پبلی کن پارٹی کے سیکرٹریٹ میں ان کی قابلیت کا جوڑ نہیں۔ جتنے ہیں سب جوڑ توڑ کی پیداوار ہیں۔ معاملات کی روح کو سمجھتے۔ لیکن ان کے جسم پر ہاتھ ڈالتے ہوئے ہچکچاتے ہیں کیونکہ، ع

ہیں یہی بات کا افسانہ بنانے والے

بولنے کا انداز نہایت میٹھا ہے۔ کوئی فقرہ درشت نہیں ہوتا۔ مجلسی زندگی میں رکھ رکھاؤ کے عادی غصہ آتا ہے لیکن شاذ، اور وہ بھی "قہرِ درویش بر جاں درویش" ...... دماغا انقلابی ہیں لیکن قلباً مفاہمت پسند۔ بگڑیں تو مولانا ابو الکلام آزاد سے بگڑ جائیں۔ گو ان سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں۔ لیکن صلح صفائی کرلیں تو سیٹھ سہگل کو بھی علامہ تفتازانی کا جانشیں سمجھتے ہیں۔

حالاں کہ ان کے بارے میں ان کا خیال ہے۔ محض روپیہ ہیں۔ یاروں کے یار ہیں۔ دشمنوں کے دشمن، لیکن شریف دشمن، چھریرا بدن، ستواں ناک، بولتی اور سوچتی ہوئی آنکھیں۔ کھلا ماتھا۔ دولتانہ کے زخم خوردہ، خان کے عزیز مکرم بانکے پھکیت؟ نہ ہوا میں گرہ باندھتے ہیں نہ مٹھی میں ہوا تھامتے ہیں۔ تمام زندگی میانہ روی میں بسر کی ہے۔ دو حصے گزر چکی ہے ایک حصہ باقی ہے۔ سیاسی نجومیوں کا کہنا ہے، جو باقی ہے وہی اصل ہے۔ ان کے ہاتھ کی ریکھائیں کہہ رہی ہیں۔ ایک انقلاب آرہا ہے۔ اور "قلمدان وزارت" ان کے تعاقب میں ہے۔

بہرحال

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

☆☆☆☆☆☆

مولانا عبدالماجد دریابادی

میں نے مولانا عبدالماجد دریابادی کو کبھی نہیں دیکھا، لیکن ان کا نام ایک زمانے سے سن رکھا ہے اور ان کو دیکھنے کی آرزو بڑے دنوں سے دل میں بسی ہوئی ہے!

جو کبھی پوری نہ ہو وہ آرزو ہے اور کیا

اور اب اس آرزو کے بال و پر ہی جھڑ چکے ہیں۔ وہ ہندوستان میں ہیں راقم الحروف پاکستان میں، ادھر ان دونوں مملکتوں کے درمیان جو سرخ لکیر کھنچ گئی ہے اس نے امیدوں کی بہت سی عمارتیں ڈھادی ہیں۔ ادھر جن چیزوں کی یاد رہ رہ کے آتی ہے، ان میں ایک تو مولانا ابوالکلام آزاد کی گفتگو ہے، دوسرے تاج محل کی دل کشا عمارت، تیسرے عروس البلاد بمبئی اور چوتھے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کو ایک بار دیکھ لینے کی خلش، ع

پھر کہاں دنیا میں ایسی ہستیاں

میں نے سب سے پہلے مولانا کی تحریر کا نقش ''الہلال'' میں دیکھا تھا۔ پھر فلسفۂ اجتماع'' نظر سے گزری۔ اور دماغ ان سے مرعوب ہو گیا۔ لیکن جس چیز نے ان کے لیے دل میں قدر و منزلت کے جذبات پیدا کیے۔ وہ ان کی ''سچی باتیں'' ہیں۔ کئی دن ہوتے ہیں ایک بڑے ہندوستانی افسر سے ملنے کا اتفاق ہوا، تو مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ مولانا کی ''سچی باتیں'' ان صاحب کے دل میں بہت بری طرح کھٹکتی ہیں۔ قدرت نے مولانا کے قلم کو جو بانکپن دیا ہے، اس کی گھلاوٹ اور سجاوٹ ہر کہ و مہ کے بس کی بات نہیں۔ وہ ان دو چار صاحبِ طرز ادیبوں میں سے ہیں۔ جن کی عظمت لیل و نہار کی کوئی گردش بھی محو نہیں کر سکتی۔ ان کے الفاظ میں وجاہت اور ان کے معانی میں عمق ہوتا ہے۔ وہ لکھتے نہیں موتی پروتے ہیں۔

''صدق'' ''چٹان'' کے تبادلے میں آتا ہے۔ جب تک الف تا ی دیکھ نہ لیں طبیعت ٹکتی نہیں پچھلے دنوں آپ نے ازراہِ عطوفت سفرنامۂ حجاز بھجوایا تھا۔ جو اپنے موضوع پر ایک

لاجواب تصنیف ہے۔ اس کی سطر سطر میں کھلاوٹ ہے۔ راقم الحروف کی اسی سلسلے کی بعض لغزشوں کو مولانا نے اسلامیت کے خلاف سمجھا، تو اپنے مرتبے کا خیال کیے بغیر اپنے خط میں ٹوکا۔ جی چاہا کہ ان کی اس بزرگانہ تنبیہہ کے لیے اظہارِ تشکر کروں، لیکن قلم کو حوصلہ نہ ہوا۔ چناں چہ ابھی تک اس قرض کا بوجھ ذہن کو محسوس ہو رہا ہے۔

مولانا کی سب سے بڑی خوبی جس سے طبیعت ان کی شیفتہ ہو جاتی ہے، وہ ان کی کلمہ حق سے دل بستگی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ وہ اس سن و سال میں بھی ہندوستان کے بت کدے میں تکبیر کی ایک دلآویز صدا ہیں۔

☆☆☆☆☆

عبدالمجید عتیقی

مسلمانوں کی تاریخی فطرت یعنی زود فراموشی کا زخم خوردہ ایک ہفتہ وار میں ان کی سرگذشت "پھول اور کانٹے" کے عنوان سے چھپ رہی ہے۔ اس میں جو پھول ہیں، وہ دامن غیر کے لیے ہیں اور جو کانٹے ہیں وہ ان کے لیے ہیں۔ اپنے دونوں پھول انھوں نے تحریکِ خلافت میں کھودیے تھے۔ محمد علی، ابوالکلام اور ظفر علی خاں کے عروج کا زمانہ تھا، ان کی تحریر و تقریر نے اس نوجوان میں بھی جوش و جذبہ پیدا کیا، خطابت کا ملکہ بھی تھا اور چسکہ بھی، ان کے سحر میں کھوگئے اور نوعمری ہی میں جیل چلے گئے نوکر شاہی کہاں برداشت کرتی کہ ایک نوجوان جو ابھی پورے طور پر جوان بھی نہیں ہوا ہے، بالا و بلند ہو کر ان کے لیے عذاب بن جائے۔ اس نے طبیعت کے تیکھے تیوروں سے خوف کھایا اور پہلی دفعہ لاہور سنٹرل جیل میں ان کی دونوں آنکھوں کا صفایا کر دیا، یہ حادثہ معمولی نہ تھا، لیکن عتیقی اور ان کے اعزہ غایت درجہ کا یہ ہولناک حادثہ بھی سہہ گئے اور اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا، تاہم برطانوی سامراج کے دامن پر ایک داغ رہ گیا، جو مسلمانوں کے پشتینی وفاداروں نے آبِ نسیاں سے دھوڈالا۔

اور اب نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ عبدالمجید عتیقی ہے کون؟ رہتا کہاں ہے، کرتا کیا ہے اور زندہ ہے تو کیوں کر، کسی تذکرے میں ان کا ذکر نہیں، کسی تاریخ میں ان کے سوانح نہیں، کسی اخبار میں ان کا چرچا نہیں۔ تینتالیس برس سے کھوئی ہوئی آنکھوں پر سیاہ رنگ کا چشمہ چڑھائے عمر طبعی گذار رہے ہیں ایک خدمت گار ہر وقت ان کے ساتھ رہتا ہے، جس کی بدولت چہل قدمی کرتے یا ضروری تقریبوں میں شامل ہوتے ہواتے ہیں۔

آنکھیں گنوا کر بھی ان کا عشق مرا نہیں اب تک عمر نے ساتھ دیا، سامراج سے لڑتے رہے۔ آٹھ دفعہ جیل گئے اور ساتھ آٹھ برس مجموعی طور پر قید کاٹی، بصیرت معنوی اسارت کی لاج رکھی، سر نہ جھکایا۔ اس حالت میں بھی کئی کتابیں لکھیں جن میں سے بعض غیر

ہوتی رہیں "ترکانِ احرار" ان کی مشہور سوانحی کتاب ہے، جس کا دیباچہ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا اور اس زمانے میں ہاتھوں ہاتھ نکل گئی۔ اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ آج کل ناپید ہے۔ عمر ان کی بھی معلوم نہیں کتنی ہے۔ بہر حال چہرہ چغلی کھا رہا ہے کہ اس عمارت کا پستر اُڑ گیا ہے، روشندان بند ہو چکے ہیں، رنگ ابھی تک سرخ و سپید ہے، لیکن عمر نے ان میں چٹاخ ڈال دیے ہیں۔ داڑھی کتر دی، مونچھیں ترشی ہوئی۔ سر پہ آج تک ترکی ٹوپی رکھتے ہیں، کان کھڑے، نگاہیں غائب حبشہ لاغر، قد کشیدہ و خمیدہ۔ چلتے اب بھی صبا کی چال ہیں۔ بولتے خوب ہیں، آواز میں نخرہ نہیں زور ہے۔ بصیرت کی آنکھیں ہر لحظہ کھلی رکھتے ہیں دن بھر فلیمنگ روڈ کے بالا خانے پر پڑے رہتے ہیں، جوان کا گھر بھی ہے، مطب بھی، لائبریری بھی، سیاست خانہ بھی اور گئے وقتوں کی ایک یادگار بھی کہ اس چھوٹے سے مکان میں ملک کے بڑے بڑے نامور راہنما آچکے ہیں اور اس کے مکین کا نام عبدالمجید قریشی ہے۔

☆☆☆☆☆

عبدالمنعم خاں

غزل کے روپ میں دارورسن کی تیاری

دیکھا ایک دفعہ، سنا کئی دفعہ، پڑھا بارہا، سیدھے سادھے انسان ہیں، لیکن بات تلوار کی دھار ہوتی ہے۔ گونج گرج بالکل نہیں، بنگالی لہجہ میں ہو تو الگ بات ہے۔ انگریزی دھیمے سروں میں بولتے، اردو صاف تو نہیں لیکن بہر حال بولتے ہیں، اور رکھ رکھاؤ سے بولتے ہیں۔ جب تک مشرقی پاکستان کے بڑے لوگ زندہ تھے ان کے جوہر نہیں کھلے اب جوہر کھلے، تو خوب کھلے۔ شطرنج بچھی ہو تو مہرے خوب لڑاتے ہیں۔ ایوب کو ان پر اعتقاد ہے۔ جن دنوں صدارتی انتخاب تھا مشرقی پاکستان میں ایک طوفان کروٹیں لے رہا تھا۔ جنگ کے دنوں میں توپوں کی ارڑدھم ہوتی ہے، انتخاب کے دنوں میں زبانوں کا قہر و غضب، ان دنوں ہر شخص اپنے اپنے داؤں پر تھا اور اب یہ راز نہیں رہا کہ نتائج کا جو نقشہ عبدالمنعم خاں نے اس زمانے میں بیان کیا تھا اور جس کو وہ پورے اعتماد سے پیش کرتے تھے من و عن درست نکلا۔ تولہ ماشہ کا فرق تو ہو ہی جاتا ہے۔ یار لوگوں کی زبانیں عموماً کھلی رہتی ہیں، لیکن ان میں یہ خوبو ہے کہ بے قابو زبانوں کو بھی مہر بلب کر دیتے ہیں۔ فہیم بھی ہیں اور زیرک بھی چونکہ قربت کا موقع نہیں ملا اس لیے الفاظ کے طوطا مینا اُڑانے سے کچھ حاصل نہ ہوگا، روایت ہی پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔ حکایت اس کی یہ ہے کہ زبان سے زخم نہیں پہنچاتے، الفاظ سے وار نہیں کرتے، مطالب کی خندقوں سے بھرپور حملہ کرتے ہیں۔ انسان خطاؤں سے منزہ نہیں، ہر شخص غلطی کرتا ہے۔ ان سے بھی غلطیاں ہوئی ہوں گی، لیکن عبدالمنعم خاں کے بارے میں ایک بات پورے اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ سچے پاکستانی ہیں اور پاکستان ہی کے لیے جی رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے صواب دید کے مطابق پاکستان کی بڑی خدمت کی ہے ....!

قامت میانہ ہے، عمر ڈھل چکی ہے۔ گورنری کی وجاہت کے باوجود چہرے پر

جھریوں کی چھاپ نمایاں ہوگئی ہے۔ کئی سال پہلے راقم الحروف ان سے ڈھاکہ کے گورنر ہاؤس میں ملا توان کے ہاتھوں کی جھریاں بھی صاف نظر آرہی تھیں، اور عمر کی کہنگی کا احساس بھی موجود تھا، لیکن ان میں ایک اعتماد اور حوصلہ کہساروں کے اعتماد و حوصلہ کی طرح موجود تھا۔ اس وقت سر پہ قائدِ اعظم کیپ تھی، لیکن اس کا حاشیہ ذرا بڑھا ہوا تھا، آنکھوں پہ چشمہ تھا لیکن دھنسی ہوئی آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا ان میں خاصی تیزی اور اس تیزی کے عقب میں بھرپور ذہانت موجود ہے۔ رنگ گندمی، چہرہ کتابی لیکن جلد اُکھڑی ہوئی، ناک ستواں، جسم مضبوط، اوپر چکن، نیچے چوڑی دار پاجامہ، ان کے چہرے مہرے سے یہ بات قطعی واضح ہوتی ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کی روایتوں اور حکایتوں کا مظہرِ اتم ہیں۔

☆☆☆☆☆

سیّد عبد الواحد ایم۔اے

کئی برس کی بات ہے یوم اقبال کی تقریب میں ایک صاحب ملے۔ عمر لد چکی تھی چہرے پر جھریاں، رنگ گورا، آنکھیں اس سن و سال میں بھی عنفوان شباب کی چغلی کھا رہی تھیں۔ بال بالکل سفید، داڑھی مونچھیں صاف، قد میانہ، بدن دوہرا، ہاتھوں میں رعشہ کی چنت، گلے پر عمر رفتہ کی گانٹھیں، لباس اجلا لیکن اس کا ڈھیلا پن کہہ رہا تھا کہ جسم ڈھل چکا ہے۔ بڑھاپے کی ان تمام علامتوں کے باوجود آواز میں کرارا پن تھا۔ گویا ایک ایک لفظ کا ٹانکہ بول رہا تھا، نہ لہجہ میں کوئی خراش، نہ حروف میں کوئی ارتعاش، ہونٹ فالتو لفظوں سے آشنا ہی نہ تھے، محسوس ہوتا تھا اقبال کا ایک گمشدہ شاہین ایک طویل العمر جدوجہد کے بعد ارمغان حجاز کے جزیرے میں دوستوں سے ہمکلام ہے۔ پتہ چلا کہ ان کا نام نامی سید عبد الواحد ہے۔ حکومتِ پاکستان میں محکمۂ جنگلات کے انسپکٹر جنرل ہیں۔ جنگل میں منگل کا محاورہ سنا تھا انھیں دیکھا تو معلوم ہوا ہے کہ لازماً اس محاورے میں کوئی صداقت ہے۔

اقبال کے محرم ہی نہیں اقبال کے شیدائی ہیں۔ پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹ سکتے ہیں۔ اقبال زندہ ہوتے تو انھیں دیدہ و دل میں جگہ دیتے لیکن اقبال کے ''الاٹیوں'' نے انھیں کوئی ایسی جگہ نہیں دی جس سے یہ معلوم ہو کہ اس ''متروکہ جائداد'' کے ورثہ میں یہ بھی شریک ہیں؟ کراچی میں ''نمبر ۱۰ کچہری روڈ'' پر رہتے ہیں۔ اجمیر شریف میں ۱۸۹۸ء میں پیدا ہوئے۔ اجمیر اور علی گڈھ سے تعلیم حاصل کی۔ آکسفورڈ سے ایم اے کیا۔ سنا تھا کہ فلاں آدمی ہفت زبان ہے۔ لیکن ان سے مل کر اندازہ ہوا کہ ہفت زبان کسے کہتے ہیں۔ اردو ان کی اپنی زبان ہے یعنی یہ اردو کے اور اردو ان کی۔ انگریزی کی نوک پلک سے بھی شناسا ہیں۔ فارسی پر قدرت تامہ رکھتے ہیں۔ فرانسیسی خوب جانتے ہیں۔ جرمن میں بھی درخور دانی ہے۔ اطالوی سے بھی آشنائی بہم پہنچا رکھی ہے۔ کام ان کا یہ ہے کہ ان زبانوں میں اقبال کے افکار سوانح منتقل کرتے رہتے ہیں۔ ان کا وجود بجائے خود ایک ادارہ ہے، جو کچھ اقبال

نے لکھا اور اقبال پر اہل علم نے جو کچھ لکھا ان کے علم اور حافظہ میں ہے۔ خود اقبال پر بہت سی تابیں حوالۂ قلم کی ہیں۔ یو این او میں مشرقِ وسطیٰ کے لیے مشیر تھے تو فکر اقبال کی آبیاری کرتے رہے ان کی مساعی مشکور سے کئی ایک یورپین مصنفوں نے اقبال کے افکار پر قلم اٹھایا اور ان کے خیالات کا حقیقی عکس پیش کیا۔ مصر، افغانستان، جرمنی، انگلینڈ، امریکہ اور کئی ایک یورپی ملکوں میں علامہ اقبال کے افکار و سوانح پر لیکچر دے چکے ہیں۔

اقبال پر ان کی بعض تصنیفات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ۱۹۴۱ء میں لندن سے ایک کتاب Iqbal his art and Thought "اقبال اور اس کا فکر و فن" شائع ہوئی۔ علامہ اقبال کا وہ کلام جو ان کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں جسے حضرت علامہ نے مجموعے ترتیب دیتے وقت حذف کر دیا، یا کسی وجہ سے اس میں حک و اضافہ کیا۔ آپ نے باقیات اقبال کے نام سے مرتب کر کے شائع کروایا ہے۔ آپ کی ایک اور انگریزی کتاب Introduction to Iqbal اقبال کا تعارف، حکومتِ پاکستان نے شائع کی ہے۔ اقبال کے مختلف مقالات بھی پرانے جرائد و رسائل سے جمع کر کے شائع کیے ہیں اس کے علاوہ Thoughts & Reflection of Iqbal کے موضوع پر ایک کتاب چھپ چکی ہے۔ Studies in Iqbal (مطالعہ اقبال) زیرِ طبع ہے۔ آج کل آپ علامہ اقبال کے سوانح حیات ترتیب دے رہے ہیں۔

اقبال کے بارے میں جس قدر لٹریچر بھی غیر ملکی زبانوں میں شائع ہوتا ہے، اس کا گہری نگاہ سے مطالعہ کرتے اور ایک محاسب کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال کے بارے میں جو غلطیاں یورپی مصنفوں سے غیر ارادی طور پر سرزد ہوں، ان کی فوری اصلاح کر دینی چاہیے ورنہ غلطی ہائے مضامین کا اندیشہ اور بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔ اسی ضمن میں ان کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ یورپ کو فکر اقبال سے آشنا کرنے کے لیے اس قسم کی تمام فروگذاشتوں پر نگاہ رکھنا انتہائی ضروری ہے، تاکہ اقبال کے معاملے میں نہ تو یورپی دانشوروں کی فکر داغدار ہو، نہ وہ ان کے سوانح و حالات کے معاملے میں کسی آلودگی کا شکار ہوں۔

حال ہی میں انھوں نے بتایا کہ فرانس کی ایک مصنفہ میڈم مائرووچ نے Recon-struction of religious thoughts in Islam کا فرانسیسی زبان میں نہایت عمدہ ترجمہ کیا ہے، لیکن اس کے دیباچہ نگار پروفیسر میسینون (Massignon) نے جو یورپ کے مشہور عالم ہیں۔ ایک عجیب و غریب بات لکھ دی ہے، جو نہ صرف مضحک ہے بلکہ فوری اصلاح کا تقاضہ کرتی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ہندوستان ناقابل تقسیم ہے۔ ایک یونٹ ہے اور ایک ہی یونٹ رہے گا۔ اقبال اسی ہندوستان کا بیٹا ہے۔ مزید لکھا ہے کہ اقبال عمر بھر ہندو مت اور اسلام کو ایک دوسرے میں ضم کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فکر اقبال کے بلاواسطہ مطالعے کی نفی کا نتیجہ ہے، اور جو لوگ اقبال کے نام پر بیٹھے جاتے ہیں، وہ ان غلطیوں، کوتاہیوں اور لغزشوں کا جائزہ ہی نہیں لیتے۔

سید صاحب نے بتایا کہ میڈم مائرووچ علامہ اقبال کے کلام سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ انھوں نے علامہ اقبال کا کلام کماحقہ سمجھنے کے لیے فارسی زبان میں ترجمہ کیا اب وہ مولانا روم کی مثنوی پر کام کر رہی ہیں۔

ڈاکٹر شمل بون یونیورسٹی میں مشرقی ادب کی استاد ہیں۔ انھوں نے اقبال کے نظریۂ خودی پر ایک فاضلانہ کتاب بھی لکھی ہے وہ لاہور میں یوم اقبال پر دو دفعہ آچکی اور اپنے نکتہ آفرین خطبات بھی پڑھ چکی ہیں۔ انھیں سب سے پہلے سید صاحب ہی نے اقبال کے بلاواسطہ مطالعے پر آمادہ کیا۔ اس فاضل خاتون نے کلام اقبال کے مطالعے کی غرض سے نہ صرف اُردو فارسی سبقاً سبقاً پڑھی، بلکہ اس کی املا اور انشا میں بھی مہارت حاصل کی۔ پاکستان کے لوگ اس کی اس فضیلت اور قابلیت کے نظارے اپنی آنکھوں سے کر چکے ہیں۔

سید صاحب کی جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے، وہ اقبال سے ان کا ۔۔۔ عشق ہے۔ وہ دماغ و دل سے اقبال کو مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا رہبر اعظم سمجھتے اور ان کی فکر کو عام کرنے کے مبلغ ہیں۔ انھوں نے اپنے بڑھاپے کو بھی اس کے لیے وقت کر رکھا ہے۔ وہ دن رات اس کے لیے سفر کرتے اور ادھر ادھر دوڑے پھرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ بعض لوگوں نے اقبال کو اپنی معاش یا اپنی شہرت کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ حالاں کہ اقبال کے افکار

نظریات ملک و قوم کی برتری و بلندی اور اسلامی معاشرے کی نئی تشکیل میں مشعلِ راہ ہو سکتے ہیں۔

غرض اس ایک شخص (سیّد صاحب محترم) کی تنہا جدوجہد اور شب و روز کے سفر سے احساس ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو اقبالؔ کے نام پر اکادمیاں بنا کر کراچی اور لاہور میں سرکاری خزانے کے روپے کو خویش پروری پر صرف کر رہے ہیں اور جنھیں اس سارے عرصے میں ایک آدھ قابل مطالعہ کتاب کے سوا کسی قابل ذکر کتاب کی اشاعت کی توفیق نہیں ہوئی ہے۔ ان سے یہ ایک مرد قلندر اولیٰ ہے جس میں بوے اسد اللّٰھی بھی ہے، سوز و ساز رومی بھی اور پیچ و تاب رازی بھی، اور وہ اپنے ساتھ اسی توفیقِ ربانی کو لے کر اقبالؔ کے فکر و فن کی شمعیں روشن کر رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

خان عبدالوحید خان

خان عبدالوحید خان اپنی ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ایک مُرصع انسان ہیں۔ پیشانی ہی سے واضح ہوتا ہے کہ قدرت نے ان میں غور و فکر سے عہدہ بر ہونے کی خوبیاں رکھی ہیں۔ ان کا چہرہ ہر لحاظ سے ایک ایسے انسان کا چہرہ ہے، جس میں وجاہت، بھی ہو، ذہانت بھی، فراست بھی ہو، فطانت بھی، ذکاوت بھی ہو اور حذاقت بھی ہو۔ چہرہ کتابی، ماتھ انقلابی، آنکھیں اس عمر میں بھی شرابی، بہ قول میر...... ''ساری مستی شراب کی سی ہے'' ناک ستواں، جس سے شاعروں کو شگفتہ مطلعوں کی رونق ہاتھ ہے، قد کا وزن کیا جائے تو تقطیع ''فاعلاتن فاعلاتن فاعلات'' ہوتی ہے، بدن دوہرا ہے، یعنی ضخامت روایتی ضخامت سے دوگنی ہے، چال میں لکھنؤ کا بانکپن، ڈھال میں دہلی کا پرتو، لیکن نہ اب وہ لکھنؤ رہا نہ دہلی! رہے نام اللہ کا، آپ گفتگو میں انھیں مات نہیں دے سکتے۔ زبان ان کی کترنی کی طرح چلتی ہے، لیکن فالتو الفاظ سے معرّیٰ، لہجہ نیزہ کی انی، جس خوبی سے بولتے اسی خوبی سے لکھتے ہیں۔ سیاسی امور میں ان کے افکار ہمیشہ ہی نپے تلے رہے ہیں، بولتے نہیں الفاظ کو تولتے ہیں، قلم سے انھوں نے وفا نہیں کی، قلم کے ہو کے رہتے تو ان کا قلم تلوار ہوتا۔ اب بھی جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں پچھلے پہر کے آنسوؤں کا گداز ہوتا ہے، نقشہ خوب بناتے ہیں، لیکن اس نقشے میں رنگ و روغن بھرنا ان کے بس میں نہیں، سروسامان کی دغا سے چوٹ کھا جاتے ہیں۔

فکر میں اقبالؒ کے پیرو ہیں، سیاست میں جینا کے، ادب میں میر کے، ذوق میں غالب کے، دین میں قاسم نانوتوی کے، اور ان سب کے افکار و سوانح نے ان کی شخصیت کے ڈھالنے میں بقدر طلب حصہ لیا ہے۔ ان سے مل کر آپ مایوس نہیں ہوں گے۔ وہ ہر شخص پر اپنی شخصیت کا عکس ڈال سکتے ہیں۔ اردو ان کی لونڈی ہے، ان کے لیے میر و مرزا کی بولی بولنا اتنا ہی سہل ہے، جتنا نسیم سحری کے لیے شاخوں پر پھول کھلانا، انگریزی ان کی جوان بھی ہے اور بے پناہ بھی، فارسی میں درخور دانی رکھتے ہیں، عربی کے تیور شناس ہیں، تاریخ ان کا مضمون

ہے، سیاسیات کا مرض اور اس مرض نے انھیں کسی قدر دل آزردہ بھی کیا ہے، یعنی اس کی بدولت وہ سیاسی اختلاج کے مریض ہوگئے ہیں۔ نتیجتہً "جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔" انھوں نے صوبہ اور مرکز میں وزارت خانم سے عقد کیا، لیکن بالآخر اسے طلاق دے آئے یا اس نے ان سے خلع کرالیا جو کچھ بھی ہوا، ان حالات میں ٹھیک ہوا۔ کب تک وہ اس کے چونچلوں اور چہلوں کی آنچ سہتے، غالب نے یونہی نہیں کہا تھا کہ "دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت۔"

یہ واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں قرطاس و قلم کی جو رعنایاں رکھی ہیں اور فہم و تدبر کا جو حسن انھیں عطا ہوا ہے، اُس سے اس سیاسی ویرانے میں پورے طور پر فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ نتیجتہً وہ ایک آہِ نارسا اور نالہ نیم شبی کی طرح ویرانی سحر کا تماشا دیکھ رہے ہیں اور اس مرقعِ احساس و تاثر کا نام ہے عبدالوحید خان۔

☆☆☆☆☆

عبدالحمید عدم

پاکستان سے پہلے لاہور کے ایس پی ایس کے ہال میں ایک مشاعرہ تھا۔ صدر غالباً سر عبدالقادرؒ تھے۔ مشاعرہ گویوں کے ہاتھ میں رہا۔ اختر شیرانی مشاعرے کے شاعر ہی نہ تھے۔ لڑکوں نے قہقہوں میں اُڑا دیا۔ عدم کی آواز بنگ تھی اختر شیرانی سے زیادہ، لیکن گویوں سے کم، داد پا گئے۔ دونوں کو شدت سے یہ احساس دامن گیر ہو گیا کہ گلے بازوں نے ان کی شاعرانہ عظمت کو صدمہ پہنچایا ہے، مداوا کیوں کر ہو؟ مداوا طے کی یہ شکل ڈھونڈھی گئی کہ معمول سے زیادہ شراب پی جائے۔ اس غرض سے دوستوں کے جیب ان کی جیب تھے احباب نیاز مندی سے نذرانہ پیش کر دیں فبہا، نہیں تو کسی نہ کسی ڈھب سے روپیہ وصول کر ہی لیتے تھے۔ جانے قرعۂ فال کس کے نام پڑا، شراب آگئی، دونوں نے ذٹ کے پی اور بغیر شرک کے پی، یعنی پانی نہیں ملایا۔ پھر دو نو برخوردار قسم کے شاعروں اور گلے باز تک بندوں کو دیر تک ملاحیاں سناتے رہے۔ فیصلہ آپس میں یہ کیا کہ اختر نظم کے بادشاہ ہیں اور عدم غزل کے، آیندہ ایک دوسرے کے لیے جئیں اور مریں۔

اختر شیرانی اس زمانے میں صرف شراب کے لیے جی رہے تھے، آخر شراب ہی کے ہاتھوں مر گئے۔ عدم نے ان کے بعد شراب کو اپنی رگوں کا خون بنا لیا اور اختر کے حصے کی شراب بھی اپنے پیمانے میں شامل کر لی۔ آج اٹھارہ برس سے عدم اپنے اور اختر کے حصے کی شراب بھی بلا شرکت غیرے پی رہے ہیں۔ نہ اب شراب ان سے چھٹ سکتی ہے اور نہ وہ شراب کو چھوڑ سکتے ہیں۔ ان دونوں میں بلا کا عشق ہے۔ عدم کے لہو کی جگہ شراب نے لے لی ہے۔ نتیجتہً عدم اور شراب جڑواں بہن بھائی ہو گئے ہیں۔ اس شراب نے نہ صرف ان کی صحت کو کھنڈر بنا رکھا ہے بلکہ ان کی شاعری کا شباب بھی کھا گئی ہے۔ چہرہ ٹوٹا ہوا سبو ہے، آنکھیں غلاظت خوردہ پیمانے ہیں، رنگ سیاہ پڑ چکا ہے، ناک ٹھرے کا پوا ہے، دانتوں میں کھڑکیاں آگئی ہیں۔ پیٹ دختِ رز کا مٹکا ہو گیا ہے۔ قد یوں جھک گیا ہے جس طرح معجونوں کی جدائی

میں پیر مغاں کی پیٹھ بیٹھ جاتی ہے۔ غرض اپنے ان الّلے تللّوں کے ہاتھوں عدمؔ اُسی شاہراہ کا مسافر ہے، جس شاہراہ پر اختر شیرانی بگٹٹ ہو کر منزل عدم تک پہنچ چکے ہیں۔

اور عدمؔ سے یہ کہنا اپنی ہجو کے لیے ان کی موزونی طبع کو دشنام مہیا کرنا ہے کہ بھائی موت کو دعوت نہ دو۔ شراب نہ صرف خانہ خراب ہے، بلکہ یہاں وہاں (دنیا و عقبٰی) دونوں جگہ عذاب ہے، عذاب النار' اور اگر تم بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اختر شیرانی کے پاس چلے گئے تو یہ میکدہ جہاں دوستوں کی محفلیں بادۂ سخن کے پیمانوں سے شادکام ہوتی ہیں، ہمیشہ کے لیے اُجڑ جائیں گی۔ اپنے لیے نہیں تو اپنے دوستوں ہی کے لیے کچھ دنوں جی لو' جینا فی نفسہٖ ایک حُسن ہے اور شاعر حُسن کی اہانت نہیں کیا کرتے۔

☆☆☆☆☆

نصر اللہ خاں عزیز

نصر اللہ خاں نام، ملک ذات، عزیزؔ تخلص، پیشہ اخبار نویسی۔ گوجرانوالہ میں جنم لیا، بجنور میں پروان چڑھے، لاہور میں ثقہ ہوگئے۔ "مدینہ" میں تھے تو قلم جوان تھا "زمیندار" میں تشریف لائے تو کہولت کا دورہ تھا۔ اب "تسنیم" میں قلم بوڑھا ہو چکا ہے۔

ان کا ایک شعر ہے:

مت جائیو انار کلی کی طرف عزیزؔ
واں ہر حسین بشیوۂ رہزن ہے آجکل

لیکن اب ادب ہی کو مسلمان بنانے پر تلے بیٹھے ہیں اور شاعری بھی پابندِ صوم وصلوٰۃ ہوگئی ہے۔

جہاں تک ان کی ذات کا تعلق ہے ان میں کسی قدر تقویٰ کی رعونت ضرور آگئی ہے، لیکن ہیں بے ضرر۔ البتہ کبھی کبھار "تیر دنشتر" کی تیزی میں سالک کی نکاہی چبھن سے بھی دو ہاتھ آگے نکل جاتے ہیں۔

ان کے قلم میں زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں اور اب اس منزل میں ہیں، کہ حدود اللہ سے اِدھر اُدھر ہٹتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

ایک دن مجھ سے کہہ رہے تھے۔ جی میں آتا ہے ان لوگوں سے فرداً فرداً معافی مانگ لوں جن کے خلاف کسی بھی زمانے میں میرے قلم نے کوئی ناگوار فقرہ لکھا ہے۔ لیکن ابھی بیڈھب مصروفیتوں نے روک رکھا ہے۔ ویسے ان کے لغت میں معذرت کا نام معافی اور معافی کا نام معذرت ہے۔ اپنی ذات کے اعتبار سے بڑے ہی شریف اور بڑے ہی نیک ہیں۔ وہ چٹکی بھی لیں تو ان سے چٹکی لینے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ لوگ آج ہیں ممکن ہے کل نہ ہوں۔؟

قامت میانہ ہے۔ بلند ہیں نہ پست، یعنی صحیح شرعی قد ہے، رنگ گندمی ہے لیکن

بارونق، کمر قدرے جھک گئی ہے۔ لہجہ اہلِ زبان کا سا ہے اور یقیناً ان لوگوں میں سے ہیں، جن کے نفس نے کبھی کوتاہی نہیں کی ہے۔ اپنے سوا کسی اخبار نویس کو مصدق نہیں سمجھتے۔ اس لیے جب تک کسی خبر کی مختلف گوشوں سے تصدیق نہ کر لیں اس وقت تک ان کا ذہن مطمئن نہیں ہوتا اور دل کا حال خدا بہتر جانتا ہے۔

القصہ نصر اللہ خاں عزیز، عزیزِ صحافت ہیں۔

☆☆☆☆☆

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری

مجھے خوشی ہے کہ میں نے شاہ جی کے ساتھ اپنی زندگی کا ایک حصہ بسر کیا ہے۔

ان کی شخصیت اُن یونانی فلسفیوں سے ملتی جلتی ہے، جن کی تصویریں عجائب خانوں میں عہدِ عتیق کے انسانی خدوخال پر روشنی ڈالتی ہیں۔

ایک امریکی فلم پروڈیوسر نے ان کی تصویر دیکھ کر کہا تھا۔ ہالی وڈ کے فلم سازوں کو مسیح مقدس کی تصویر کے لیے اس سے بہتر چہرہ نہیں مل سکتا۔

ان کی شخصیت کا سراپا ہندوستانی مسلمانوں کا شاندار ماضی ہے۔ وہ خود بھی ہیں، ماضی ہی کی گونج ہیں۔

ہندوستان میں عوامی خطابت کے اعتبار سے اردو زبان نے آج تک اتنا بڑا خطیب پیدا نہیں کیا۔ وہ کہا کرتے ہیں: "میں لوگوں کی نگاہ سے مضامین چنتا ہوں"۔ انھیں دیس دیس کی بولی آتی ہے۔ وہ مقامی بولیوں میں بھی اسی ٹھاٹھ سے تقریر کر سکتے ہیں جو ان کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ انھیں کمال حاصل ہے کہ وہ مجمع کی رنگارنگی کو اکائی میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ انھیں ہزاروں شعر ان گنت ضرب الامثال بے شمار محاورے اور سیکڑوں تمثیلات زبانی یاد ہیں۔ وہ ایک عظیم خطیب، ایک عظیم انسان اور ایک عظیم بذلہ سنج ہیں۔ ان تینوں کو یکجا کریں تو سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کا ہیولیٰ تیار ہوتا ہے۔

وہ راس کماری سے لے کر سری نگر تک اور خیبر سے لے کر کلکتہ تک شعلے بکھیرتے پھرے ہیں۔ انھوں نے ایک وقت میں دس دس گھنٹے تک لوگوں کو اپنی طلاقت لسانی سے مسحور کیے رکھا ہے اور کئی بار چارپائی پر لیٹ کر تقریر کی ہے وہ کسی نامور مدرسے کے فارغ التحصیل نہیں لیکن ان کے ہاتھ پر علامہ انور شاہ نور اللہ مرقدہ بیعت ہو چکے ہیں اور بڑی بڑی فضیلتوں نے انھیں خراج ادا کیا ہے۔

ان کی دل پسند چیزیں دو ہیں، آواز خوش۔ اور چہرہ خوش۔ ان کی چال حدی خوانوں

کی سی ہے اور اُن کا چلن ہر عیب سے خالی، وہ سونا نہیں کندن ہیں۔

دراز قامت، دوہرا بدن، گول چہرہ، سفید داڑھی، ظالم آنکھیں، طوفانی لہجہ، کوندے تو بجلی، کڑکے تو بادل، اٹھے تو آندھی!

دوستوں کے دوست، بلکہ جگری دوست، دشمنوں کے شریف دشمن، لیکن مدت کے بچھڑے ہوئے بغل گیر ہوں تو شہید گنج کا ملبہ بھی بھول جاتے ہیں۔ الغرض وہ سمجھنے کی نہیں، پیار کرنے کی چیز ہیں۔

☆☆☆☆☆

مہر علم دین

لاہور میں دہلی دروازے کے باہر تانگوں کے اڈے کے عقب میں سیاسی دوستوں کی ایک جمعیت ہر شام اکٹھی ہوتی اور عشا کے وقت گپ زنی کے بعد منتشر ہو جاتی ہے۔ اس پارٹی کے سب سے معمر رکن مہر علم الدین ہیں جو اس وقت ستر سال کے پیٹے میں ہیں۔ صورت شکل وہی ہے جو پہلے تھی۔ یہ بات کسی کے ذہن میں نہیں کہ یہ بوڑھا جب جوان تھا تو اس نے اسلام سے عشق کی پاداش میں سزائے موت کا حکم سُنا۔ مہینوں پھانسی کی کوٹھڑی میں رہا۔ ہائی کورٹ کے مرافعہ میں چھوٹ گیا۔ عمر کے کسی مرحلے میں بھی مدرسہ نہیں گیا، لیکن قومی تحریکوں میں بارہا جیل گیا اور زندگی کا بہت بڑا حصہ قیدِ فرنگ کی نذر کر دیا۔ چودھری افضل حق مرحوم نے ان کی سوجھ بوجھ اور قربانی و استقامت سے متاثر ہو ہمیشہ احرار کی ورکنگ کمیٹی مین رکھا وہ اللہ کو پیارے ہو گئے تو ان کے جانشینوں نے انھیں بُھلا ڈالا، لیکن یہ آج تک انھی کا دم بھرتے ہیں۔

قدر دان ہوتے تو انھیں قومی اعزاز بخشتے اور ان کے بڑھاپے کو اس طرح رینگنے نہ دیتے۔ لیکن ناقدری زمانے کے باعث یہ اور ان جیسے لوگ گئے وقتوں کا غبار ہو چکے ہیں۔ پیچھے مُڑ کر دیکھتے ہیں تو نمودِ غبار ہے، حال پر نظر ڈالتے ہیں تو آہ نارسا ہے۔ مستقبل کی امید پر جیتے ہیں لیکن ان کے لیے ماضی سے لے کر حال تک اس خزاں دیدہ چمن میں کوئی شگوفہ بھی نہیں، اور نہ کسی شاخ پر کوئی غنچہ ہے۔ یہ صرف اس لیے جی رہے ہیں کہ جینا بھی ایک فرض ہے، لیکن ان کے عناصرِ اربعہ اُڑتے اور گھلتے چلے جا رہے ہیں۔ ستر برس کی عمر ہے۔ قد لمبا ہے ابھی تک کوئی خم نہیں، چہرہ کتابی اور گندمی ہے۔ ناک ترچھی، آنکھیں بولتی ہوئیں، فقر و استغنا کا پیکر، بزرگوں کی یادگار، خوردوں کا بزرگ، تُلی تلی بات کہنے سننے کا عادی، وضع قطع کے لحاظ سے درویش، لیکن پچھلے پچاس برس کے سیاسی ہنگاموں کی چلتی پھرتی تصویر!

☆☆☆☆☆

میر علی احمد تالپور

دریائے سندھ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی گزرگاہ بدلتا رہتا ہے۔ قریب قریب یہی حال سندھ کے سیاستدانوں کا ہے۔ راون کی طرح ان کی سیاسی کھوپڑیاں بہت سی ہیں۔ میر علی احمد تالپور نے اِدھر اُدھر گلگشت تو کی ہے لیکن جہاں تھے اقتدار و زمانہ کے باوصف نقشِ قدم ہی کی طرح ہیں۔

قد بحر طویل میں، سراپا غزل، کسی مصرعے میں عیب و تنافر یا حشو و زواید نہیں۔ تمام قوافی ایطائے خفی، اور ایطائے جلی سے پاک ہیں۔ پیشانی سپاٹ، سر کے بال نظم آزاد کے اوزان کی طرح غائب۔ آنکھیں میر کی سی نیم باز ہیں، لیکن بہر حال حسن محمود کے بعد انھی کا درجہ ہے۔ لہجے میں قصیدے کی سی تمکنت، آواز جسم کے مقابلے میں دوہری، تمام سندھی رہنماؤں سے زیادہ صاف اُردو بولتے، لیکن جب ان میں سندھی محاوروں کا پیوند لگاتے تو پیر علی محمد راشدی کی وہ رنگارنگ ٹوپی یاد آجاتی ہے جس کا تماشہ دستوریہ کے اجلاس منعقدہ مری میں "ہم مسلک" دوست دیکھ چکے ہیں۔

دوستوں کے دوست، بلکہ بر روایت دشمنوں کے بھی دوست، صوبہ کے وزیر صحت ہیں، ان کی اپنی صحت تو اچھی ہے۔ اب صوبے کی صحت کیوں کر سدھارتے ہیں! اس کا جواب ہنوز ان کے ذمہ ہے۔

کراچی میں یاروں کے جگری دوست تھے، لاہور میں وزیر ہو کر گم سم ہیں۔ بہر حال، ع

میاں خوش رہو ہم دعا کرتے ہیں

☆☆☆☆☆

بابا علی بخش

علی بخش محض ایک نام نہیں ایک تاریخ ہے۔ علامہ اقبال کی موت کو آج کتنے برس ہوتے ہیں۔ "جاوید منزل" اب ہمارے دوست خواجہ عبدالرحیم بارایٹ لا کے تصرف میں ہے۔ لیکن بائیں رخ کی کوٹھریوں میں ابھی تک بابا علی بخش مقیم ہے۔ آج وہ ایک بابا ہے۔ جھریوں سے لدا پھندا چہرہ سفید بال، پوپلی آواز، دانتوں میں کھڑکیاں کھدر کا تہمد، کھدر کی قمیص، بچہ تھا، جب ان کے ہاں نوکر ہوا جوانی گزاری بڑھاپا بتایا اور اب شاید زندگی کے آخری دن بتا رہا ہے۔

اجنبی ہوں تو وہ انھیں طرح دے جاتا ہے، جان پہچان ہو، تو وہ بڑے تپاک سے ملتا، مصافحہ کرتا' اور پھر اس کا بوڑھا چہرہ مسکرا اٹھتا ہے۔ جیسے کوئی بھولی بسری تصویر آنکھوں کے سامنے آگئی ہے۔ علی بخش اس زمانے سے اقبال کے شب و روز کا خدمت گزار ہے، جب وہ بازار حکیماں میں رہتے تھے، اور جوانی کا سفر طے کر رہے تھے۔

وہ ایک اہم انسانی دستاویز ہے، اس کے دماغ و دل پر وہ تمام سوانح مرقوم ہیں، جو حضرت علامہ پر بیتے ہیں یا جن میں سے وہ گزرتے رہے۔ وہ سب سے مختلف لیکن انمول دولت کا تنہا وارث ہے۔ ایسی دولت، جو اس کی زندگی تک اس کے حافظے میں تر و تازہ ہے اور پھر۔

یک حرف کاش کہ بصد جا نوشتہ ایم

علی بخش کچھ ڈاکٹر صاحب کی باتیں سناؤ، تمھیں تو بہت کچھ یاد ہوگا؟

جی نہیں مجھے اب کچھ یاد نہیں۔ صرف ایک حسرت سی رہ گئی ہے۔ کہ وہ اٹھ گئے، اور میں زندہ ہوں۔ پھر ایک سرد آہ کھینچی اور کہا:

میں تو اتنا جانتا ہوں کہ وہ بہت بڑے آدمی تھے، ان کے پاس بڑے بڑے لوگ آتے، مؤدب بیٹھتے، کچھ کہتے، بہت کچھ سنتے اور پھر چلے جاتے تھے، میں ان کی شروع جوانی

سے ان کی موت تک ان کے ساتھ رہا۔ میرا کام صرف کھانا کھلانا، ان کا حقہ بھرنا، ان کا بستر بچھانا۔ اور ان کے پاؤں دبانا تھا۔

وہ شعر کہتے وقت از خود رفتہ ہو جاتے تھے۔ ان کے چہرے کا رنگ متغیر ہونے لگتا۔ ماتھے پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے موتیوں کی طرح چمک اٹھتے، آنکھوں میں متحرک شعلے کودنے لگتے۔ تمام بدن میں کپکپی طاری ہو جاتی، جیسے رعشہ ہو رہا ہو۔ عموماً پچھلے پہر اٹھتے۔ آواز دیتے۔ میں حقہ بھر دیتا۔ قلم دوات طلب کرتے اور پھر اپنے خیال میں مستغرق ہو جاتے، ان لمحوں میں یوں نظر آتا جیسے خدا سے ہمکلام ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ وہ خدا ہی سے باتیں کیا کرتے تھے۔

ان کا معمول تھا کہ سحر ہونے سے کچھ پہلے جاگ گئے ہیں۔ پانی منگوایا وضو کیا اور مصلی پر بیٹھ گئے۔ تہجد کی نماز اسی خضوع و خشوع سے پڑھتے تھے، جیسے وہ اب سجدے سے اٹھنا ہی نہیں چاہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

شیخ عنایت اللہ امرتسری

بُوٹا قد، چوڑا سینہ، کھلا ماتھا، سپاٹ چہرہ، متحرک آنکھیں، لمبی ناک، جوانی کو ایک کیا نصف قدم پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ لیکن معناً عنفوانِ شباب میں ہیں۔ چپ رہیں تو قبروں سے شرط باندھ لیتے ہیں۔ بولنے لگیں تو ہوا کا فراٹا ماند پڑ جاتا ہے۔

مسلم لیگ کے عروج سے لے کر زوال تک اس کے ساتھ ہیں۔ بسا اوقات یہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ لیگ ہیں یا لیگ شیخ عنایت اللہ ہے؟ بظاہر مذہب و سیاست کی یکجائی کے قائل نہیں۔ بلکہ دونوں کو مختلف آئینوں میں دیکھتے ہیں، لیکن لیگ غالباً ان کے اعتقادات میں سے ہے۔ میں نے پنجاب میں ان سے بڑا پکا اور سچا مسلم لیگی نہیں دیکھا۔ کوئی غرض نہیں، ہر خواہش کی نفی کر رکھی ہے، لیکن لیگ کو اوڑھنا بچھونا سمجھتے ہیں۔ بلکہ ضدی، ہٹ کے پکے۔ شیخ صاحب! اب تو لیگ کو چھوڑیئے۔ اس میں ماضی کے فخر، حال کی رسوائی اور مستقبل کی نامرادی کے سوا کوئی چیز باقی نہیں، تو مسکرا دیں گے۔

آپ ٹھیک کہتے ہیں، مگر

میں نہ تو آئے دن گھوڑا بدلنے کا عادی ہوں، نہ مجھے بستر بدلنے کی عادت ہے اور نہ میں سیاسیات میں مختلف جماعتوں سے متع کا قائل ہوں۔ جس کی جوانی سے لطف اٹھایا، اس کے بڑھاپے سے دغا کرنا ان لوگوں کا کام ہے جنھیں حیدر آباد مرحوم کی زبان میں "دھوپ چھاؤں" کی اولاد کہتے ہیں۔ میں تو غالب کا پیرو ہوں:

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے تبخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو!

خیالات کے اعتبار سے شیخ صاحب کچھ زیادہ "ترقی پسند" نہیں۔ بس جو کچھ مسلم لیگ ہے۔ وہی ہیں۔ آفیسر ہوتے تو بڑے بیوروکریٹ ہوتے۔ بالخصوص پولیس آفیسر ہوتے تو لاہور کا شاہی قلعہ ان کے "استفسارات" سے پناہ مانگنے لگتا۔ اس کی اینٹیں تک چلا اٹھتیں۔

پلستر منجمد ہو کر نوحہ بن جاتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ شہزادوں یا شہزادیوں کی روحیں دہائی دے اٹھتیں۔ مگر قدرت نے انھیں اس اعزاز سے محروم ہی رکھا مسلم لیگ گُل ہے تو آپ بلبل۔ لیگ قافیہ ہے تو آپ ردیف، وہ صبح ہے تو آپ اجالا وہ فقیرنی ہے تو آپ صدا۔ ہماری دعا ہے کہ شیخ صاحب ابدالآباد تک زندہ رہیں۔ لیکن بعض یارانِ ہم سفر ہنسی مذاق میں کہا کرتے ہیں۔ دیکھیں لیگ اور شیخ صاحب دونوں میں سے کس کی روح پہلے قفسِ عنصری سے پرواز کرتی ہے۔ اس رنگارنگی کے باوجود اپنی خوبیوں میں یکتا ناز ہیں۔

اٹھے تو تجلی پناہ مانگا کرے تو خانہ خراب کر دے

دوستوں کے دوست [illegible] کے یار بلکہ غم گسار۔ سردار عبدالرب نشتر کے ساتھ ایسے ایک دو مخلصین بھی جمع ہو جائیں تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ [illegible] لیکن لیگ کو جن لوگوں نے ڈبویا انھوں نے منجدھار میں ملاح و کشتی بدل [illegible] کشتی کے ملاح انھیں پاکستان کے کنارے تک لائے تھے انھیں ازنگے پر لا کر اس طرح پٹخنی دی کہ پتوار جل کر خاکستر ہو گئے اور ملاح اپنے "بال و پر" سمیٹ کر ایک نئے دور کی تصویر دیکھ رہا ہے یا پھر۔

اپنی تسبیح روز و شب کا شمار کرتا ہے دانہ دانہ

الغرض شیخ صاحب کا وجود لیگ کے اس عہد بے دم میں غنیمت ہے جب تک ان کے دم میں دم [illegible] کو ہاتھ میں تھامے رہیں گے۔ اور پھر یہ اس [illegible] کے ساتھ [illegible]

مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ

راجہ غضنفر علی خاں

کبھی غور کیجیے تو آپ محسوس کریں گے کہ مسلم لیگ کی جس ٹیم نے پنجاب میں انتخابات جیتے تھے اور، جن "بڑوں" نے خضر حیات وزارت کا پانسہ الٹا تھا، وہ سب کی سب تتر بتر ہو چکی ہے۔ غضنفر علی خاں ایران گئے، اب ترکی میں ہیں اور مستقبل کی بات خدا جانتا ہے۔ کہ وہ علام الغیوب ہے۔ ملک فیروز خاں نون مشرقی بنگال میں گورنر ہیں، خان ممدوٹ شہنائی کی گونج ہیں افتخار الدین اشتمالیت کا ڈھول ہیں، شوکت حیات صدا بصحرا ہیں، کرامت علی کو موت چاٹ گئی، دولتانہ شمع رہگذر ہے؟

غضنفر ان سب میں بہ لحاظ عمر اور با اعتبار تجربہ بڑے تھے، ان کا لہجہ منجھا ہوا تھا، ایک اچھا خطیب نہ ہونے کے باوجود ایک اچھے خطیب تھے۔ کبھی گھبراتے نہ تھے جو منہ میں آتا کہہ ڈالتے، انھیں اخبار نویسوں سے اور اخبار نویسوں کو ان سے ہمیشہ تعلق خاطر رہا۔ خود بھی ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے تھے کانگرس میں ہوتے، تو ہمیشہ ۱۲۴ الف کا شکار ہوتے لیگ میں تھے لہٰذا ۱۵۳ الف کو بھی طاق پر رکھتے تھے، قد آور ہیں۔ اس لیے طر دان کے سو ... ے، اردو بے تکان بول لیتے ہیں۔ پنجابی میں بجنت ہیں، رہا انگریزی کا قصہ تو متعدد فقرے دواں ہے اور اب تو فارسی بھی بولنے لگے ہیں وہ جو ... ت ... حلق سے نکلی خلق تک پہنچی۔ تو ان کی باتوں پر خوب خوب چسپاں ہوتی ہے۔

مولانا غلام اللہ خاں

پکا موحد، شرک کا اتنا ہی دشمن، جتنا تلوار کو زخم لگانے سے پیار ہوتا ہے، سر تا قدم شمشیر برہنہ، راولپنڈی میں توحید و سنت کا علمبردار، کتاب اللہ کا شیدائی، سنت نبوی کا مبلغ، شاہ اسمٰعیل شہید کی ڈگر کا باوقار مسافر، چہرہ کتابی ناک ہمزۂ وصل، آنکھیں مصحف کا مقدمہ، دانت آبدار، ہونٹ تابدار، وجودمت کدوں میں اذان کی صدا، لب ولہجہ تلوار کی دھار، خود مرد میدان، رزم گاہ میں جوان، لقب شیخ القرآن، فی نفسہٖ برہان، خوف سے بے گانہ، امتوں کی ہلاکت کا شارح، الفاظ میں تیزی، بلکہ نعرۂ رستاخیز، مطالب میں سچائی، لیکن بیان میں طغیانی دعوت تذکیر کا مجسمہ، صحیح الخیال علماء کے چہرہ کی آبرو، افکار و اعمال میں تشدد، مفاہمت و میثاق سے نفور، اکل کھرا انسانؑ، عالم نہ ہوتا تو مجاہد ہوتا، الفاظ کی گولیاں برساتا اور بدعتیوں کے قلعے مسمار کرتا چلا جاتا ہے، حکمران ہوتا تو شرک کے ساز و سامان کو ایندھن بنا کر جلا دیتا، چال میں صلاح الدین ایوبی، ڈھال میں قطب الدین ایبک، مزاج میں شاہی بھی اور فقیری، قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا ایک ورق، سید احمد بریلوی کی سپاہ کا ایک شہسوار جو راولپنڈی کے خرابہ آباد میں جہاد باللسان کے پرچم لہرا رہا ہے اور جس کی اذانیں گرد و پیش کے علاقوں تک چلی جاتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

چودھری غلام عباس

کشیدہ قامت، ادھیڑ عمر، چہرہ پر کچھ شکنیں بااعتبار عمر، اور کچھ شکنیں۔ لحاظ، سیاست، آنکھیں متحرک، پیشانی کشادہ، آواز میں عجز، سادہ طبیعت، سادہ مزاج، سراپا قربانی، سراپا ایثار، قیام پاکستان کے بعد ہری سنگھ کی قید میں تھے آج کل احساسات کی قید میں ہیں۔ جوان بیٹی جموں میں اغوا کی گئی۔ آج کل احمد آباد میں کسی سورما کے تصرف میں ہے، لیکن اس مرد خدا نے، کبھی اُف تک نہیں کی۔ قائدِ اعظم علیہ الرحمتہ نے چاہا کہ اس کے لیے حکومتی سطح پر ہندوستانی سرکار سے گفتگو کریں، مگر گریز کیا اور قائدِ اعظم سے کہا۔ سوال صرف میری بیٹی کا نہیں، ہزاروں مسلمانوں کی بیٹیاں اٹھائی گئی ہیں، وہ آجائیں، تو ان کے ساتھ، اس کو بھی لے آئیے گا۔ اور پھر آج تک انھوں نے اپنی قربانی کی فہرست میں اس سانحہ کو شامل نہیں کیا ہے۔

شیخ عبداللہ اور چودھری غلام عباس پہلے اکٹھے تھے، پھر دونوں کا راستہ الگ الگ ہو گیا۔ شیخ صاحب نیشنل کانفرنس کے قائد بن گئے، اور چودھری صاحب نے مسلم کانفرنس کی نیو اٹھائی۔ آپ نے اپنی عمر عزیز کا بہت بڑا حصہ قید خانے میں بسر کیا ہے۔ ہمت اتنی ہے کہ پہاڑوں سے ٹکر لینے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ اپنے عقائد میں بدرجہ اتم مخلص ہیں، دھن کے پکے ہیں کشمیر سے والہانہ عشق ہے۔ لیکن سالمیت سے بیزار ہیں، آپ انھیں سیاسیات کے اس لق ودق میدان میں لالہ صحرائی کہہ سکتے ہیں۔ نظری سے کہیں عملی ہیں۔

بہار ہو کہ خزاں لاالہ الااللہ

☆☆☆☆☆

غُلام محمد ملک

پہلے وزیر خزانہ تھے پھر گورنر جنرل ہو گئے۔ پاکستان کے دستوری سردار!!......

حمید نظامی کی معیت میں پہلی دفعہ نیاز حاصل ہوا۔ بالا بلند ہیں۔ آفتابی چہرہ ہے۔ آنکھیں اس سن و سال میں بھی...... لیناکہ چلامیں، کی صدا دیتی نظر آتی ہیں، ناک ستواں ہے۔ رخساروں پر کسی قدر گوشت لٹک گیا ہے۔ مگر ان کی تہوں میں آج بھی عمر رفتہ کی چاندنی موجود ہے۔ لہجہ نستعلیق ہے۔ اردو بولتے ہیں تو قاف شین کا جوڑ جوڑ اُبھرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اور جب پنجابی میں ہم کلام ہوتے ہیں تو ککے زیئوں کے محلے کی تمام خصوصیتیں جھلک اٹھتی ہیں۔ عام گفتگو میں مطائبات کا رچاؤ ہوتا ہے۔ بظاہر ہنس مکھ ہیں، بذلہ سنج ہیں۔ حاضر جواب ہیں ان کی زندگی الف تا ی ایک سفر ہے۔ خوشگوار سفر اور انھیں کبھی اختر شیرانی کے اس شعر کو گنگنانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کہ

مسرّت آہ تو بستی ہے کن ستاروں میں
زمیں پہ عمر ہوئی تیری جستجو کرتے

الغرض وہ ایک مسرّت ہیں، ایک تموّج ہیں، ایک قوت ہیں، ایک جوانی ہیں، ایک بڑھاپا ایک دل ہیں۔ دولت کے سینہ میں ہو تو آبگینہ، عسرت کے پہلو میں ہو تو انگارہ!

☆☆☆☆☆

مولانا غلام مرشد

وہ جو علامہ اقبال علیہ الرحمتہ نے کہا تھا:

فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

تو آپ کے قامت احوال پر خوب کھلتا ہے۔ اگر ان کی گرہ کسی چیز سے خالی ہے تو وہ قلندر کے دو حرف لاالہ الا اللہ ہیں۔

آغاز میں بھاٹی گیٹ کی ایک مسجد کے خطیب تھے وہاں سے سنہری مسجد میں منتقل ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد عالمگیری مسجد کے امام بنا دیے گئے اور اب کئی سال سے فقیہہ شہر ہیں۔

کہا جاتا ہے، پنجاب میں ان سے زیادہ علم دین کا شناسا کوئی نہیں ہے۔ لیکن بذاتہ مم کا مزار ہیں۔ کسی اہل اللہ کا قول ہے جس عالم کو امرا کے ہاں جاتے دیکھو سمجھو کہ اس کا ایمان علیل ہے۔

حضرت مولانا اعلیٰ اللہ مقامہ نے سردار سکندر حیات مرحوم و مغفور کے عہد ہمایونی میں قصر وزارت کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف فرمایا تھا۔ تب سے اب تک کوئی دور بھی ایسا نہیں گزرا کہ وزارت آپ کے تبحر علمی کی خوشہ چین نہ رہی ہو۔

سکندر کی موت پر خضر کا دامن تھاما، وہ گئے تو ممدوٹ سے رشتہ مودت استوار کیا، وہ ادنا غفیل ہو گئے تو دفعہ ۹۲ الف کا شرعی جواز پیدا کر دیا۔ وہ خضر لمں ہوئی تو مشیروں سے رسم و راہ پیدا کی، وہ از نچو ہو گئے، تو ان کے جانشینوں سے ناتہ باندھا، وہ بھی ہے تو دولتانہ وزارت سے پینگیں بڑھانا چاہیں، مگر اب کچھ دنوں سے گوشہ نشین ہیں۔ کئی دنوں سے نام بھی سننے میں نہیں آیا۔ خدا کرے خیریت سے ہوں۔ حافظ نے کیا اچھی بات کہی ہے:

معشوق ما بہ شیوہ ہر کس موافق است

باما شراب خورد و بازاہد نماز کرد

ان کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔

محمد بخش مسلم۔ تاثیر مرحوم، صوفی تبسم وغیرہم کہ

یہ شاہکار ہیں تیرے ہنر کے

☆☆☆☆☆

ملک غلام نبی

ملک غلام نبی سیاست کے خارزار میں ایک مدت سے گھوم پھر رہے ہیں لیکن صاف گوئی جس میں کبھی کبھار بقدر ترشی درشت گوئی بھی جھلک اٹھتی ہے۔ انھیں آگے بڑھنے سے روکے ہوئے ہے۔

"میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند"

کی ترت پھرت کی تصویر۔ آنکھیں روشن اور متحرک جن میں جوانی چِناَ.. افتد دانی۔ کے ساتھ ساتھ۔

چمن میں تلخ نوائی میری گوارا کر

کا خار۔ لیکن ہنوز گفتنی میں ناگفتنی کہتا ہوا۔

چہرہ صاف کہ اس پر سیاست کا غبار تک نہیں۔ گویا اختر شیرانی کا کوئی مصرع موزوں رنگ گوراتے شربتی اکھیاں۔ ناک ستواں تے۔ سارا پنڈ دیپے گیا۔

کھلتا ما تھا، جن پر جانی بوجھی کہانیوں کا روپ دمکتا ہے۔ قد لمبا، قرارداد مقاصد سے بھی طویل، جسم سڈول، چال نستعلیق، ڈھال بس

اٹھے تو بجلی پناہ مانگے گرے تو خانہ خراب کردے

لب کاشمیری، لہجہ امرتسری، اردو انگریزی دونوں کے مشاق مقرر بلکہ تیغ برہنہ، پنجابی وارث شاہ کے انداز میں بولتے اور امرتہ پریتم کے اسلوب میں ڈھالتے ہیں

امرتسر نے جن دودھاری تلواروں کو پیدا کیا ان میں محمود غزنوی کی تلوار کہ اس دور کے ہر سومناتی کی تواضع کرتی چلی جاتی ہے۔ شاہ جی امرتسری نہیں بہاری ہیں۔

امرتسر کے مسلمان سیاسی مقرروں میں جن کا نام اور کام گونجتا ہے وہ ہیں سیف الدین کچلو۔ غازی عبدالرحمن۔ منشی احمد دین۔ اور ان سب کی سیاسی راہیں مختلف تھیں۔

مسلم لیگ میں غلام نبی شعلہ جوالہ بن کر اٹھے اور اپنی طاقت لسانی سے نامور

ہو گئے۔ گویا کچلو، غازی اور منشی کا خلا، انھوں نے پورا کیا۔ بے عیب بولتے ہیں۔ بعض دوسرے مقرروں کی طرح ان میں رکھاؤ کے پیوند نہیں ہوتے اور نہ معلم الملکوت کے رووہ احشاء کی طرح انمل بے جوڑ یعنی لمبے لمبے فقروں کے کش لگاتے ہیں۔ سراپا باغ وبہار، دوستوں کے دوست بلکہ دشمنوں کے بھی دوست اور کبھی کبھار دوستوں کے بھی دشمن لیکن غصہ شاعر کا ہے، ادھر مطلع ابر آلود ہوا، اُدھر وصل کیا۔ رومان وسیاست کا ایک دلآویز مرقع۔

ایک زمانے میں ایک مقامی کالج میں ریاضی کے لیکچرار تھے، وہاں یہ مصرعۂ طرح اٹھایا اور دو غزلہ ہو کر سیاست کے سفر کو روانہ ہوئے۔ قدم قدم پر الجھاؤ تھے لیکن چلتے ہی گئے، رکے نہیں۔ کبھی کانٹوں کی چبھن محسوس ہوئی تو آبلوں سے مدارات کی۔

۱۹۵۰ء سے سہروردی کے پنجاب میں معتمد ہیں۔ وہ انھیں عزیز رکھتے یہ انھیں چاہتے ہیں۔ لیکن دونوں میں جگری دوستی بھی ہے۔ جو خصوصیت شیخ مجیب الرحمٰن کو سہروردی سے مشرقی پاکستان میں ہے وہی خصوصیت مغربی پاکستان میں انھیں حاصل ہے۔

میدان سیاست میں ہے دونوں کی فضا ایک

الغرض شیخ حسام الدین کے الفاظ میں (اور یہ الفاظ آپ نے پنجاب عوامی لیگ کی صدارت کے لیے ان کا نام تجویز کرتے ہوئے کہتے ہیں):

جبل استقامت ہیں جنھیں صرصر کی کوئی موج اور طوفان کا کوئی ریلا اپنی جگہ سے ہٹا نہیں سکتا ہے۔

فاطمہ جناح

[illegible] مت بھائی کی باعظمت بہن۔ چال میں طنطنہ، قال میں دبدبہ، سراپا وقار۔ سراپا ضبط۔ بالا بلند [illegible] رخ وسپید نورانی [illegible] میں چھوٹوں کے لیے ملائمت اور بڑوں کے لیے تمکنت۔ وہ [illegible] کے [illegible] وہ ایک آدرش ہو گئیں۔ اور اب "آدرشا" ہیں۔ ان کے سینہ میں [illegible] بقول ابراہیم جلیس کے "پاکستان کا دل دھڑکتا ہے۔ وہ پاکستان کی واحد مرکزی شخصیت ہیں۔ جس سے عوام محبت رکھتے ہیں"۔

انھیں یورپی معاشرے کی ریس میں خاتون پاکستان کہا جاتا ہے۔ لیکن وہ خاتون پاکستان ہی نہیں بلکہ پاکستانی عوام کی ارادت کا مرجع بھی ہیں۔ ان سے ٹکر لینا تقدیر سے ٹکر لینا ہے۔ ان سے قومی لیڈر شپ کے قصر دل آرا کی ایک ایک اینٹ کانپتی ہے۔ جن لوگوں کے تصرف میں "تاج و تخت" ہیں وہ بھی ان کے دروازے پر "سجدۂ سہو" کے لیے آتے ہیں۔ الغرض وہ مشرق و مغرب کے محاسن کا ایک قابل تکریم امتزاج ہے۔ کھلے تو پھول، سمٹے تو دھارا، ابھرے تو چاند اور نکھرے تو افق

جثہ صباحت نازک اور بدن ایک مشت استخواں جس پر حیا اور وفا کی آب چڑھی ہوئی ہے۔

میں جب پہلی دفعہ ان سے کراچی میں ملا تو میرے دل پر ان کا ایک خوف سا نقش تھا۔ دوسری دفعہ لاہور میں ملا تو ان کی عظمت نے خوف کو گھیر رکھا تھا۔ تیسری ملاقات میں مجھے یقین ہو گیا کہ وہ ایک خوف بھی ہیں، ایک عظمت بھی۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایک گنج شائگاں ہیں۔ جس میں قائداعظم کی سیرت کے موتی ڈھکے پڑے ہیں۔ اور کوئی ان موتیوں کو اس صدف سے حاصل کرنے کی جرات نہیں رکھتا۔

فخری ماتری

دھان پان، نازک اندام۔ ماتری کے لفظ ہی سے ان کی قامت کا اندازہ کر لیجیے۔
روزنامہ "ملت" گجراتی کے مدیر۔ اردو میں انگریزی کے پیوند لگا کر بولتے اور انگریزی کو گجراتی کے لہجہ میں ادا کرتے ہیں۔
آنکھیں نیم باز لیکن عشقِ سے خالی۔ سگریٹ مجید لاہوری کے قہقہوں کی طرح پیتے اور دھواں الطاف کی طرح اُڑاتے ہیں۔ بڑے ہی پیارے انسان اور بڑے ہی مخلص ساتھی۔ فطرت نے انھیں مسکرانے کے لیے پیدا کیا اور ہمیشہ مسکراتے ہیں۔
میر کے عہد میں ہوتے تو ۳۷ واں نشتر ہوتے۔ غالب کا زمانہ پاتے تو ممکن تھا کہ غزل کا روپ مختلف ہو جاتا۔ گجرات (کاٹھیاواڑ) میں اقبال کے شاہین۔ فی الحال کراچی میں شاہ عبداللطیف کا یک معرعی بیت جس کی چمپئن پیر علی محمد راشدی کو گھاؤ نظر آتی ہے۔

☆☆☆☆☆

میاں فضل حسین

غالباً اس بارے میں کوئی شخص بھی دو رائیں نہیں رکھتا کہ سر میاں فضل حسین سے زیادہ کائیاں شخص ہندوستانی مسلمانوں کی سرکاری سیاست میں نہیں گزرا ہے۔ مرحوم میاں صاحب نے بڑے بڑوں کو چت کیا۔ ان کے سامنے بڑے بڑے وائسرائے بھی دم نہیں مارتے تھے۔ جب تک وہ زندہ رہے، ان کا ہمہمہ قائم رہا۔ وہ پہلے شخص تھے جنھیں کانگرس کی سیاست کے ہندوانہ برگ وبار نے مایوس کیا اور فرقہ وارانہ سیاست کی راہ پر نکل گئے۔ انھوں نے اپنی پبلک لائف کا آغاز صوبہ کانگرس کی صدارت سے کیا اور پھر کہیں سے کہیں پہنچ گئے۔ وہ اپنے حریف کو کہیں بھی نکلنے نہیں دیتے تھے۔ علامہ اقبال سے وہ ناخوش تھے اور علامہ اقبال ان سے ناخوش۔ وہ ہر شخص کی اس کی طبیعت کے مطابق رام کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص ان کے ہتھے نہ چڑھتا تو پھراڑ نگے پر لاکر وہ پٹخنی دیتے تھے کہ پناہ بخدا۔

سردار سکندر حیات مرحوم، ملک فیروز خاں نون، چودھری ظفر اللہ خاں انھی کے ساختہ پرداختہ تھے۔ آج بھی پنجاب کے بڑے بڑے خاندانوں میں سیاسی مرشد کی حیثیت سے ان کا احترام کیا جاتا ہے حتی کہ خان ممدوٹ کے مکان میں بھی ان کی تصویر لٹکتی ہے۔

بالا بلند، منحنی قامت، پرُرعب چہرہ، تیز آنکھیں، ماتھے پر تدبّر، لہجے میں انتباہ، ان کا کاٹا ہوا سانس نہیں لے سکتا تھا۔ راقم الحروف پنجاب کے ایک صحافی کی معیت میں ان کی موت سے پہلے ان کی عیادت کو گیا تو کہا:

> "دیکھو! میں اپنے اندرونِ خانہ تجربہ کی بنا کر کہتا ہوں کہ مسلمانوں میں کبھی کوئی راز نہیں رہ سکتا۔ جس سیاست میں سازش ہو وہ بالآخر موت کے گھاٹ اتر جاتی ہے"!

اور۔ جب ان کی موت واقع ہو گئی تو پنڈت جواہر لال نہرو نے بیان دیتے ہوئے کہا تھا:

"فضل حسین ہندو کے مقابلے میں مسلمان اور انگریز کے مقابلے میں ہندوستانی

تھا"۔

شیخ فضل کریم

مصافحہ کیجیے محسوس ہوگا ایک نیک نہاد انسان آپ سے ہاتھ ملا رہا ہے، معانقہ فرمائیے معلوم ہوگا ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ آج کل گورنر مغربی پاکستان کے سکریٹری ہیں۔ شاہ کے مصاحب عام انسانوں کو یونہی جینے نہیں دیتے اور درباروں کے حاجب ودربان تو رگِ گل سے بلبل کے پر کاٹتے ہیں لیکن انھیں نہ غرور کی مے لگی ہے، نہ تکبر کا پانی پیا ہے، نہ رعونت کی آگ میں تپے ہیں۔

اور نہ افسری کی ہوا اڑاتے ہیں، فرائض کے سانچے میں ڈھلے ہوئے انسان ہیں، کھرے مسلمان، سچے انسان، لکھا پڑھی عادت ثانی ہے، جو پڑھتے ہیں حافظہ پر نقش ہو جاتا ہے، جو لکھتے ہیں ترازو کی تول ہوتا ہے، دل جوئی ان کا مسلک ہے، صاف گوئی ان کا تیوہ، یاروں کے یار بلکہ غمگسار، دشمن ان کا کوئی نہیں، اگر ہے تو انھیں علم نہیں اور خود کسی کے دشمن نہیں، بہ قول اقبال کہ میں نسیم سحر کے سوا کچھ اور نہیں، جو بالا ہو اس کی عزت کرتے جو ماتحت ہو اس سے محبت کرتے اور جو ساتھ ہو اس کا ہاتھ پکڑتے ہیں، زبان پر جو لفظ بھی لاتے احتیاط کی چھلنی میں چھان کر لاتے ہیں۔ عیب کوئی نہیں، درویشی واستغنا طبیعت میں اس طرح رس گئی ہے، جس طرح اوس کا قطرہ شیشۂ گل میں رچ بچ جاتا ہے، چہرہ کھلی کتاب، سوچتی ہوئی آنکھوں پر عینک جیسے کسی کتاب کا سرنامہ عمر کا اندازہ کرنا مشکل ہے بہر حال اتنی عمر ضرور ہے کہ شاعر طبع آزمائی کر سکتے ہیں، خون میں شرافت، چال ڈھال سے یہ بات نکھرتی اور ابھرتی ہے کہ اس شاخ کا پھول ہیں جو صرصر اور صبا دونوں سے بے نیاز رہتی ہے، شاعر مشرق "عجم کا حسن طبیعت عرب کا سوز دروں" اپنے عہد کے نوجوانوں میں دیکھنے کے متمنی تھے مبداء فیاض نے ان کے عناصر اربعہ میں یہی جوہر رکھا ہے۔ زیادہ گھل مل جائیے اس کا وہ موقع نہیں دیتے کیوں کہ عہدہ ومنصب کی وجہ سے وہ ایک

حصار میں رہتے ہیں، تاہم ان سے مصافحہ و معانقہ کر کے یہ تاثر ضرور قائم ہوتا ہے کہ ہم ایک ایسے شخص سے مل رہے ہیں جس میں غلام فرید کا گداز، بلھے شاہ کی تڑپ، وارث شاہ کا جذبہ، حیدر علی کی امنگ اور سلطان باہو کا سوز ہے۔ ان تمام محاسن و محامد کی آمیزش سے جو شخص تیار ہوا ہے اس کا نام ہے شیخ فضل کریم۔

☆ ☆ ☆ ☆

فہیم بیگ چغتائی

عصمت چغتائی کے چچیرے بھائی تھے۔ آبائی وطن گوالیار تھا۔ لاہور آئے تو پھر یہیں کے ہو گئے۔ پیسہ اخبار اسٹریٹ کے ایک گنوار محلہ میں دو روپے ماہور پر ایک کمرہ لے رکھا تھا۔ تمام وقت وہیں بتا دیا۔ ان کا مکان میر تقی کے روایتی مکان سے کسی طرح کم نہ تھا۔ ایک دفعہ بارش سے چھت کا ایک گوشہ بیٹھ گیا تو جوں کا توں رہنے دیا۔ ایک کونے میں ہدیتہً ملی ہوئی کتابیں اور مختلف رسالے پڑے رہتے تھے۔ دوسرے کونے میں مونج کی چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر ایک توشک پڑی رہتی ۔ می سردی وہیں گزار دیتے۔ بڑے بلند قامت تھے۔ ناک نقشہ مغلئی تھ۔ کسی ا۔ ۔۔ نے عیش کی تصویر تھے۔ اور اس بڑھاپے میں بھی آنکھوں کا جادو بولتا تھا۔

تھے دھان پان، تمام دن پھریرے ں - ے اڑے پھرتے۔ ہاتھ میں سونٹا ہوتا۔ بدن پر عربی جبہ۔ کلام تحت اللفظ پڑھتے تھے۔ انداز اتنا پیارا تھا کہ بڑے بڑے گویے چوکڑی بھول جاتے تھے۔

مزاج میں لڑکپن، لیکن دماغ ہمیشہ عرش پر ہوتا۔ کسی پنجابی کو بجز مولانا ظفر علی خاں کے خاطر میں نہ لاتے تھے۔

کھوسٹ ہو کر بھی عاشق مزاج تھے۔

اچھی صورت بھی کیا بری شے ہے
جس نے ڈالی بری نظر ڈالی

پنجاب کے ایک نوجوان شاعر پر جی جان سے فدا تھے۔ وہ جوان ہو گیا تو کنی کترا گیا۔ آپ ہمیشہ ساتھ رکھنے پر مصر تھے۔ دونوں میں بم چخ ہو گئی۔ فہیم نے سرِ مشاعرہ پڑھا:

بتانِ سنگدل خود کو نہ جانے کیا سمجھتے ہیں
خدا بننے کی سوجھی ہے، ہمیں بندہ سمجھتے ہیں

نوجوان کہاں چوکتا۔ بول اٹھا ؎

جناب شیخ کو پیری میں یہ بڑھس کی سوجھی ہے
کہ اپنے کو جنوں میں قیس کا باوا سمجھتے ہیں

ہزار چاہا کہ نوجوان مذکور سے دوبارہ تعلقات قائم ہوں۔ لیکن پھر بات نہ بن سکی۔ کئی کئی دن روتے رہے۔ بازار میں چلتے تو غش کھا کر گر پڑتے۔ گھنٹوں ان کے مکان کا سونے کرتے۔

اسی اثنا میں پنجابی اہل قلم سے محاوروں کے سوال پر لڑائی ہو گئی۔ انھیں ناز تھا کہ زبان ان کی لونڈی ہے۔ اور وہ گوالیار میں راجوں کے کان ملتے رہے ہیں۔ مگر پہلے ہی داؤں میں ایسے چت ہوئے کہ ہمیشہ کے لیے لاہور چھوڑ دیا۔ اور پھر مرتے دم تک پنجاب کا رخ نہ کیا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

☆☆☆☆☆

۲۲۴

فیض احمد فیض

فیض دنیوی رشتے کے اعتبار سے تو تاثیر کے ہم زلف ہیں ہی۔ لیکن شاید ادبی اعتبار سے بھی ہم زلف ہی ہیں، قامت نقشِ فریادی، لہجہ دست صبا، رنگ سرخ و سپید، آنکھیں "ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں" جثہ لاغر، خودبوے گل، کلام نالۂ دل، اور گرد و پیش دود چراغ محفل۔

میں انھیں اس وقت سے جانتا ہوں، جب وہ "مجھ سے پہلی سی محبت میری محبوب نہ مانگ" الاپتے تھے، بڑے ہی چپ چاپ یعنی محفل آرا، نہ مجلس نواز، اندر ہی اندر سلگنے کے عادی، پہلے پروفیسر تھے، پھر ملٹری میں چلے گئے۔ اور وہاں تعلقات عامہ کے عسکری دفتر میں لیفٹیننٹ کرنل ہوگئے۔ جنگ کے خاتمے پر ملازمت سے سبکدوش ہونا پڑا۔ ادھر پاکستان بن گیا، تو پاکستان ٹائمز" میں مدیر سردبیر بن گئے۔ چند سال ہوئے ہیں راولپنڈی کے مقدمہ سازش میں دھر لیے گئے تھے، اور قید و بند کے ایام گزارتے رہے۔

موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

چہرے پر یاس، آنکھوں میں سوچ، ہونٹوں پر حسرت، بالوں میں ایطا، بظاہر نغمہ، بباطن نوحہ۔

ترقی پسند شعرا کے امام، شاعری میں نئی ہیئت اور نئے تجربوں کے داعی۔ فیض احمد فیض

ایک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

سید قاسم رضوی

قدو قامت کی رو سے پانچ مصرعوں کی ایک غزل، یعنی طول پانچ فٹ سے زیادہ نہیں، شکل و صورت دبدبے سے خالی، لیکن لب و لہجہ دبدبے سے پُر، لیکن اس میں بانکپن ہے خشونت نہیں، گرم ہوتے ہیں سی ایس پی ہونے کی وجہ سے نرم رہتے ہیں خون کی رعایت سے اور ان دنوں کی یاد میں جب اسلامیہ کالج لاہور کے نہ صرف ایک ذہین و فطین طالب علم تھے بلکہ قائداعظم کے شیفتہ، پاکستان کے گرویدہ، طلبہ کے سرخیل اور بیان و خطابت کے میدان میں چاق و چوبند، آبائی وطن انبالہ ہے۔ تعلیمی وطن لاہور، سیاسی وطن ساہٹ سے خیبر تک، اور ملازمتی وطن بہ تلمیح اقبال بخارا نہ سمرقند، وہ زندگی، مانگ کر نہیں لائے بلکہ زندگی کے حصول کی قیمت ادا کی ہے۔ جدوجہد میں سے گزرے، اس کے لیے حالات کی کھکھیڑیں اٹھائیں، طوفانی ریلوں میں سے مسکراتے ہوئے اس مقام تک پہنچ گئے۔ قدرت نے انھیں ہر لحاظ سے باغ و بہار بنایا ہے۔ املا لکھواتے وقت حاکم ہوتے، بولتے وقت سیاستدان، لکھتے وقت، سنا یہ ہے کہ انشاپرداز، اگر اس کوچۂ رسوائی میں نہ آتے جس کا نام سرکاری ملازمت ہے تو بلاشبہ خطابت میں سعر وہوتے یا ڈیما ستھیز، ذہانت میں اتنی پھرتی ہے کہ شب وصال سے شب جدائی کے ٹکڑے جوڑ سکتے ہیں۔ زبان کترنی کی طرح چلتی ہے۔ آنکھیں دبیز شیشوں کے پیچھے سوچتی یا مسکراتی رہتی ہیں۔

حکومت اور اخبارات کے درمیان ہمیشہ کوسی گن کے فرائض انجام دیے۔ خیال یہ ہے کہ قدرت نے انھیں شاعری کے لیے پیدا کیا تھا۔ کنی کترا کر نکل گئے۔ نئی نثر کے معمار ہو سکتے تھے، لیکن اس نازنین سے آنکھیں ہی چار نہ کیں۔ تقریر کو ایاز کی طرح ساتھ رکھنا چاہا لیکن زلف گرہ گیر کا شکار ہوتے ہوتے رہ گئے اور اس سومنات تک جا پہنچے جو سی ایس پی کہلاتا ہے۔ ذہن رسا پایا ہے، فکر میں جودت، اور نظر میں وسعت ہے۔ ماتھا کھلا ہے لیکن کان بھی کھلے رکھتے ہیں۔ مزاج و طبیعت دونوں کے لحاظ سے کھرے بلکہ اکل کھرے مسلمان،

تحریک پاکستان کا تذکرہ لکھیں تو بہت کچھ حوالہ قلم کر سکتے ہیں، لیکن جس ناقہ کے حدی خواں ہیں اس کے وشت کا سفر اتنا لمبا ہے کہ قلم اٹھانا تو ایک طرف رہا، قدم اٹھانا بھی مشکل ہے۔ پاکستان کی حکومت میں اس قسم کے خوبصورت انسانوں کی موجودگی سے احساس ہوتا ہے کہ ہم جس قافلے کے ساتھ چل رہے ہیں یقیناً اس کی کوئی منزل ہے۔

☆☆☆☆
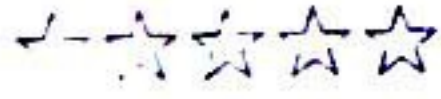
قائد اعظمؒ (محمد علی جناح)

عربی کی کہاوت ہے کہ حسن وہ ہوتا ہے جس کا اعتراف سوکن کو بھی ہو۔ قائد اعظم۔ جہاں تک عقیدت واحترام کے اتھاہ جذبات کا تعلق ہے ہندوستانی مسلمانوں کی ملی سیاست میں منفرد راہنما تھے۔ اس اعتبار سے پورے اسلامی ہندوستان میں کوئی شخصیت ان کی ہم پلہ نہیں ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں نے ان کی سیاسی آواز پر پورے انہماک کے ساتھ لبیک کہا۔ اور وہ اپنے موقف کو رنگارنگ کی مشکلات کے علی الرغم جیت گئے۔ مہاتما گاندھی کا ان کے متعلق قول تھا:

"جناح ناقابل خرید مسلمان ہے"۔

جواہر لال نے اپنی کتاب تلاش ہند میں لکھا ہے:

"ان کی قیادت مسلمانوں کے لیے ناگزیر سی چیز تھی"۔

راج گوپال آچاریہ نے ایک بیان میں تسلیم کیا تھا کہ

"جناح مسلمانوں کے سیاسی رجحانات کا عکاس ہے"

مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک ذاتی گفتگو میں مانا تھا کہ

"قائد اعظم نے اپنے سیاسی موقف کے لئے مسلمانوں کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا دیا ہے"

میں نے پہلی دفعہ انھیں شہید گنج کی تحریک میں دیکھا وہ حکومت پنجاب اور مسلمانان پنجاب میں مفاہمت کی طرح ڈالنے کے لیے آئے تھے۔

لانبا قد، گورا رنگ، مسکراتا ہوا چہرہ، چمکتی ہوئی آنکھیں، لاغر جثہ، خوش لباس اور خوش مزاج، بات نہایت دھیمے پن سے کرتے اور نتیجہ پر نہایت تیزی سے پہنچتے تھے۔ ان کا سراپا ہندوستانی قامت میں یورپی ذہانت کا مرقع تھا اور اس زمانے میں وہ صرف محمد علی جناح

دوسری دفعہ نواب احمد یار خاں دولتانہ کے مکان میں عصرانہ دیا گیا۔ حُسنِ اتفاق سے میں بھی شریک تھا۔ ملک لال دین قیصر انھیں جناح کہہ کر خطاب کرتے تو وہ مسکرا دیتے اس وقت ان کے گرد وپیش میں کچھ ممتاز لوگ نہ تھے۔

تیسری دفعہ وہ مسلم لیگ کی تنظیم کے سلسلے میں لاہور پہنچے۔ مرحوم سر میاں فضل حسین ان کے جلسے کو التوا دینا چاہتے تھے، ایک بزرگ اسی مقصد کے لیے دفتر زمیندار پہنچے۔ کچھ بحث وپز ہوئی، چوں کہ جلسہ کا انتظام حرار رضا کاروں کے ہاتھ میں تھا۔ اس لیے شر پسند عناصر کامیاب نہ ہو سکے بلکہ انھیں آواز تک اٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا، اور سب بے نیل ومرام لوٹ گئے۔ پھر تھوڑے ہی دنوں میں وقت کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔

اب مسٹر محمد علی جناح۔ قائدِ اعظم بن چکے تھے۔ اس لقب کے مجوز لاہور کے ایک زندہ دل نوجوان میاں فیروز الدین احمد تھے۔ جنھوں نے سب سے پہلے پٹنہ کے اجلاس میں ''قائد اعظم محمد علی جناح زندہ باد، کا نعرہ لگایا تھا۔

قائدِ اعظم ہندوستانی سیاست میں صبا کی طرح نکلے ایک زمانے میں موج کی طرح کنارہ کش ہو گئے پھر آفتاب کی طرح اُبھرے۔

قرار داد لاہور کے بعد نصف النہار پر آگئے۔ اور دیکھتی آنکھوں ہر کہ ومہ کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اور پاکستان فی الواقعہ ایک سیاسی معجزہ ہے۔

ان کے نام کے ساتھ جینا کی جو چیپی لگی ہوئی ہے، معلوم نہیں وہ جناح کیوں کر ہو گئی؟ غالباً یہ انگریزی املا کی صوتی غلطی ہے۔ ورنہ جناح کوئی لفظ ہی نہیں اور نہ کوئی ذات یا گوت ہے۔ جناح کے معنی پر، بازو یا ہراول کے ہیں اور جُناح کے معنی ہیں گناہ۔ اصل لفظ جینا ہے جو گجراتی میں دُبلے پتلے اور لانبے کے لیے بولتے ہیں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ بعض بڑے آدمیوں کے نام اُن کی ''اِل'' سے پختہ اور معروف ہو جاتے ہیں۔ مثلاً قطب الدین ایبک اور ایبک ترکی میں چھنگلیا کو کہتے ہیں۔

نہرو، نہ ذات ہے نہ پات، جواہر لال کی اصل گوت کول ہے لیکن چوں کہ اُن کا

خاندان دہلی میں جمنا کی ایک نہر کے کنارے آباد تھا، اس لیے لوگ نہرو پنڈت کہنے لگے۔ اور اب ان کے نام کا جز ہی نہیں بلکہ نام ہی ہے۔ افلاطون کا اصل نام کچھ اور ہے۔ یونانی میں چوڑے چکلے سینے والے کو افلاطون کو کہتے ہیں۔ چوں کہ گھر والے اس کے چوڑے چکلے سینے کی رعایت سے افلاطون کہا کرتے تھے، اس لیے اصل نام تو غتربود ہو گیا اور افلاطون پک گیا۔ ایسے ہی کئی اور تاریخی نام بھی ہیں۔

حرفِ آخر۔ پاکستان قائدِ اعظم کا چہرہ نما ہے۔ جب تک پاکستان زندہ ہے۔ قائدِ اعظم بھی زندہ ہیں، اور پاکستان ہمیشہ کے لیے زندہ ہے۔

قائدِ اعظم پائندہ باد

☆☆☆☆☆

قیوم نظر

کافی ہاؤس۔پاک ٹی ہاؤس۔ چینی لنچ ہوم۔اگر آپ یہاں میز کے گرد دوستوں کے حلقے میں کسی شخص کو غیر شاعر پائیں اور وہ ایکا ایکی آپ کو اپنے قہقہوں کی طرف کھینچ لے۔

غیر مقفٰی قہقہے، طویل بحری قہقہے۔ تو سمجھیے کہ وہ اردو کے نوجوان شاعر قیوم نظر ہیں۔بڑے بھولے بھالے۔لیکن

اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

حلقۂ اربابِ ذوق کے بانیوں میں سے ایک۔ سالہا سال اس کے سکریٹری رہ چکے ہیں۔ پہلے اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب کے دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھے،آج کل گورنمنٹ کالج لاہور میں اردو کے پروفیسر ہیں۔ان میں شاعروں کی سی عادتیں یا شاعروں کے سے آثار نام کو بھی نہیں یعنی وہ کہ خنداروں کی طرح دھان پان نہیں ہیں۔ "لیجیے صاحب! مطلع عرض کرتا ہوں۔" اس سے انھیں سخت نفرت ہے، نہ تو سگریٹ پیتے ہیں، نہ پان کھاتے ہیں۔ شراب نہیں پیتے، اپنے اوپر وحشت مسلط نہیں کرتے۔نہ عم شعر میں اکڑ کے نہیں چلتے۔ہاں طبیعت باغ و بہار ہے۔رقیب کی محفل ہو تو اس میں بھی سر کے بل جاتے ہیں اور دوستوں کی مجلس ہو تو وہاں بھی پلکوں سے جاروب کشی کرتے ہیں۔کسی کے دشمن نہیں۔لیکن دوست چند ہی آدمیوں کے ہیں۔

قد۔ چھوٹی بحر میں ہے، رنگ دھلا ہوا گندمی آنکھیں تیز بھی ہیں اور طرار بھی جیسے ان میں طنزیں چھپی ہوں، آواز ٹھیٹھ پنجابی ہے۔ لیکن کلام میں قدما سے آنکھیں ملاتے ہیں۔

راقم الحروف نے کسی مغنیہ کو کبھی اس کے کسی بول پر روپیہ نہیں دیا۔لیکن ایک دفعہ اس مطلع پر دو چار سر نے ضرور نذر کئے تھے:

زندگی چال چل گئی شاید
موت بھی آ کے ٹل گئی شاید

ایک مدت کے بعد پتہ چلا کہ راقم الحروف جس شعر کو قدما میں سے کسی استاد کا مطلع سمجھتا رہا۔ وہ ہمارے دوست قیوم نظر کا ہے، جو ماں باپ کے گھر میں تو عبدالقیوم پیدا ہوئے۔ لیکن شعر و شاعری نے انھیں قیوم نظر بنا دیا ہے

☆☆☆☆☆

مہاشہ کرشن

یہ کوئی لگی ڈھپی بات نہیں کہ مہاشہ کرشن آریہ سماج کی ایک شاخ کے پرتی ندھی تھے۔

الف تا ی ہندو، مسلمانوں کے مقابلے میں ہندو، اور انگریزوں کے مقابلہ میں نیشنلسٹ، وہ اسی حد تک قوم پرور تھے، جہاں تک انگریزی اقتدار کے بندھنوں کو توڑنے کا سوال تھا، جہاں مسلمانوں کے وجود کا سوال پیدا ہوتا، وہاں وہ سر تاپا ہندو تھے، بڑے ہی خود دار، عمر بھر کسی کے دروازے پر نہیں گئے، سردار سکندر حیات (مرحوم) نے چاہا بھی، لیکن گریز کیا، بڑی سوجھ بوجھ سے لکھتے اور کوئی نہ کوئی بات پیدا کرتے، معمول یہ تھا کہ صبح سویرے اٹھتے، منشی حاضر ہوتا، (عموماً مسلمان منشی رکھتے تھے) خود اخبار پڑھتے یا اس سے پڑھواتے، پھر ٹہلنا شروع کرتے، خود بولتے جاتے، وہ لکھتا جاتا، ایک آدھ گھنٹہ میں اداریے سے فارغ ہو جاتے۔

ان کے اخبار روزنامہ "پرتاپ" کو بہ لحاظ ادارت ہندوؤں میں وہی مرتبہ حاصل رہا، جو مسلمانوں میں ادارتی اعتبار سے "انقلاب" کو حاصل تھا۔ اور بہ لحاظ اشاعت، وہ پنجاب کے تمام اردو اخباروں میں زیادہ چھپتا تھا۔ "پرتاپ" اور "ملاپ" ہندوؤں کے، زمیندار اور انقلاب تھے۔

جن لوگوں کی احوال وکوائف پر نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ "پرتاپ وملاپ" ہی وہ اخبار تھے، جنھوں نے مسلمانوں کے فرقہ وارانہ ذہن کو انگیزا، اگر یہ دو اخبار نہ ہوتے، تو شاید شمالی ہندوستان کی سیاسیات کا رخ مختلف ہوتا، لیکن ان دو اخباروں نے مسلمانوں اور ہندوؤں میں منافرت کی دیواریں کھینچنے میں فی الواقع کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے، ان کے قلم میں آج بھی سیواجی کے گھاؤ چھپے ہوتے ہیں۔

مہاشہ کرشن، قامت دراز نہ پست، جثہ ضعیف نہ مضبوط، رنگ کالا نہ گورا، آنکھیں

کچھ سوچتی ہوئی، لیکن دبیز شیشوں میں ملفوف، سر پہ پگڑی، پرانی وضع کے مہاشے۔ ڈی۔اے۔وی کالج کے گریجویٹ، آبائی وطن وزیرآباد، صحافتی وطن لاہور، شرنارتھی وطن دہلی۔ایک سنگین تماشا دیکھنے کے باوجود ان کے قلم کا زہر ابھی سڑا نہیں۔بلکہ اس کی سڑاند اور بھی جانگسل ہوگئی ہے۔

مہاشہ کرشن۔ مغلوں کے عہد میں پیدا ہوتے تو ہندو بیراگی ہوتے اور ہندو بیراگی انگریزوں کے عہد میں جنم لیتا تو مہاشہ کرشن ہوتا۔اسی خصوصیت سے اس کی "گپتی" اور ان کے قلم کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

کرشنا مینن

۱۹۴۰ء میں لندن کی ایک عدالت میں کسی شخص کا مقدمے پیش تھا۔ اس پر انگلینڈ میں بلا اجازت داخل ہونے کا الزام تھا۔ ملزم کی طرف سے دو وکلا نے مقدمہ کی پیروی کی۔ ان میں سے ایک ہندستانی بیرسٹر کرشنا مینن تھا۔ اس نے بڑی جانفشانی سے مقدمہ لڑا اور جیت لیا۔ وفور مسرت سے خمیدہ سر ملزم ہندوستانی بیرسٹر نے اپنے حصہ کی فیس (چار سو روپے) لوٹا دی۔ ملزم بھونچکارہ گیا۔

"آپ کو فیس ضرور لینی چاہیے۔ آپ نے مقدمے کی پیروی کی ہے۔" موکل نے کہا۔

"مجھے فیس نہیں چاہیے روپیہ میرے کسی کام کی چیز نہیں" وکیل نے جواب دیا۔ اور اس وقت سے اب تک کرشنا مینن میں کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ ۱۹۲۴ء میں جب کرشنا مینن لندن پہنچے تھے تو آپ کی مالی حالت کچھ یونہی سی تھے۔ وہاں آپ نے قانون اور معاشیات کا مطالعہ شروع کیا۔

آج وہی تہی دست طالب علم بھارت کی دوسری بڑی شخصیت اور وزیر اعظم پنڈت نہر کا دست راست ہے۔ کرشنا مینن پانچ سال تک برطانیہ میں بھارت کے ہائی کمشنر رہے ہیں۔ اقوام متحدہ کی اسمبلی میں بھارت کی ترجمانی کی ہے، جنیوا کانفرنس میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اور اب فارموسا کے تصفیہ کے لیے عوامی جمہوریۂ چین اور ریاستہائے متحدہ امریکہ میں براہ راست گفت وشنید کی کوشش کر رہے ہیں!

کرشنا مینن ۵۶ سال پہلے کالی کٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بھی وکیل اور مقامی انجمن وکلا کے راہنما تھے۔ کرشنا مینن کی چار بہنیں تھیں۔ ان کے گھر میں اکثر تصوف زیرِ بحث رہتا۔ ان کے والد کا عقیدہ تھا کہ انسان خدا کے ساتھ ایک خاص قسم کا علاقہ قائم کر کے معرفت کو پہنچ سکتا ہے اور یہ کہ اس کے لیے کسی تقلید کی احتیاج نہیں۔ والدین کے

انھی نظریات کے باعث کرشنا مین مذہبی جذبات میں جنون کی حد کو نہ پہنچے اور کسی بھی مذہب کو دوسرے پر مقدم نہ جانا۔

مدراس یونی ورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری لینے کے بعد کرشنا مین تھیوسوفیکل سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر بسنت کی کوششوں سے اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ پہنچے اور لندن اسکول آف اکنامکس میں داخلہ لیا۔اس جامعہ میں آپ نے مشہور عالم پروفیسر لاسکی سے تعلیم حاصل کی۔

آپ نے شروع شروع میں طلبہ کی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور پھر عملی سیاسیات کے میدان میں اترے۔ ۱۹۲۹ء میں انڈیا لیگ کے جنرل سکریٹری منتخب ہونے اور ۱۵ راگست تک اسی عہدے پر متمکن رہے۔

۱۹۳۹ء میں لیبر پارٹی نے انھیں پارلی منٹ کا ٹکٹ دیا۔ لیکن جنگ کے باعث انتخابات ملتوی ہو گئے۔ ہندوستان کے متعلق لیبر پارٹی کی حکمت عملی سے اختلاف کے باعث آپ پارٹی کی رکنیت سے مستعفی ہو گئے لیکن جب لیبر پارٹی نے اپنی سابقہ حکمت عملی پر نظر ثانی کی تو ۱۹۴۵ء میں پھر لیبر پارٹی کے ممبر بن گئے۔

کرشنا مین کی دشمن اور دوست یکساں تعظیم کرتے ہیں ان کا دل اتنا نرم ہے کہ ان کے بعض دوست خیال کرتے ہیں کہ کہیں لوگ ان کی اس کمزوری ہی سے ناجائز فائدہ نہ اٹھانے لگیں۔ ان کے ایثار قربانی کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جن دنوں برطانیہ میں بھارت کے ہائی کمشنر تھے تو اپنے نائب پسٹ سے بھی کم تنخواہ وصول کرتے تھے۔ شراب کو چھوتے تک نہیں سگریٹ نہیں پیتے، گوشت نہیں کھاتے اور اس پر مستزاد یہ کہ تفریحاً مطالعہ کتب کے سخت مخالف ہیں۔

کرشنا مین ظاہری ٹیپ ٹاپ کے نفرت کی حد تک مخالف ہیں اور اپنے لباس کی طرف سے تو ہمیشہ سے بے پرواہ ہے لیکن اب پہلے کی نسبت قدرے اچھے سلے کپڑے پہنتے ہیں۔ ایک مرتبہ اپنے کسی دوست کے ہمراہ زمین دوز ریلوے اسٹیشن پر چل رہے کہ جوتا کاٹنے لگا۔ کہ آپ نے بڑے اطمینان سے تسمہ کھولا، بوٹ اتارا اور منزل مقصود پر پہنچ کر دوبارہ پہن لیا۔

جن دنوں آپ برطانیہ میں بھارتی ہائی کمشنر مقرر ہوئے تو کسی بھی حلقہ نے گرم جوشی کا اظہار نہ کیا۔ کیوں کہ آپ کی سابقہ زندگی سیاسی ہنگاموں سے عبارت تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ عام ڈپلومیٹوں سے بالکل مختلف ہیں۔

ہائی کمشنر مقرر ہونے کے بعد بھی آپ اپنے کو انڈیا ہاؤس اور انڈیا کلب کے سجے سجائے ماحول میں مدغم نہ کر سکے اور یہ حقیقت ہے کہ اگر انھیں بھارت کی وزارت خارجہ سخت ہدایات جاری نہ کرتی تو آپ بھارتی سفارت خانے میں بھی اپنی "قلندری" اور درویشی کا رنگ جمانے سے باز نہ آتے۔ انھیں پنڈت نہرو کی ذاتی ہدایت تھی کہ "قدرے ٹھاٹھ" سے رہو تاکہ لوگ بھارت کو نادار اور یتیم جمہوریہ نہ سمجھنے لگیں۔ پنڈت نہرو کے سخت اصرار پر کرشنا مینن نے رولز رائس خرید تو لی لیکن اکثر وبیشتر اسے گیراج ہی میں مقفل رکھا۔ اکثر بس ہی میں سفر کرتے۔

کرشنا مینن یاروں کے یار ہیں۔ جنگ کے دنوں میں آپ کا ہاتھ تنگ تھا، لیکن جب اپنے ایک ساتھی کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ خالی جیب اور تنگ دست ہے تو اسے کھانے پر مدعو کیا۔ وہ آیا تو اسے کہا حالت یکساں ہی ہے۔ مگر آؤ ایک ہندوستانی ہوٹل میں چلتے ہیں وہاں ادھار چل سکتا ہے۔ وہاں پہنچے تو ہوٹل کی عمارت نازی بموں کا نشانہ بن چکی تھی۔ دونوں بھوکے سر پکڑ کر ملبہ پر بیٹھ گئے۔ اب جب کہ ان کی مالی حالت پہلے جیسی نہیں رہی انھوں نے اپنے اسی دوست کو سرکاری مہمان کی حیثیت میں بھارت کا دورہ کرنے کی دعوت دی ہے۔

گذشتہ دنوں جب بھارتی پریس میں کرشنا مینن پر لے دے ہوئی اور بعض لوگوں نے ان پر اتہام تراشی شروع کی تو انھوں نے اپنی صفائی میں اتنا بھی نہ کہا کہ۔ مین تو تنخواہ بھی نہیں لیتا۔

بھارت کی اس درویش منش بین الاقوامی شخصیت کا مستقبل درخشاں ہے۔ سیاسی نظریات کے اعتبار سے کرشنا مینن مارکسٹ اور سوشلسٹ ہیں۔ اکر پنڈت نہرو نے وزارت خارجہ کا عہدہ کسی اور شخص کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا تو وہ شخص کرشنا مینن ہوگا۔

☆☆☆☆☆

سردار کریم نواز

کم لوگ جانتے ہیں کہ اس سانچہ میں کون ڈھلا ہوا ہے۔ سردار توان کا خاندانی ورثہ ہے۔ ڈیرہ غازی خان کی ایک بڑی جاگیر دھوا کے سردار کے فرزند ہیں۔ نسلاً بعد نسل رئیس۔ تمام شرافتیں جو سامنتی نظام کے ستونوں میں پائی جاتی ہیں، وہ سردار کریم نواز کو دویعت ہوئی ہیں۔ اس لحاظ سے وہ انسانی خوبیوں کی ایک ترت پھرت تصور ہیں، اور وہ تمام برائیاں جو سامنتی نظام کے چہرے پر برص کے داغ کی طرح ہیں، ان کے قدو قامت اور خدوخال سے خارج ہیں وہ برطانوی عہد ہی میں پی سی ایس ہو گئے تھے۔ کئی عہدوں پر کام کیا۔ پاکستان بنا تو جہاں تہاں انھیں لگا دیا گیا، وہاں تہاں اپنے فرائض حُسن طریق پر سرانجام دیتے رہے۔ اب گجرات کی ڈپٹی کمشنری بھگتا کر لاہور کارپوریشن کے چیئرمین ہیں۔ اس بجٹ گھوڑے پر سواری کرنا آسان نہیں، لیکن گھڑ دوڑ کا لطف اُٹھا رہے ہیں۔ کہنی مار کر نکلنا ان کی عادت نہیں اور نہ طواف کرنا ہی ان کی فطرت میں ہے۔ اگر یہ دو باتیں ان میں ہوتیں تو اس طرح ڈھکے چھپے نہ رہتے لاہور جیسا شہر جہاں کٹ کھنوں کو بھی نمائش کا موقع مل جاتا ہے۔ انھیں ہاتھوں ہاتھ لیتا قدردانی بھی اس شہر میں ہے اور خوشامد بھی خوشامد ان کے منصب کی بدولت ہمرکاب ہوتی اور قدردانی علم و ادب سے ان کے لگاؤ کی بدولت قدم چومتی، گنتی کے لوگ ہی اس راز سے واقف ہوں گے کہ کریم نواز میں ایک عظیم الشان ادیب اور ایک بلند مرتبت شاعر کی بے شمار خوبیاں جمع ہیں۔ آشکارا اس لیے نہیں ہو سکیں کہ جس مقام یا محل کے انسان تھے، اس سے مختلف مقام محل پر لگے ہوئے ہیں۔ ابھی طالب علم ہی تھے کہ ان کے ادبی ذوق کا چرچا ہونے لگا اور اپنی علمی سوجھ بوجھ کے باعث ساتھی طلبہ سے منزلوں آگے نکل گئے۔

احسان دانش ان کی طالب علمی کے زمانے میں شملہ پہاڑی پر چوکیداری کرتے تھے [illegible] نواز نے انھیں "دریافت" کیا اور وہ دیکھتی آنکھوں کہاں سے کہاں پہنچ گئے،

دونوں میں مدۃ العمر اخلاص کا رشتہ رہا، آخر ایک سم کے پھاوڑے یہ رشتہ مجروح ہو گیا۔
سردار کریم نواز آج تک ان دنوں کی یاد سے لطف لیتے ہیں، جب وہ لاہور میں طالب علم تھے اور اس کی صحت یاب سڑکوں پر مٹر گشتی کیا کرتے تھے، اب انھیں ان سڑکوں کے مجروح ہونے کا صدمہ ہے، لیکن اپنے پیش رووں کی طرح ان زخموں کو مندمل کرانے سے قاصر ہیں۔ کیوں کہ یہ سڑکیں کارپوریشن سلمہا کے اعزہ کی بدولت ناتکہ ہو چکی ہیں۔

سردار صاحب نے لاہور میں طالب علمی کا زمانہ ہی بسر نہیں کیا، بلکہ ایک ادبی عہد بتایا ہے۔ اس گمشدہ عہد کے بے شمار ادبی معرکوں کے وہ رازدار ہی نہیں، بلکہ حصہ دار بھی ہیں۔ احسان کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ اختر شیرانی سے دوستانہ علاقہ رہا، فہیم بیگ گوالیاری کے معرکوں میں حصہ لیا۔ جوش نیوٹن ہال کے بورڈنگ ہاؤس میں آتے رہے۔ ساغر صدیقی کو پرکھا، سیماب کو دیکھا، علامہ اقبال سے نیاز رہا، مولانا ظفر علی خاں سے ملاقاتیں رہیں، مہر و سالک سے صحبتیں رچائیں۔ غرض اس زمانے کی ادبی چونچلیں، اور شعری چہلیں ان کی ہمنوائی اور ہمراہی میں اُبھر اُبھر کر نکھرتی رہیں انھیں فرصت نہیں کہ خود قلم بند کریں' حالاں کہ اُن کے قلم میں خود ایک رعنائی موجود ہے اور کوئی جانتا نہیں کہ یادوں کے اس خزانے سے یہ دولت کیوں کر حاصل کی جا سکتی ہے؟ نتیجتہً یہ تمام خوبصورت یادیں قرطاس و قلم کی تشنگی کے باعث ویران ہو رہی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ بعض اسما انسان کی سیرت کے مظہر ہوتے ہیں کریم نواز کے الفاظ میں جو دھیما پن، خوبصورتی، ترنم، سلیقہ، ذہانت، مٹھاس اور شائستگی پائی جاتی ہے، وہ تمام تر ان میں موجود ہے۔

رنگ گورا، قد میانہ، بدن ڈیوڑھا، چہرہ کتابی، آنکھوں پر چشمہ، لیکن اس چشمے کے عقب میں قابلیت اور فطانت، پیشانی نورانی، گفتگو میں روانی، طبیعت میں جولانی، سراپا کہانی اور اپنی ہی زبانی، آپ ان سے بات چیت کیجیے۔ ادب و انشا اور فلسفہ و تاریخ کے عنوانوں پر، آپ حیران ہوں گے کہ آپ کس پایے کے ذہین انسان سے ہمکلام ہیں، جیسے آپ کسی پی سی ایس افسر یا لاہور کارپوریشن کے چیرمین سے بات چیت نہیں کر رہے، بلکہ تاریخ کے کسی استاد،

فلسفے کے کسی پروفیسر، ادب کے کسی شناور، اور انشا کے کسی اُتاروسے مخاطب ہیں
کارپوریشن کی چیرمینی ممکن ہے ان کے لیے خوش دلی کا باعث ہو، (گو اس
پر فائز ہوتے ہی انھیں اختلاج قلب کی چوٹ سہنی پڑی) لیکن اس منصب پر گردوپیش کی
رعایت سے وہ اس طرح ہیں، جس طرح اندھوں کی نگری میں چراغ جل رہا ہو۔

مستغنے درمیان زندیقاں

☆☆☆☆☆

کنہیالال کپور

"سنگ و خشت" کا دیباچہ پڑھ لیجیے۔ آپ کو ان سے ملنے میں وقت کلیف نہ ہوگی۔ "نام کنہیالال کپور، مگر بہت کم احباب مجھے اس نام کی رعایت سے جانتے ہیں، قد چھ فٹ، اہل زبان سا دل ودماغ تو نہیں، البتہ جسم ضرور رکھتا ہوں، چہرے کے نقوش میں سوائے ناک کے اور کوئی چیز ابھری ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ مختصر یہ کہ حلیہ جناب مجاز لکھنوی سے ملتا جلتا ہے۔ سن ولادت جون ۱۹۱۰ء ہے گردش فلک نے ایک جگہ چین سے بیٹھنے نہیں دیا، اس لیے وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میرا مستقل پتہ کیا ہے، کیا ہوگا۔ بزرگوں کا وطن دہلی نہ لکھنو، بلکہ پنجاب ہے، ۱۹۳۴ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔ اے (انگریزی) کا امتحان پاس کیا اور اسی سال سے ڈی اے وی کالج کے طلبا کو انگریزی پڑھا رہا ہوں۔

اردو میں سب سے پہلا مضمون ۱۹۳۸ء میں لکھا۔ عنوان تھا "چینی شاعری" یہ "ادب لطیف" میں شائع ہوا۔ انگریزی میں کبھی کبھی لکھتا ہوں۔ طرز نگارش میں مزاحیہ اور طنزیہ انداز کو ترجیح دیتا ہوں۔

جن ارباب نے مجھے متاثر کیا، ان کی تعداد تین ہے، پطرس، عظیم بیگ چغتائی، کرشن چندر۔ طبیعت ہمیشہ دروغ گوئی اور مبالغہ آمیزی کی جانب راغب رہی۔ چند چیزیں مجھے سخت ناپسند ہیں۔ غسل، ورزش، فلسفہ، خود فریبی، ہمہ دانی اور جملہ اقسام کی کمینگی۔ احباب کا دائرہ کافی وسیع ہے، مجھے اپنے احباب کی چند چیزیں نہایت عزیز ہیں۔ مثلاً

کرشن چندر کا طرز نگارش، راجندر سنگھ بیدی کا خلوص اور معصومیت اور اپندر ناتھ اشک کے قہقہے، دھرم پرکاش آنند کی مسکراہٹ، نریندر ناتھ سیٹھ کے جھوٹ، مولانا صلاح الدین کی تنقید، عاشق حسین بٹالوی کی گفتگو، میراجی کی زلفیں، اور دیوندر ستیارتھی کی ڈاڑھی۔ اور یہ ہے کنہیالال کپور

لیاقت علی خان

یہ مسلمانون کی خصوصیت ہے یا زمانے ہی کی عادت کہ کسی انسان کی خوبیاں اس کی موت کے بعد نوکِ زبان ہوتی ہیں۔ لیاقت علی جو کچھ بھی تھے۔ آج اس پر نقد وبحث فضول ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ عوام میں سے، بیشتر انھیں یاد کرتے اور پھر جی مسوس کر رہ جاتے ہیں۔

اس کو نا قدریِ عالم کا صلہ کہتے ہیں
مر گئے ہم تو زمانے نے بہت یاد کیا

میانہ قامت، کھلتا ہوا گندمی رنگ، آواز میں ٹھہراؤ بھی تھا اور کسی حد تک خراش بھی، جیسے کوئی صوتی تار ٹوٹ چکا ہو، بدن دوہرا تھا۔ کبھی کبھار سیاسی کھلاڑیوں سے الجھتے تو اس میں لذت سی محسوس کرتے تھے۔ لیکن سلجھے ہوئے کھلاڑی اور منجھے ہوئے سیاستدان تھے۔ نھوں نے اپنی ذات کا دبدبہ قائم کر لیا تھا۔ ان میں تمام وکمال قائدِ اعظم علیہ الرحمتہ کے محاسن نہ سہی، لیکن وہ قائدِ اعظم کے نائب ضرور تھے۔ زندگی وفا کرتی تو وہ بہت آگے نکل چکے تھے۔ لیکن ان کی موت نے بہت سے رنگوں کو مدھم کر دیا۔ اور بہت سے خاکے ادھورے رہ گئے۔ ان کی جمہوریت میں بہت سی پہیلیاں تھیں۔ لیکن آج ان کی شہادت ایک عجیب پہیلی ہے۔ اور اس پہیلی کا مفہوم روز بروز عنقا ہوتا جارہا ہے بالفاظِ غالب:

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے

☆☆☆☆☆

شیخ مجیب الرحمٰن

بڑے تیز، بڑے طرار، زبان کترنی کی طرح چلتی ہوئی۔ سرکش گھوڑے کی طرح پیٹھ پر ہاتھ دھرنے نہیں دیتے مٹھی میں ہوا کو تھامتے اور صبا میں گرہ لگاتے ہیں۔ انگریزی فرفر بولتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ملک غلام نبی کا سہروردی کا عکس، رنگ پکا، بلکہ دونوں رنگ پکے۔ جسمانی رنگ بھی سیاسی رنگ بھی:

موت ٹل سکتی ہے لیکن یہ بدل سکتے نہیں

قد لانبا، آنکھیں شوخ، جن پر شیشے چڑھے رہتے ہیں، پارلیمنٹ کے ممبر، بدن چھریرا، چوڑا چکلا سینہ، ارباب اختیار کے لیے ہر لحظہ الٹی میٹم۔ بنگال کے نوجوانوں میں انتہائی مقبول بلکہ محبوب، قید و بند کے آشنا، خوف ان کی چمڑی سے خارج ہو چکا، اور شجاعت ان کے خون میں گردش کرتی ہے۔ جس کے دوست اس کے دوست اور جس کے دشمن اس کے دشمن۔ سہروردی کے انتہائی معتمد، بھاشانی کے جانثار، خیالات میں اشتمالیت کا خروش۔ الغرض حاکمانہ، تہمتوں کے سزاوار، لیکن سراپا ایثار۔ اقبال کے اس مصرعۂ مرصع کی شرحیں

ہے یہاں فرصتِ کردار نفس یک دو نفس

☆☆☆☆☆

مجید نظامی

بھائی کی ہو بہو تصویر، وہی ادا، وہی تیور، وہی ناک، وہی نقشہ، وہی ہیبت، وہی تمکنت۔ مرحوم حمید نظامی چوں کہ پاکستان کے معماروں میں سے تھے اس لیے ان پر مقابلتہً بہت سی چیزیں واشگاف تھیں۔ انھوں نے اپنے لیے ایک ایسی جگہ بنالی تھی کہ انھیں ملک کی سیاست میں سے خارج کرنا ناممکن تھا کہ۔ دوست اُن کا احترام کرتے اور حکمران اُن سے ڈرتے تھے۔ ان گنہگار آنکھوں نے بیشتر وزیروں کو ان کی دربانی کرتے دیکھا ہے۔ حمید نظامی کو موت چاٹ گئی، تو ادارتی "قرعۂ فال" مجید نظامی کے نام نکلا۔ مجید صحافت میں تو ایک زمانے سے بلکہ "نوائے وقت" کے آغاز سے تھے۔ لندن جانے سے پہلے اکثر و بیشتر "سرراہے" کا کالم وہی لکھا کرتے تھے، اور لوگ ان کے مطائبات کو بھی مجید نظامی کے قلم سے منسوب کر دیتے۔ بھائی کی موت نے انھیں "نوائے وقت" کا ایڈیٹر بنادیا۔ وہ لندن میں کئی برس سے رہ رہے تھے نوائے وقت کی رپورٹری بھی کرتے اور بیرسٹری بھی۔ امتحان کا ایک پرچہ بیچ میں ہی تھا کہ بھائی بسترِ موت پر دراز ہو گیا، بھاگم بھاگ لاہور پہنچے۔ بھائی نے موت کو لبیک کہا۔ ان کا لندن لوٹنا منسوخ ہو گیا؛ پھر اسی دشت کی سیاحی میں لگ گئے جو بقول غالب "پیشہ آبا" تو نہیں 'پیشہ برادر' رہا۔ مرحوم نے اس پیشے کو اس ٹھاٹھ سے بالا کیا کہ قلم کی عصمت ماں بہن کی عصمت ہو گئی۔ مجید نے "نوائے وقت" کو ہاتھ میں لے کر بھائی کی روح کو شرمندہ نہیں کیا، بلکہ وہ اس وقت خلد میں مسرور ہو گی۔ دونوں بھائیوں میں معنوی اور صوری اعتبار سے تھوڑا سا فرق بھی ہے۔ ہو بہو تصویر تو وہ "نوائے وقت" کی روایت کے معاملہ میں ہیں، لیکن صوری فرق یہ ہے کہ مجید، بھائی سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ حمید کا فیصلہ دوٹوک ہوتا، وہ اپنے فیصلے کو نافذ کر دیتے تھے۔ اپنے پر بھی اور دوستوں پر بھی، مجید اس معاملے میں بالکل ہی اُلٹ ہیں وہ اس طرح کا دوٹوک فیصلہ نہیں کرتے۔ نہ خود اپنی ذات پر کوئی فیصلہ نافذ کرتے ہیں، نہ دوستوں پر فیصلہ صادر کرنے کے عادی ہیں۔ اُن کا اصول ہے ۔

کیے جاؤ مے خوارو کام اپنا اپنا

سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا

حمید نظامی تجربے نہیں کرتے تھے، جو شخص ایک دفعہ ان کی دوستانہ فہرست سے نکل گیا، غفرلہ ہو گیا۔ مجید نظامی نے بھائی کی اس فہرست پر نظر ثانی کی ہے اور بعض لوگوں کے گناہ بخش دیے ہیں۔ البتہ مرحوم بھائی کے دوستوں سے تعلق خاطر جوں کا توں رکھا ہے اور ان کی کھری کھوٹی باتیں سن لیتے ہیں۔

انگریزی میں ایم اے، لیکن اُردو کے ایڈیٹر ہیں سوادِ خط حمید نظامی سے بہت زیادہ اجلا، اور مصفا ہے۔ نظامی مرحوم ہینڈ رائٹنگ کے معاملے میں پکے راگ کی طرح مشکل تھے مجید نظامی کا سواد خط مالکونس کی طرح کھلا ہوا ہے۔

رنگ نسبتاً سپید، چہرہ گول، آنکھیں روشن بھی اور متحرک بھی۔ نظامی مرحوم نقد و نظر کے اخفا کی خاطر سیاہ چشمے لگاتے تھے مجید نظامی کو اس کی ضرورت نہیں، پیشانی کشادہ، ناک ستواں، دانت نگینے، قامت ایک کالمی یعنی مختصر، بدن دوہرا یعنی دو کالمی، چال میں اداریہ، ڈھال میں سر راہے، طبعاً شریف، نیک نہاد، عیب ہیں نہ عیب کار، یورپ کے طویل قیام نے ان کی عادتوں میں تہذیب و شائستگی کی بعض ایسی خوبیاں پیدا کر دی ہیں کہ اخبار نویس قبیلے میں شاذ ہی ہوتی ہیں۔ نگاہ سے لے کر نفس تک کسی چیز میں خائن نہیں، انگلستان میں علی التواتر رہ کر بھی شراب کا ذائقہ نہیں چکھا، تمباکو سونگھا تک نہیں، ذہانت مشرقی فراست مغربی، اسلام کا شیفتہ، پاکستان کا گرویدہ، خوف خدا کے سوا ہر ڈر سے بے نیاز، غیبت سے متنفر، کھری بات منہ پہ کہہ دینے کا عیبی اور اس عیب کے انسانی قد قامت میں ڈھل جانے کا نام ہی مجید نظامی ہے۔

☆☆☆☆☆
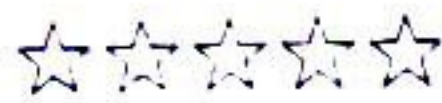
ابو الحسنات سیّد محمد احمد قادری

اپنے والد مولانا دیدار علی شاہ کے جانشین ہیں اور وزیر خان کی مسجد کے خطیب ہیں اور غالباً اس رعایت سے وزیروں کے آگے پیچھے چلتے ہیں تمام عمر تکفیر میں کٹ گئی۔ جب تک انگریز رہا، ان کی نگاہ میں اقبال بھی کافر تھا، ظفر علی خاں بھی کافر، عطاء اللہ شاہ بھی کافر، سیف الدین کچلو بھی کافر۔ ابوالکلام تو خیر اب تک کافر ہے اور ابن سعود سر تاپا کشتنی!

ایک دفعہ آپ نے اور آپ کے بھائی ابو البرکات نے والد فردوس آشیانی کی ہم نوائی میں فتویٰ صادر کیا تھا کہ جو شخص "زمیندار" پڑھتا ہے وہ بھی کافر ہے اور اس کی بیوی کا نکاح فسخ ہو گیا ہے۔ راقم الحروف کی معلومات کے مطابق وہ فتویٰ ابھی تک واپس نہیں ہوا ہے، لیکن "گردشِ دوراں" ہے کہ اب آپ کی تصویریں بھی "زمیندار" میں چھپتی ہیں۔

جہاں تک علم کا تعلق ہے وہ تو ان کے جیب و آستیں میں کبھی نظر نہیں آیا، دیانت کا حال خدا جانتا ہے یا شوکت حیات یا پھر سیّد نور احمد کے محکمۂ اسلامیات کی شہادت ثقہ ہو سکتی ہے۔ البتہ تقویٰ راجبی سا ہے۔ ایک دفعہ آزاد کشمیر کے کسی ٹیلے کو ہاتھ لگا آئے تھے۔ اس دن سے بالالتزام غازیٔ کشمیر کہلاتے ہیں۔ دیکھیے یہ شعر کتنا باموقع ہے:

گل اس بجبہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
وہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

دونوں بھائی حسنات و برکات کے پدر بزرگوار ہیں جب کبھی دراز عبا میں اپنے قد و قامت سمیت تشریف لاتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے۔ نیکی کا دم واپسیں ہے۔

قد سرو ہی کہہ لیجیے۔ جثہ میں داستان امیر حمزہ کی ضخامت ہے۔ لیکن خود قدرے گفتنی، قدرے ناگفتنی۔

خدا کے فضل سے حوروں کے شوہر

☆☆☆☆☆

مولانا محمد اسحاق مانسہروی

ایک زمانے میں محمد اسحاق مانسروی کا طوطی بولتا تھا۔ وہ پنجاب کے خلافتی رہنماؤں میں سر فہرست تھے۔ تحریک خلافت میں جب انھیں گرفتار کیا گیا تو گورا فوج کی ایک پلٹن نے ان کے مکان کا محاصرہ کیا تھا۔ انھیں راتوں رات گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔

اس وقت ان کی عمر اسی برس سے اوپر ہے چوں کہ تمام زندگی تجرد میں بسر کی ہے اس لیے اس سن میں بھی کشیدہ قامت ہیں۔ بظاہر سرخ و سفید چہرہ جوں کا توں ہے۔ لیکن جوانی کا رنگ و روغن بڑھاپے کے ہتھے چڑھ چکا ہے۔

بالا بلند ہیں، آنکھیں متحرک ہیں، لہجے میں کڑک ہے۔ کبھی بگولہ تھے، اب غبار ہیں اور گور کنارے بیٹھے ہیں۔ انھیں گھڑ سواری سے بڑی دلچسپی ہے۔ آج ابھی ان کے پاس بعض خوبصورت گھوڑے اور گھوڑیاں ہیں۔ ان کی خدمت میں شب و روز مشغول رہتے اور اپنی اولاد کی طرح پالتے ہیں۔ ان کا ثانوی وطن راولپنڈی ہے اور ایک زمانہ سے وہیں۔ مقیم ہیں ایک مسجد بنوائی ہے جس میں مدرسہ بھی ہے۔ اس کی نگرانی خود کرتے ہیں۔

انگریزوں نے انھیں سیاسیات سے علیحدہ رکھنے کے لیے بہت جتن کیے، کامیاب نہ ہو سکے۔ بالآخر بعض متمول مریدوں کو جو سرکاری کاسہ لیس تھے، ان کی نگرانی پر مامور کیا۔ اس بالواسطہ تزویر کی بدولت مولانا نے تخلیہ اختیار کر لیا اور اب سالہا سال سے گوشہ نشین ہیں۔

چراغ سحر ہیں بجھا چاہتے ہیں

☆☆☆☆☆

ملک محمد اکبر

کافی ہاؤس لاہور کے قلندروں میں سے ایک آج کل ایڈوکیٹ ہیں۔ پہلے پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ میں شامل تھے۔ جانے طبیعت کیوں لہرائی، اس دانش گاہ کے بعض رستموں کی کھال کھینچ دی۔ ایک کتابچہ لکھا وہ کتابچہ سرکار نے ضبط کرلیا، مقدمہ دائر ہوا، لیکن خارج ہوگیا۔ اس کے مندرجات درست تھے۔ شہادت عنقا ہوگئی۔ نہ مجرموں کو سزا ملی، نہ ملزم کو سزا ہوئی، معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ دونوں اپنی جگہ رہا ہوگئے۔ تاہم انھیں پروفیسری چھوڑنی پڑی۔ وکالت کا امتحان لے کر رفتہ رفتہ ایڈوکیٹ ہوگئے۔ قائدِ اعظم کی اسٹوڈنٹس تحریک کے راہنماؤں میں سرفہرست تھے، طالب علمی کٹی تو سیاسی زندگی اختیار کرلی۔ مین دوستوں میں اکثر دوست دغاباز نکلے، اور دشمنوں میں سبھی خنجر مار آخر بڑے لمبے سفر کے بعد تھک ہار کر اس کوچے ہی سے نکل گئے۔ یوں کہہ لیجیے کہ بھاری پتھر تھا، اٹھ نہ سکا چوم کر چھوڑ دیا۔ قدرت نے انھیں بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ خود دوستوں کے دوست ہیں، کشمیری نژاد تعصب کی حد تک ہیں۔ رنگ گورا چٹا، آنکھیں شوخ وشنگ باتیں، عدالت میں فاضلانہ، دوستوں میں مجنونانہ، نظریۂ پاکستان کے عاشق زار، بلکہ یار غار، بہت اچھے مقرر، لیکن اب حالات کی کھکھیریں اٹھانے کے بعد اس چراغ کو بھی گل کر کے طاق نسیاں پر رکھ دیا ہے۔ جو سلوک علویوں کیساتھ امویوں نے کیا تھا، وہی سلوک اس دور میں ان کے ساتھ یاران سرپل نے کیا ہے۔

خود بھی جوان ہیں اور قلم بھی، زبان گلفشانی گفتار پر مائل ہو تو وہ بھی جوان ہو جاتی ہے، لیکن دل خود اپنے ہی دامن کی ہوا دے کر بجھا دیا ہے۔

☆☆☆☆☆

شیخ محمد اکرام

آئی سی ایس کے افسروں کی بابت قبل از تقسیم یہ روایت عام رہی ہے کہ انھیں اپنی قوم، اپنے ملک اور ان کی روایات سے شاذ ہی لگاؤ ہوتا تھا۔ تمام لوگ انھیں از راہ تعریض کالا صاحب کہتے در یہ اپنے آپ کو انگلستان صاحبوں کا ہم زلف سمجھتے اور اپنے ملک کے لوگوں سے اتنی ہی نفرت کرتے تھے۔ جتنی نفرت کہ کلا یوزادوں کو ہندوستانیوں سے ہوتی، خال خال انگریز آئی سی ایس تو ہندوستانی عوام سے کبھی کبھار التفات بھی برت لیتے، لیکن یہ لوگ کسی پہلو سے انھیں قابلِ توجہ نہ سمجھتے۔ ان کے ذہنوں میں ہمیشہ یہ خیال جاگزیں رہا کہ آئی سی ایس ہو کر، یہ گویا نطشے کے فوق البشر ہو گئے ہیں یا قدرت کی بارگاہ میں اشرف المخلوقات ہیں۔ آزادی کے بعد بھی یہ ذہن (الاماشااللہ) گھٹا نہیں، جن لوگوں کو انگریز اپنے خاص سانچوں میں ڈھال کر چھوڑ گیا تھا، بالخصوص سن رسیدہ آئی سی ایس افسر تو ان کا دماغ آسمان پر رہا۔ گردنیں تنی ہوئیں، بھوئیں چڑھی ہوئیں، آنکھوں پر غضب، لب و لہجہ میں خنجر و سنان، اُردو اینگلو انڈین، انگریزی شکسپیرین، چال میں غرور، ڈھال میں سرور، اپنوں سے وہی نفرت، جو ان کے ضمیر کا حصہ ہے اور محبت بس اتنی جتنی ایک انگریز کو خانساماں سے ہوتی ہے، مصافحے سے اجتناب، معانقے سے گریز، بلکہ ان کے ہاں اس کی ریت ہی نہیں میل ملاقات سے دامن کشاں، سوال کے لیے بیرہ لوگوں سے بولو اور جواب کے لیے میم صاحب کے ہاں ڈالی لے جاؤ۔

شیخ محمد اکرام بھی اسی دور کے آئی سی ایس تھے، لیکن رفقا کی طرح کھاک، نہ اپنی قوم سے بیزار، اور نہ اپنے ملک سے متنفر۔ فی الجملہ اپنی تاریخ کے شیدائی، تہذیب کے داعی، تمدن کے نقیب، ثقافت کے پیکر، اساطیر کے دلدادہ، خود موجِ کوثر، زبان آبِ کوثر اور قلم رودِ کوثر۔ ہندوستان میں آئی سی ایس، اور پاکستان میں سی ایس پی ان کی دستار ملازمت کا طرہ لیکن خود سر تا قدم فہم و نظر کی تصویر طبیعت میں علم کا تحمل، چہرہ پر تفکر کے آثار، مزاج میں

درویشوں کا انکسار، قد میانہ، آنکھیں ذہانت کا چشمہ، ماتھا شرافت کی دستاویز، گفتگو میں رعونت نہ خشونت، سیدھے سادھے بامعنی الفاظ جن میں خدا کا خوف بھی ہے اور علم کی گہرائی بھی، آپ تعارف کے بغیر یہ نہیں جان سکتے کہ یہی صاحب آجکل چیف سیٹلمنٹ کمشنر اور ریونیو بورڈ کے ممبر ہیں۔ اس سے پہلے اوقاف کے چیف ایڈ منسٹریٹر تھے۔ لیاقت علی کے عہدِ اقتدار میں وزارت اطلاعات ونشریات کے سیکرٹری رہے، اور اپنی قابلیت وذہانت کا نقش بٹھا گئے۔

داؤں پیچ کے آدمی نہیں اور نہ اس سے کوئی لگاؤ ہے۔ قلم سے بات کر سکتے ہیں کسی کو گزند نہیں پہنچاتے اور نہ زخم لگاتے ہیں دل، دماغ اور زبان تینوں کو یکساں رکھتے اور ان میں تفاوت پیدا نہیں ہونے دیتے۔ موجِ کوثر، آبِ کوثر اور رود کوثر لکھ کر انھوں نے نہ صرف ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کی عظیم خدمت کی ہے، بلکہ اسلام کو بھی ان جامع کتابوں سے معتدبہ فائدہ پہنچا ہے۔ "غالب نامہ" کے مصنف ہیں۔ ان کے علمی تجزیہ کی نگاہیں اتنی گہری ہیں کہ بے اختیار ان کے تبحر کی داد دینی پڑتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سی ایس پی افسروں کے علمی چہرے کی آبرو ہیں۔ پاکستان مخصوص سیاسیات کا شکار نہ ہوتا تو اس ملک کے بلند وبالا انسانوں میں ہوتے۔ انھیں قومی اور ملکی دوائر میں اعزاز حاصل ہوتے، لیکن علم کے قحط، اور قلم کے زوال نے انھیں گوشہ نشین رکھا اور ان کے مقابلے میں وہ لوگ ممتاز ہو گئے، جو علم سے اتنی ہی نسبت رکھتے، جتنی نسبت کہ شغالوں کو شجاعت سے ہوتی ہے۔ کسی اور ملک میں ہوتے تو وہاں کی حکومت ان کے علم ونظر سے قوم وملک کی خاطر متمتع ہوتی اور اس کی کسی علمی، تاریخی اکادمی کے صدر ہوتے، لیکن علم کے دل پر یہ داغ ہے کہ پاکستان نے ان کی قدر ومنزلت سے روگردانی کی ہے یا پھر وہ اپنے اس تابدار موتی کو پہچان ہی نہیں سکا ہے۔ پاکستان میں لے دے کے چند لوگ ہوں گے جنھیں ان کے قلم کی وجہ سے صدیوں یاد رکھا جائے گا، اور جن کی تحریریں مدۃ العمر زندہ رہیں گی۔ شیخ محمد اکرام بلاشبہ انھی لوگوں میں سے ہیں۔

☆☆☆☆☆

حکیم محمد حسن قرشی

ان حکماء کا صحیح نمونہ بلکہ ہو بہو تصویر، جو یونان میں تھے لیکن جن کی تصویریں اب تصورات سے بنائی جاتی ہیں یا پھر جنھیں اندلس اور بغداد نے اپنے دیدہ و دل میں جگہ دی اور جو آخری دور میں دہلی مرحوم کی آبرو کا سرورق تھے۔ تذکروں کا ایک انسان جو ہمارے سامنے چلتا پھرتا ہے۔ ماضی مرحوم کی ایک تکبیر جو حال کے ایوانوں میں گونج رہی ہے۔ طبیب بھی اور ادیب بھی، معالج ایسا کہ طب یونانی یا طب اسلامی کے نامور حکماء قبروں سے کچھ دیر کے لیے باہر آجائیں اور لاہور کا قصد کریں تو انھیں خوشی ہو کہ ان کی حذاقت و طبابت کا صحیح وارث موجود ہے، ادیب ایسا کہ قلم سے رشتہ جوڑ لیتا تو اپنے وقت کا بہترین انشا پرداز اور وقائع نگار ہوتا، جس عہد کے انسان ہیں وہ عہد ختم ہو گیا ان کے معاصر عمر طبعی گزار کر مولائے حقیقی سے جا ملے قدر دان منوں مٹی تلے سو گئے، خال خال لوگ باقی ہیں جو تاریخ کی انگلی تھام کر چل رہے ہیں زمانہ انھیں نہیں جانتا اور یہ زمانے کو نہیں پہچانتے، پہچانتے ہیں تو اس سے کنی کترا کے نکل جاتے ہیں۔ گفتگو میں جوش نہ خروش اس رکھ رکھاؤ سے گفتگو کرتے ہیں کہ نامور اکادمیوں کے اہل علم یاد آجاتے ہیں، ایک سا لہجہ، ایک سا انداز، الفاظ میں بہاؤ نہ جھکاؤ! طبی نسخوں کی طرح! الفاظ کا اظہار اور ان کا استعمال احتیاط سے کرتے ہیں۔ کوئی سی چیز ناکارہ نہیں ہوتی، ان کے پاس الفاظ، ادویات، خیالات اور جذبات میں سے کوئی سی چیز بھی فالتو نہیں ہے، ہر چیز کا ایک ٹھکانا اور ایک اسلوب ہے، اس سے رتی برابر اِدھر اُدھر نہیں سرکتے۔ جس رفتار سے بولتے ہیں اسی رفتار سے چلتے ہیں ڈاکٹروں اور طبیبوں کی عمر کا اندازہ لگانا بڑا مشکل ہے۔ خیال ہے ستر اور اسی برس کے درمیان ہوں گے لیکن چال ڈھال میں نظم مرصع اور نثر مسجع کا بانکپن ہے۔ کمر میں قدرے خم آگیا ہے، لیکن چہرہ نورانی ہے، داڑھی صحت کا حاشیہ معلوم ہوتی ہے، ماتھا شاعر کا ہے، آنکھیں طبیب کی ہیں، زبان ادیب کی ہے۔ سینہ عاشق کا ہے چوغہ سمرقندی پہنتے ہیں ان کے مرتبہ دانوں میں علامہ اقبال، مولانا

ابو الکلام آزاد اور سردار سکندر حیات تھے، اب زمانہ اشتہار کا ہے اور وہ اشتہار سے اس طرح بھاگتے ہیں، جس طرح چوان لائی کے نام سے جانسن کی طبیعت میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ شفاء الملک ان کا خطاب ہے لیکن نئی پود کے شفاء الملک ان کے فرزند آفتاب احمد قرشی ہیں، جنھیں طبابت ورثے میں ملی ہے۔ آفتاب ایم اے ہیں، طبیہ کالج کے فارغ التحصیل ہیں۔ ذہانت میں باپ کا مکمل عکس، والد کئی ضخیم طبی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جو طبیہ کالجوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ بیٹا کئی نوجوانوں کا مولف ہے جو قومی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے، بلکہ آج بھی اسی اشہب کے شہسوار ہیں۔ کبھی کبھار اس تصور سے جی کانپ اٹھتا ہے کہ آج یہ لوگ ہم میں موجود ہیں تو ہمیں بہر حال ایک سہارا مل رہا ہے، کل یہ لوگ نہ ہوں گے تو کیا ہم ان لوگوں کی معیت میں زندگی بسر کریں گے، جنھیں زندگی پیدا کر کے پچھتا رہی ہے۔

☆☆☆☆☆

چودھری محمد حسین

عام لوگوں کے لیے یہ نام بظاہر اجنبی سا ہے، لیکن چند ہی لوگوں کو معلوم ہے کہ چودھری محمد حسین کون تھے؟ اور کیا تھے؟

لانبا قد، گندمی رنگ، خشخشی داڑھی، باجوہ جاٹ، آنکھیں متحرک چہرہ جھریا چکا تھا۔ لیکن لہجے کے تیور شبنمی ہونے کے باوجود کڑک دار تھے۔ گورنمنٹ پنجاب کی پریس برانچ میں سپرنٹنڈنٹ تھے۔ اور مرتے دم تک اسی منصب پر فائز تھے پرایوں کے زمانہ قدر شناسی سے لے کر اپنوں کے زمانۂ قدر ناشناسی تک سیکڑوں اتار چڑھاؤ دیکھے۔ لیکن اپنی سطح سے ہٹے نہیں۔ ایک ثبات تھے اور ان لوگوں میں سے تھے، جن کے علم و نظر کی وسعتیں معلوم کرکے خوشی ہوتی ہے۔ بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ سرکاری افسروں میں ایسے دیانتدار افسر شاذ ہی پیدا ہوتے ہیں۔ وہ پرائے پانی کی ایک بوند کے بھی روادار نہ تھے لیکن یہ ان کی ذاتی سیرت کا ایک رخ ہے۔ ان کی حقیقی خصوصیت علامہ اقبال سے ان کی ذہنی رفاقت ہے۔ وہ علامہ نور اللہ مرقدہ کے جگری دوست اور علمی بازو تھے۔ علامہ اقبال کے غور و فکر میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اگر اقبال کو مشرق کا کارل مارکس کہنا درست ہے۔ تو چودھری واقعی اینجلز تھے۔ وہ علامہ اقبال کے فکری ارتقا اور شعری مباحث پر ایک ضخیم کتاب لکھنے کا ارادہ کر چکے تھے، بلکہ کلام اقبال پر مستقلاً درس دینے کے لیے بھی رضامند ہو گئے تھے۔ لیکن زندگی نے وفا نہ کی۔ اور دوران ملازمت ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

ان کا سینہ پنجاب کے سربستہ سیاسی رازوں کا دفینہ تھا۔ وہ ہر شخص کی اندرونی تصویر جانتے تھے، لیکن کچھ کہنے سے پہلے۔ سونے کی طرح تولتے تھے۔

راقم الحروف کا سیاسی راستہ اُن سے عمر بھر مختلف رہا۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد تعلقات کا ایک ایسا رشتہ بندھا کہ راقم نے ان کے پیکر میں ایک علمی وجود محسوس کیا۔ ان کی شرافت کے جوہر لحظہ بہ لحظہ تاباں ہوتے گئے۔ اور جب راقم کو "مجلس مرکزیہ اقبال" کا

سیکریٹری منتخب کیا گیا تو یہ انھی کا منشا تھا۔ راقم کے ایک مقالہ پر جو یونی ورسٹی ہال میں پڑھا گیا۔ اتنے خوش ہوئے کہ ان کی مسرت خود میرے لیے سرمایۂ افتخار ہو گئی اور اب تک وہ سرور باقی ہے۔

طبیعت سادہ، مزاج اس سے بھی سادہ تھا۔

ایک زمانے میں پنجاب گورنمنٹ کے اسسٹنٹ سیکریٹری تھے۔ لیکن گھر قلعہ گوجر سنگھ، سے دفتر (سکریٹریٹ) پیدل جاتے یا تین آنے دے کر سواریوں کے ساتھ بیٹھ جاتے تھے۔

ناشروں کا کہنا ہے کہ وہ کلامِ اقبال کی حفاظت خزانہ پر بیٹھے ہوئے۔ اژدھے کی طرح کرتے تھے، علامہ نے انھیں اپنے بچوں، منیرہ سلمہ اور جاوید سلمہٗ کا گارڈین مقرر کیا اور اپنی زندگی ہی میں منیرہ کی شادی کا زیور بنوایا، خود مہریں لگائیں اور بینک میں جمع کرا دیا۔ علامہ کی موت کے بعد اعزہ نے زیور نکلوانا چاہا۔ لیکن چودھری صاحب کسی صورت میں بھی راضی نہ ہوئے۔ حتی کے جاوید اقبال بھی الجھ گیا۔ جب شادی ہونے لگی تو منیرہ اور جاوید کی معیت میں بینک گئے، زیور نکلوایا۔ انھی سے باپ کی لگائی ہوئی مہریں کھلوائیں اور شاید یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہو کہ جب تک منیرہ کی شادی نہیں ہو گئی اور جاوید جوان نہیں ہو گیا۔ چودھری صاحب باقاعدہ، جاوید منزل میں جاتے رہے۔ مگر پانی تک نہیں پیا۔ جب پیاس لگتی تو کوٹھی سے باہر آ جاتے اور بازار میں نل سے پانی پیتے۔ سالہا سال پریس برانچ کے سپرنٹنڈنٹ رہے۔ لیکن کبھی کسی اخبار نویس کے ہاں نہیں گئے۔ کوئی دعوت قبول کی اور نہ کسی دعوت پر یاد کیا۔ ایک دفعہ اس زمانے کے ہوم سیکریٹری مسٹر میگڈانلڈ، اپنے ساتھ ایک بڑے اخبار نویس کی دعوت میں لیجانا چاہتے تھے، لیکن انکار کیا اور کہا کہ

"اس قسم کی دعوتیں فرائض میں مروت پیدا کرتی ہیں"۔

ایک دن ایکا ایکی دفتر چٹان میں تشریف لائے، فرمایا تم نے ایک بات کرنی ہے۔

میں نے کہا ارشاد!

کہنے لگے، اوّل تو کسی سے کہنا نہیں۔ دوم وعدہ کرو کہ پورا کرو گے۔

میں نے کہا بس میں ہو گا تو ضرور تعمیل کروں گا۔

نہایت ہی خشک لہجے میں بولے!

دیکھو، تمھاری تحریر میں، معاشرے کی جگہ سماج کا لفظ بکثرت استعمال ہوتا ہے، اس کا لکھنا اور بولنا ترک کر دو۔

میں کسی قدر متعجب ہوا۔ گذارش کی آپ کی بات سر آنکھوں پر۔ لیکن سماج کے استعمال میں کیا خرچ ہے؟

مسکرائے اور کہا۔

الفاظ بھی انسان کے دماغ پر اثر ڈالتے ہیں۔ اور ان اثرات سے عقیدوں میں ہیر پھیر ہو جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

مرزا محمد حسین

ان کا نام ان کے دوستوں کے سوا تقریباً سب کے لیے اجنبی ہے۔ لیکن جن لوگوں کے لیے وہ اجنبی نہیں ان کے لیے باغ و بہار ہیں۔ انھیں قدرت نے پیکر ہفت رنگ بنایا ہے۔ اُردو کے نثار ہیں جو کچھ لکھتے ہیں، ناپ تول کر لکھتے ہیں، انگریزی کے انشاپرداز ہیں تاثیر کے ادبی نام حجازی کی ہمنوائی مین عین الملک کے نام سے لکھتے رہے۔ اسلامی معاشیات پر ان کی انگریزی تصنیف علم و نظر کے سبھی گوشوں سے خراج حاصل کر چکی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ محمد حسین علم و سیاست کے کسی تکیہ کا شگفتہ کش ہوتا تو اب تک یارانِ سرپل اسے کہیں سے کہیں لے جاتے۔ لیکن وہ ان نوجوانون میں سے ہے، جو دفتروں کے لیے پیدا ہوتے یعنی کلرک ہی پیدا ہوتے اور کلرک ہی مر جاتے ہیں۔ بذلہ سنجی اس کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ وہ بات میں سے بات پیدا کرنے اور الفاظ کے اُلٹ پھیر سے قہقہے تراشنے میں ید طولیٰ رکھتا ہے۔

کافی ہاؤس کی "ثقہ محفلوں" میں اس کا وجود "افکار و حوادث" ہے، اس کی طبیعت میں مزاح کا جوہر ہے۔ اس میں سالک کی ہم نشینی تے بھی۔ میں سالک کی ہم نشینی نے ار بھی نکھار پیدا کر دیا ہے لیکن اسمیں نقل نہیں اصل ہے عمر کوئی چالیس کے لگ بھگ ہے۔ لیکن شادی نہیں کی بلکہ مجرد زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے۔ اپنی تنخواہ کا تین چوتھائی کتابوں کی خرید میں صرف کرتا ہے۔ اس کی ذاتی لائبریری پنجاب کے اہل علم میں پروفیسر سراج الدین کے بعد سب سے بڑی ذاتی لائبریری ہے۔ معاشیات اور اسلامیات کے موضوع پر دُنیا کے ہر گوشہ کی کتاب اس کے ہاں محفوظ ہے۔ آج کل پنجاب ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں سپرنٹنڈنٹ ہے۔ چہرے پر اللہ کا فضل ہے۔ لیکن مہرے سے قیاس ہوتا ہے جیسے ابھی ابھی کسی پرنٹنگ پریس میں طبع ہو کر آیا ہے۔ میانہ قامت، لاغر جثہ گہرا گندمی رنگ، متحرک آنکھیں، سر کے بال غائب، مونچھیں عنقا، داڑھی غفر لہا۔

ضرب الامثال سے لطائف الادب کشید کرنے کا عادی اور خود بھی ایک ضرب المثل۔

چودھری محمد حسین چٹھہ

چودھری محمد حسین چٹھہ کے ہمزاد کا نام پائپ ہے، پائپ کے بغیر ان کا تصور ایسا ہی ہے، جیسا دولتانہ کے بغیر اُن کی شخصیت، وہ صحیح معنوں میں دولتانہ کے لیاقت علی ہیں، لوگ اُنھیں بد مزاج کہتے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے، اس میں کہاں تک صداقت ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہم نے انھیں خوش مزاج نہیں پایا۔ وہ ہر وقت سیریس (SERIOUS) رہنے کی کوشش کرتے ہیں، اور ہیں بھی سنجیدہ۔ قد چھوٹا ہے اور غالباً اس احساس کمتری نے ان میں بالا بلندوں پر ہاتھ اٹھانے کی عادت ڈال دی ہے۔ چندیا کے بال غائب ہیں، یمین و یسار بالوں کی برائے نام جھالریں ہیں، اس طرح جیسے اپنی وزارت کے زمانے میں فائلوں کے کونوں پر نوٹ لکھا کرتے تھے، عینک بھی لگاتے ہیں لیکن ان کی عینک اور ممتاز دولتانہ کی عینک میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ممتاز کی عینک حسن کے لیے ہے، ان کی نظر کے لیے۔ آدمی کھرے ہیں بلکہ اکل کھرے۔ وزارت کی اور ٹھاٹھ سے کی، نئے دور میں بھی وزارت کا قرعہ ان کے نام پر نکلتا رہا، لیکن پرچی کھلتی اور پھٹتی رہی۔ حسین نہ سہی لیکن ذہین ضرور ہیں، بلکہ فطین بھی، ان سے بات کر کے آدمی محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی فہمیدہ انسان سے مل کر آیا ہے عیب ان میں کوئی نہیں، ویسے بے عیب اللہ کی ذات ہے۔ جب تک دولتانہ وزارت میں رہے اُن کے کٹر مخالفوں نے بھی ان کے دامن پر کوئی دھبہ نہیں لگایا۔ ان کے مزاج دانوں کا خیال ہے کہ اپنی ذات کے بارے میں ہمہ دانی کا دھوکا ہے۔ اگر یہ درست ہے تو ہمارے نزدیک یہ کوئی برائی نہیں۔ ہر بڑا آدمی کنج تنہائی میں بیٹھ کر ہمہ دان ہوتا ہے اور اس وقت اپوزیشن جن عناصر کا نام ہے، وہ سب کے سب ہمہ دان ہیں۔ ان میں ایک شوکت حیات ہی قلندر ہیں۔ نام کی تختی کے ساتھ چوہدری لکھا ہوا ہے صحیح املا چودھری ہے۔ خدا جانے اس کی تصحیح کیوں نہیں کی جا رہی؟ غالباً جس بزم کے "شہ دماغ" ہیں وہاں املا پر بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔ چٹھہ ان کی ذات ہے یا ممدوٹ کی طرح گاؤں، اللہ ہی بہتر جانتا ہے، لیکن

ان کے نام کا جزو غیر منفک ہو کر اس طرح چمک اٹھا ہے، جس طرح قائد اعظم کے ساتھ جناح، قطب الدین کے ساتھ ایبک، افتخار حسین کے ساتھ ممدوٹ، اور خان غلام محمد کے ساتھ ٹوند خور۔

☆☆:☆☆

خواجہ محمد رفیق

خواجہ رفیق عوامی لیگ مغربی پاکستان کے سر پھرے نوجوان کا نام ہے۔ یہ سر پھرا مسلم لیگ کے کنبہ میں سے نکلا، عوامی لیگ کے امویون میں چلا گیا، آج کل اپوزیشن کے عباسیوں کی فوج ظفر موج میں اُڑا پھرتا ہے ہر وقت اپوزیشن کی موڈ میں رہتا۔ زبان تیز، طبیعت گرم، مزاج سخت، دل نرم، الفاظ سے گولیاں برساتا، نتیجۃً ہر تقریر کے بعد تعزیرات پاکستان یا اس کی بجولی دفعات کے سیاسی غضب کا شکار ہو کر عدالتوں کی خاک چھاننے لگتا ہے۔

قد درمیانہ ہے، حوصلہ لمبا، جھکنا اس نے سیکھا نہیں، رُکنا اسے آتا نہیں، اس کا نصب العین ہے۔

دب تو سکتا ہوں لیکن میں لچک سکتا نہیں۔

دوستی کے ساتھ آخر وقت تک نباہ دی۔ عادتاً قبیلۂ احرار سے معلوم ہوتا ہے، لیکن عملاً کبھی احرار کے ساتھ نہیں رہا۔ خوف اس کی چمڑی میں نہیں، ہر چہ باد اباد اس کا طغرائے امتیاز ہے۔

ہندو قوم میں ہوتا تو اس کی قدر ہوتی، مسلمان قوم میں ہے لہذا ناقدری بھی قدر کے برابر ہے۔ رنگ گندمی، آنکھیں متحرک، ناک ستواں، چہرہ کتابی، ماتھا دانشور کا، قدم مجاہد کے، عقل سیاست دان کی، حوصلہ دیوانے کا، مغربی پاکستان میں نوابزادہ نصر اللہ خاں کا آچاریہ کرپلانی، چال ڈھال دونوں میں تمکنت، کبھی موٹر پر، کبھی پیدل، ہاتھ کا تنی، سر پہ جینا کیپ، واسکٹ سمیت سوٹ پہننے کا عادی، اس لحاظ سے قدامت پسند، دوستوں کا دوست، دشمنوں کا بھی دوست، لیکن اس حد تک جس حد تک کہ ان کی خواہش ہو، ظاہر و باطن ایک سا، دوستوں کے انتخاب میں غلط کار، باقی تمام تر قربانی و ایثار، اور اسی مخلص نوجوان کا نام خواجہ محمد رفیق ہے۔

☆☆☆☆☆

پروفیسر محمد سرور

ایک باپ کے تین بیٹے تھے۔ کسی نے سوال کیا کہیے کیا کرتے ہیں، تو جواب ملا:

''بڑا لڑکا علی گڈھ میں پڑھتا ہے۔''

سوالی بولا۔ تو سمجھیے وہ دین سے گیا۔

باپ نے کہا: منجھلا دیوبند میں پڑھتا ہے۔

سوال بولا: وہ دنیا سے گیا۔

باپ نے کہا: چھوٹا جامعہ میں پڑھتا ہے۔

سوالی بولا۔ وہ دین اور دنیا دونوں سے گیا۔

بظاہر یہ لطیفہ ہے لیکن پروفیسر سرورؔ پر جو کچھ بیت چکا ہے اور آج کل بیت رہا ہے۔ وہ یقیناً اس سے مختلف نہیں ہے۔ ملک نصر اللہ خاں سے پوچھیے وہ انھیں خیالات کے اعتبار سے کافر سمجھتے ہیں۔ رہا دنیا کا سوال، تو:

نشیمنوں پر بجلیوں کا کارواں گزر گیا

سرور کا صحافت میں وہی مقام ہے، جو سیاست میں عبید اللہ سندھی کا تھا۔ وہ ایک بہت بڑا المیہ ہیں۔

جن دنوں وہ ''امروز'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ میں نے انھی دنوں عرض کیا تھا، نباہ مشکل ہے۔ حسرت کی زد میں آگئے اور نکلنا پڑا۔ ہفت روزہ آفاق نکالا۔ پھر روزنامہ کی طرح ڈالی۔ مگر وہ غاصبوں کی دست برد میں آگیا۔ لاہور میں دوستوں کے داغ سمیٹے اور کراچی چلے گئے

غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

بڑے ہی زود رنج اور بڑے ہی حساس ہیں۔ ایک اور ایک دو کی طرح سوچتے ہیں۔ ان کے کچھ مخصوص نظریات ہیں۔ جن پر ذہنی لحاظ سے ہمیشہ سے قائم ہیں۔ البتہ کبھی

کبھار ضمنی باتوں میں ضرور رائے تبدیل کر لیتے ہیں۔ طبعاً شریف ہیں۔ وہ مار کھا سکتے ہیں۔ کسی کو مار نہیں سکتے۔

ان کا بیان ہے، میں نے دولتانہ کی حمایت میں اپنے قلم کی پوری طاقت صرف کی۔ لیکن میرے ساتھ جو سلوک کیا گیا، مجھے اس کا ملال نہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ مجھے میرے ان "اعمال" کی سزا ملی۔ ان کا کہنا ہے: دولتانہ اپنے ساتھ کسی ایسے آدمی کو دیکھ نہیں سکتا جس کے متعلق اس کو یہ معلوم ہو کہ وہ اس کی باتوں پر سوچ بھی سکتا ہے۔

سرور کبھی صحافی نہ تھے اور شاید اب بھی صحافی نہیں ہیں وہ ایک عالم ہیں۔ ان کا اوڑھنا بچھونا نوشت و خواند ہے۔ وہ ان چند لوگوں میں سے ہیں، جن کے متعلق کسی شبے کے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں یہی چند گنے چنے، پڑھے لکھے لوگ ہیں۔

نکلتا ہوا قد، کشادہ پیشانی، کھلا سینہ، سفید رنگ، آنکھوں پر چشمہ، آواز میں لکنت، قلم رواں دواں، چال بھی بے ضرر، ڈھال بھی بے ضرر۔

حادثوں میں پلے۔ جامعہ دہلی سے تعلیم حاصل کی۔ ازہر (مصر) سے فارغ التحصیل ہیں۔ معاشرے کی نوک پلک کو جانتے ہیں۔ جامعہ میں پروفیسر تھے۔ ملک تقسیم ہو گیا تو پاکستان میں ٹھہر گئے۔ کئی کتابوں کے مرتب اور کئی کے مصنف ہیں۔

میر نور احمد سے ایک چوتھائی حذف کر دیں تو ان کی قامت نکلتی ہے میاں ظہور احمد کی موٹائی میں سے ایک تہائی تفریق کریں۔ تو جثہ بنتا ہے۔ "آفاق" کو دیدۂ یعقوب سے دیکھتے ہیں، اور ان کا سراپا اپنے ماحول کے خلاف ایک شریفانہ طنز ہیں۔

☆☆☆☆☆
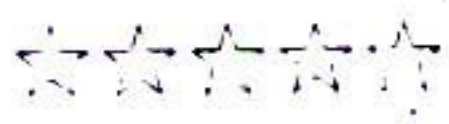
خواجہ محمد شفیع

آیئے ذرا نسبت روڈ (لاہور) پر چلیں، سید مظفر علی شاہ شمسی کے دیوان عام میں عشاء کی نماز کے بعد آپ کو ایک باغ و بہار شخصیت ملے گی، نام ہے ان کا خواجہ محمد شفیع (کشمیر والا) رحیم یار خان روڈ، انار کلی لاہور پر کیمیکلز بیچتے ہیں! رہتے ہیں نسبت روڈ کی کسی گلی میں آج تک اپنا مکان کسی کو دکھایا نہ بلایا، کھلانے پلانے کے قائل نہیں، خود بھی کسی کے دستر خوان پر نہیں جاتے، لیکن ہر محفل کی رونق اور ہر مجلس کی آبرو ہیں۔ آبائی شہر کاشمیر آزادی سے پہلے امرتسر میں رہتے اور دہلی میں کاروبار کرتے تھے۔ تمام عمر سیاسیات سے دلچسپی رکھی، ہر بڑا لیڈر ان سے بے تکلف اور یہ ہر بڑے لیڈر کی ناک کا بال، عملاً کسی جماعت میں نہیں رہے۔ احرار کے اکابر سے انھیں تعلق خاطر تھا، جو آج بھی ہے۔ ہر بڑے چھوٹے سیاسی راہنما کی داخلی کمزوریوں اور خارجی خوبیوں سے آگاہ ہیں، اس دور کے سبھی اخبار نویس ان کے شیدائی اور یہ ان کے فدائی ہیں۔ جس محفل میں بیٹھ جائیں مصرع طرح اپنے ہاتھ میں رکھتے ہیں پھر دوستوں کی طبع آزمائی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ ان کی سرد و گرم باتوں سے دوستوں میں رونق رہتی ہے۔ کوئی شخص ان کے کسی تیز و طرار فقرے کا شاکی نہیں ہوتا، زخم کھا کر بھی خوش ہی رہتا ہے۔ ان کے بعض کھرے اصول ہیں، جن کے سختی سے پابند ہیں۔ دھوکا کھاتے نہ دیتے ہیں، انسانوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ اکل کھرے مسلمان ہیں۔ جوانی کیوں کر گزری؟ دہلی مرحوم جانتی ہے، لیکن لاہور نے انھیں، صوم و صلوٰۃ ہی کا پابند پایا ہے۔

قد کشمیر شال کی طرح لمبا ہے، رنگ ہفتہ روزہ چٹان لاہور سرخ و سپید، آنکھیں اس عمر میں بھی کہ پچاس سال سے اوپر ہو گئے ہیں، نشہ آور ہیں، بھویں تنی ہوئیں، چہرہ کتابی، ٹوپی اور اچکن میں ہوں تو نواب صدیق علی خان معلوم ہوتے ہیں۔ معمول کے مطابق شلوار اور کرتا پہن رکھا ہو تو محسوس ہوتا ہے کسی غیبی طاقت نے سعادت حسن منٹو کو کھینچ تان کر دو گنا کر دیا ہے۔ کوئی عیب نہیں، دامن ہر داغ سے پاک ہے، لیکن موج میں ہوں تو نہ

گپ مارنے سے چوکتے ہیں اور نہ لطیفہ چھوڑنے سے ہچکچاتے ہیں۔ غرض بہت سی انسانی خوبیوں کا مرقع ہیں۔

☆☆☆☆☆

مفتی محمد شفیع

دیوبند کے دور افتادہ قافلہ کا سر خیل، قد کوتاہ نہ دراز، سر تاپا پاکباز، گمشدہ زمانوں کے راست باز علماء کی ایک جیتی جاگتی تصویر، قرن اول کی سادگی کا نمونہ، طبیعت میں حلم، مزاج میں علم، مزاج میں انکسار، زبان میں شرینی، ادب و دین کا مرقع، حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کا مرید لیکن درباری نہ سرکاری، علم کا رسیا، قرآن کا شیدا، حدیث کا شائق، فقہ کا نباض، بیان میں پیچ نہ قلم میں خم، فقید المثال اساتذہ کا شاگرد اور نامور شاگردوں کا استاد، چہرہ مہرہ شرفت کی دستاویز، کم سخن و کم آمیز، دل خوف غیر اللہ سے خالی، دماغ غور و فکر کا خزینہ، عیب بینی اور نکتہ چینی سے بیزار، دوستوں کی چوٹوں سے جی خوش کرنے والا اور دشمنوں کے وار کو ہنسی خوشی سہہ جانے والا، مرنجاں مرنج، آنکھوں میں علم و حیا کا رنگ و نور، عمر کہولت کی منزل میں زندگی چشمہ صافی، بے شمار دینی رسائل کا مولف، احتشام الحق مولانا یہ مفتی، شیخ سے رشتے کی ہمرنگی کے باوجود دونوں میں زمین و آسمان کا فرق، مولانا احتشام الحق شاد یہ فقیر، وہ غنچۂ لب بستہ یہ کھلا ہوا پھول، وہ تھانے دار یہ خاکسار، عاجزی مسلک، انکساری مشرب، محبت ان کا طغریٰ ہے، اخلاص ان کا امتیاز، رسول اللہ کے عشق میں ڈوب کر اپنے آپ کو کھو دینے والا، ایک درخشندہ چہرہ جو اس یقین کے ساتھ جی رہا ہے کہ اپنی ہر سانس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کے روبرو جواب دہ ہے۔

☆☆☆☆☆

میاں محمد شفیع

آج کل ایڈیشنل سیکرٹری پلاننگ مغربی پاکستان اس سے پہلے ڈپٹی کمشنر لاہور، اس سے پہلے سرگودھا کے ڈپٹی کمشنر، بڑے دنوں لاہور کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر رہے پاکستان بنا تو ملتان کے ڈپٹی کمشنر ہو گئے۔ خدا معلوم پی سی ایس کے اشہب پر سوار ہو کر کہاں کہاں نہیں پہنچے۔ جہاں گئے بطور افسر کے اپنا خلوص چھوڑ آئے، بطور انسان کے اپنی شرافت کا نقش بٹھا آئے، بطور مسلمان اپنا سوز تقسیم کر آئے۔ قدرت نے انھیں درویش پیدا کیا تھا۔ والدین نے پڑھا لکھا کے افسر بنوا دیا۔ یہ افسر ہو کر بھی انسان ہی رہے۔ ان کے نزدیک مسلمان ہونا انسان ہونے سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ بحمد اللہ کہ عناصرِ اربعہ کے اس پیکر میں ایک مسلمان ہے۔ قد پکے راگ میں ہے یعنی لمبا' عمر پچاس سے آگے نکل چکی ہے لیکن چہرہ پر ابھی تک جوانی کی رونق ہے۔ پلکیں گھنی ہیں۔ آنکھیں متحرک، داڑھی غائب۔ مونچھیں حاضر، زبان نفیس، لہجہ رئیس، شرافت رگ و ریشہ کا جزو غیر منفک ....

نہ گلا ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ، کا عنوان جلی، ادب سے والہانہ لگاؤ، مذہب سے بلا کی شیفتگی، شاعری کا رسیا، تیر و نشتر کا حافظ، مصوری کا اداشناس، موسیقی کے خم و پیچ کا شناسا، آوازِ خوش کا فریفتہ، صاحب زبان اور صاحب قلم، مجلسی خدمات کے نجد کا مجنوں، ہر کہ و مہ کے نزدیک احترام و محبت کا مستحق، یاروں کا یار بلکہ غمگسار، دشمنوں کا بھی دوست، بلکہ فیض رساں، پہلو میں دھڑکتا ہوا دل، رگوں میں ہر آنچ سے محفوظ لہو، بدن مجلد، نفس کی ہر آلودگی سے مصفا، نگاہوں میں حیا، بہت سے شریفانہ الفاظ کی بولتی چلتی لغت (تانیث کے لیے راقم معافی چاہتا ہے)، اخلاقی قدروں کا مرقع، سیاسی لقندروں کا کشتہ، اور ادبی ہم نواؤں کا سرخیل، علامہ اقبال عمر بھر جن نوجوانوں کی تلاش میں سرگرداں رہے، ان نوجوانوں میں سے ایک۔ پنجابی مادری زبان اُردو قومی اور اس کی ہر ادا کا دلدادہ، انگریزی محکمانہ، زبان الفاظ کے استعمال میں طبیب، یوں کہیے کہ پنجابی زبان ان کی خانہ زاد ہے، اُردو منکوحہ، فارسی

محبوبہ، عربی، اقلیم السنہ کی خاتون اوّل اور ارادت کا محور، انگریزی ممنوعہ، ان زبانوں کے شاعرانہ محاسن ان کے حافظہ کا خزانہ، پی سی ایس نہ ہوتے تو ادیب ہوتے، خطیب ہوتے، شاعر ہوتے۔ مصور ہوتے یا پھر ان سب کے جامع، اور اب ان سب کے کمال فن کا انسانی قد و قامت میں اظہار ہیں اور یہی وہ خوبی ہے جسے اقبال نے عرب کے حسنِ طبیعت اور عجم کے سوزِ دروں سے تعبیر کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

چودھری محمد علی

چودھری محمد علی کا نام آتے ہی دو چیزیں سامنے آتی ہیں، ایک ان کی ذہانت اور شرافت، دوسرے اُن کا پہلودار ذہن اور وار کرنے کی صلاحیت۔ ان دونوں خوبیوں میں اپنی نظیر آپ ہیں۔ جہاں تک اُن کی ذہانت کا تعلق ہے اُس کا اقرار مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی کیا ہے اور جس حد تک شرافت کا معاملہ ہے، ہر شخص شاہد ہے۔ شریف نہ ہوتے تو سکندر میرزا جیسے دنی الطبع انسان سے مار کھا جاتے اور کراچی کی دو تاوی تکلوں سے کٹ کے پنجاب چلے آتے رہا پہلودار ذہن کا سوال تو اس کی داد میاں ممتاز دولتانہ اور میاں مشتاق احمد گورمانی دے سکتے ہیں۔ اول الذکر ہوا میں گرہ لگا آتے ہیں۔ ثانی الذکر اڑتی چڑیا کے پر گنتے ہیں۔ چودھری صاحب جب تک اقتدار میں رہے، روایت یہ رہی کہ ان کا مارا ہوا سانس نہیں لیتا، لیکن جن لوگوں کو بروایت انھوں نے مارا، وہی آج سیاسیات کے ویرانے میں ٹاپتے پھر رہے ہیں۔

قد لمبا، ماتھا کھلا، آنکھیں روشن اور تیز لیکن عینک کے لفافہ میں بند، ناک ستواں رنگ صاف، تھے افسر نکلے مدبّر، جہاں پیشہ ور سیاسی لوگوں نے دم توڑ دیا وہاں انھوں نے چراغ جلایا۔ افسوس اِن میں جنتا کا لیڈر بننے کی صلاحیت بالکل نہیں۔ تاہم ایک عدد جماعت کے سرخیل ہیں۔ نام اس کا "نظام اسلام" ہے۔ دفتر بھی ہے اور اس میں میز کرسیاں لگی ہوئی ہیں لیکن سیاسی رونق نہیں۔ اور نہ پیدا ہی ہو سکتی ہے کیوں کہ چودھری صاحب اپنی پارٹی کے معاملے میں بھی ذات برادری کا رکھ رکھاؤ ملحوظ رکھتے اور ارکان کے انتخاب میں دولہا کے انتخاب کی طرح احتیاط برتتے ہیں۔ زندگی بھر ایک ہی نہج رہی ہے۔ دامن آلودہ نہیں، صاف ہے۔ بات ناپ تول کر کرتے اور چار چول چوکس کرتے ہیں۔ اقبالؒ سے انھیں عشق ہے، لیکن ان کے عشق میں غلام احمد پرویز کی سی انا نہیں ہے۔ ان کا اقبال سب کا اقبال ہے۔

اور اسی اقبال کا دم بھرتے ہیں۔ حساب کتاب کے آدمی تھے، حساب کتاب کرتے رہے اور حساب ہی میں وزارت سے غفرلہ ہو گئے۔ ان کا حساب کتاب سے لگاؤ، کئی معرکوں میں کام آیا ۔ مثلاً بر صغیر کی تقسیم کے وقت، سیاستدانوں میں تفریق کے وقت، صوبوں کو جمع کرتے وقت اور اب اپوزیشن کی ضرب کے وقت ضرب و تقسیم اور جمع و تفریق ہی کے آدمی نہ ہوتے تو بے شبہ مغربی پاکستان کے عظیم لیڈر ہوتے، کیوں کہ لیڈر ہونے یا لیڈر رہنے کے لیے قابلیت و فراست کے علاوہ سیادت و قیادت کے جوہر کا وافر ہونا بہت ضروری ہے۔ افسوس کہ یہ آخری مہرہ ان کے ہاتھ نہیں آیا اور ہاں کے جتنے کی طرح یہ پہلو کمزور رہا۔ بہر حال چودھری محمد علی تحریک پاکستان کا ایک ایسا باب ہیں کہ ہم انھیں نظر انداز کر کے نکل نہیں سکتے ہیں۔

☆☆
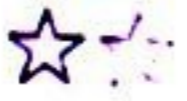
مولانا محمد علی

یہ شاردا ایل کے زمانے کا ذکر ہے، مولانا محمد علی، میاں فیروزالدین احمد کی معیت میں شاہی مسجد لاہور میں تشریف لائے اور فرش پر بیٹھ گئے۔ جمعہ کی نماز ہو چکی۔ ایک صاحب نے اعلان کیا۔ مولانا ظفر علی خاں کی صدارت میں جلسہ ہو رہا ہے۔ مولانا محمد علی فرش پر بیٹھے رہے، دوچار فرمایشی نعروں کے بعد مولانا ظفر علی خاں نے صدارتی کرسی پر نزول اجلال فرمایا۔ تلاوت قرآن مجید کے بعد، ایک صاحب نے نظم سنائی۔ ظفر علی خاں اٹھے، خطبہ مسنونہ پڑھا۔ ان میں جوانی کا کس بل باقی تھا۔ ہاتھ میں چھڑی، سر پہ ترکی ٹوپی اور ٹوپی میں پھندنا۔ جس تیزی سے تقریر فرماتے، اسی سرعت سے پھندنا گھومتا۔ گویا بیز دہ صد سالہ روایات گردش میں ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے مولانا محمد علی پر کوئی آوازہ کسا، فیروزالدین احمد نے اڑنگا دیا، ظفر علی خاں پٹخنی کھانے سے پہلے، ذہنی سنبھالا لے کر اٹھے، اور طیش میں آ گئے:

"اگر آپ نے رویہ نا بدلہ تو میں مولانہ حبیب الرحمن لدھیانوی سے کہوں گا کہ وہ حقائق کے چہرہ کو ننگا کر دیں"۔

اور پھر اس کے بعد، ہت تیرے کی دھت تیرے کی۔ ہت تیرے کی دھت تیرے کی۔ ظفر علی خاں یہ جاوہ جا۔ محمد علی منبر پر پہنچے اور زناٹے کی تقریر جھاڑ ڈالی۔ ان کی ٹوپی کا نقشہ تو یاد نہیں رہا کہ کس قطع کی تھی، لیکن بدن پر چغہ تھا، کھچڑی داڑھی، اور قد بالا ہی تھا۔ رنگ میں کسی قدر سانولا پن آ چکا تھا۔ لیکن آنکھیں تیز بھی تھیں اور معنی خیز بھی۔ یاد نہیں رہا انھوں نے کیا کہا اور کیا نہیں مگر اتنا ضرور یاد ہے کہ ان کی باتیں پہلو دار تھیں۔ ا ر یہ تھا محمد علی کا پہلا مشاہدہ!

دوسری دفعہ انھیں لاہور کانگرس کے موقع پر خلافت کانفرنس کی صدارت فرماتے دیکھا۔ ان کا جلوس بھی جواہر لال کے مقابلے میں نکالا گیا۔ لیکن اس میں سج دھج کا وہ

روپ نہ تھا، جو جواہر لال کے جلوس میں تھا۔ اور ظاہر ہے۔ کہ اس میں دونوں قوموں کے معاشی فرق کو دخل تھا۔ راقم الحروف کا ذہن غیر شعوری طور پر کانگرس کی طرف تھا، لیکن محمد علی کی تقریر کے سحر نے ایک لحظ کے لیے دل ودماغ کو جھنجھوڑا، اور عام مسلمانوں کو تو انھوں نے اپنے ہی سانچے میں ڈھال لیا، تقریر کیا تھی۔ ایک دریا بہہ رہا تھا، رواں، دواں کٹے ہوئے فقرے، چبھتے ہوئے معانی، بے بہا بندشیں، بر محل اشعار، دل آویز چوٹیں۔ جذبات کا چشمہ صافی، اور یہ تھا ایک مطالعہ۔

اس سے اگلے دن وہ کانگرس کے پنڈال میں چلے گئے۔ اور وزیٹرز گیلری میں بیٹھے۔ اسی کانگرس کے وہ صدر رہ چکے تھے، لیکن آج انھیں وہاں کوئی پوچھ نہیں رہا تھا۔ اور یہ تھا ایک تماشا محمد علی۔ بہر حال مسلمانانِ ہندوستان کی ایک تاریخ تھے۔ وہ اشجع تھے، وہ ساونت تھے، وہ ہندستانی مسلمانوں کا دل تھے، وہ تیز مزاج اور تیز زبان تھے، جو منہ میں آتا بے ساختہ کہہ دیتے، اور اسی وجہ سے انھوں نے بہت سے دوست ناراض کر لیے، ہندویت کے مسلمانی ذہن نے انھیں نیشلزم سے بیزار کر دیا اور مسلمانوں کے رجعتی ذہن نے انھیں قبول نہ کیا۔

ایچ جی ویلز نے اُن کے متعلق کہا تھا:

"محمد علی کا قلم میکالے کا زبان برک کی اور دل نپولین کا تھا"۔ لیکن ہندوستان سے اس کی یاد اس لیے محو ہوگئی کہ وہ محمد علی تھا اور پاکستان میں اس کا نام اس لیے تغافل کی بھینٹ ہو رہا ہے کہ وہ پاکستان کی تجویز سے پہلے اللہ کو پیارا ہو چکا تھا!

المختصر وہ ایک ایسی قوم کا فرزند تھا، جو ڈنڈے والے کے آگے آگے دوڑتی اور دولت والے کے پیچھے پیچھے چلتی ہے۔

☆☆☆☆☆

مشتاق گرمانی

جس چیز کا نام اہل قلم کے نزدیک روشنی طبع ہے اور دانشوروں کے نہاں خانۂ خیال میں جس شے لطیف کو سیاسی ذہانت کہتے ہیں، جب ایک شخص میں وافر ہو جائے تو وہ اس کے ہم چشموں، ہم نشینوں، ہم قدموں، ہم سفروں اور ہم کاروں میں خوف پیدا کرتی ہے۔ گرمانی صاحب کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یمین ویسار کے لوگ ان سے ماضی مرحوم میں خوف زدہ تھے اور شاید اب بھی ہیں۔ قصور ان کا یہ ہے کہ مبداء فیاض نے انھیں بہترین صلاحیتوں سے مالامال کیا ہے، مثلاً وہ ایک نابغہ ہیں، عبقری ہیں، مقنن ہیں، مدبر ہیں، سیاست دان ہیں، مفکر ہیں، جوانی سے کہولت تک حکمران رہے، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا، ان کی عمر جو بیت چکی ہے اگر اُسے جسد واحد فرض کرلیں تو اس کا ایک ایک ٹانکہ بولتا ہے۔ اُڑتی چڑیا کے پر گنتے اور موج ہوا کو مٹھی میں لے کر قرطاس افق پر گلکاریاں کرتے ہیں۔ غرض قدرت نے انھیں بلا کی سوجھ بوجھ دی ہے۔ انھیں شکار کرنا مشکل ہے، البتہ شکاری خود شکار ہو جاتے ہیں۔ یاروں نے ان کے بارے میں سیکڑوں روایتیں گھڑ رکھی ہیں۔ ایسی روایتیں جن میں خوف اور خطرے زیادہ ہیں، حسن اور خوبی کم ہے۔ حالاں کہ گرمانی صاحب سراپا حسن و خوبی ہیں لوگوں نے محسوس کیا ہو یا نہ، لیکن ان الفاظ کے راقم نے یہی محسوس کیا ہے۔ لوگ ان سے اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ڈرتے، مگر الزام ان کی خوبیوں پر دھرتے ہیں۔ جو نقص اُن میں ہے وہ سیاست دان میں ہوتا، بلکہ ہر عہد میں رہا ہے۔ قرون اولی کی بادشاہتیں بھی اس سے خالی نہیں رہیں۔ وہ کسی کھلاڑی کو ترپ کی بازی ہو تو اس کے حسب منشا پتے لگانے کی مہلت نہیں دیتے اور نہ سیاست ہی کی شطرنج پر حریفوں کو مہرے بڑھانے کے مواقع بخشتے ہیں۔ اب یہ ان کا نقص کہہ لیجیے کہ وار سہنا ان کی عادت نہیں، البتہ وار کرنا ان کا مشغلہ ضرور ہے۔ ان کے وار بدھ نہیں ہوتے ترکش سے جو تیر نکلتا ہے نشانہ پر بیٹھتا اور جو کس بیٹھتا ہے۔ ان کی لڑائی (اگر اس کو لڑائی کہا جا سکتا ہے) ہمیشہ اپنے ہی طبقہ سے رہی ہے۔ لوگ ان

ں ذمانت سے بدکتے رہے انھوں نے صرفِ نظر کیا۔ لیکن جہاں تہاں حریفان فرومایہ میں سے
ں نے بیوا ئی ں طرح چھرا مارنا چاہا پھر ان کے وار سے بچ کے جانا اس کے لیے محال تھا۔ وہ
خود بھی بیت "من" پر ہر گئے، لیکن یہ محاذ نہیں کچھ اور ہی تھا، پرایوں سے انھوں نے کبھی مار
نہیں کھائی، اپنوں ہی سے چوٹ کھائی ہے۔ اس قسم کے معاملات ہر ذہین انسان کو زندگی کے
سفر میں پیش آتے ہیں اور جو شخص جتنا بالا ہوتا ہے اتنا ہی گہرا زخم کھاتا ہے۔ کرمانی صاحب کو
ان لوگوں نے زخم لگائے جن کے بسمل ہونے کا وہ تماشا بھی دیکھ سکتے تھے۔ تکیہ انھیں خدا کی
ذات پر ہے، لیکن "جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے" کا اطلاق بھی ان کی سرگذشت کے
قدو قامت پر ہوتا ہے۔ طاقت کی یہ خصوصیت آج سے نہیں شروع سے ہے کہ وہ اپنی اولاد کو
بھی کھا جاتی ہے اور باپ تاج محل کا معمار ہی کیوں نہ ہو اسے بھی قید میں ڈالنے سے نہیں چوکتی
کرمانی صاحب کی سیاسی اولاد ہی انھیں تخت و تاج سے محروم کرنے کا باعث ہوئی، ورنہ وہ
اقتدار کے لیے اور اقتدار ان کے لیے تھا۔

گورا رنگ، آفتابی چہرہ، روشن ماتھا، آنکھیں متحرک بھی اور منور بھی، قد میانہ لیکن
اس میں تھوڑا سا کمان کا خم ہے۔ ناک کٹار، شتہ ان کا تخلص ہے، ہر لحاظ سے نفیس، شرافت
اور ذہانت کے جلیس، رئیس ابن رئیس، دماغ فاروقی، دل اسداللھی غازی تو نہیں نمازی
بڑے پکے ہیں۔ زبان الفاظ و مطالب کے اظہار کا خزانہ، بات سے بات پیدا کرتے، غنچے چٹخاتے
اور پھول کھلاتے ہیں۔ مطالعہ بے پناہ، مشاہدہ عمیق، تجربہ طویل، ملک اور بیرون ملک کی
سیاسی آویزشوں کے ایک ایک پہلو سے آگاہ اور یاران سرپل کے ظاہر و باطن پر ہر لحظہ نگاہ،
بادشاہ نہیں لیکن کجکلاہ، اردو بے عیب، انگریزی بے روک، پنجابی کے مزاج دان، ہر لباس میں
تصویر، فطرت میں کم آمیزی، ہر بزم کے صدر، لیکن رزم سے دور بلکہ نفور، ایک چلتی پھرتی
تاریخ، اکبر کے دربار میں ہوتے تو ابوالفضل پانی بھرتے۔ غالب کے احباب میں ہوتے تو وہ
مفتی صدرالدین آزردہ کی ضیافتوں کو بھول جاتا، ان کا قرب قلو پطرہ ہے اور ان کا بعد بدنصیبی،
غرضیکہ شتاق احمد کرمانی ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جسے اقتدار زمانہ نے طاق
نسیاں کا گلدستہ بنا دیا ہے۔

☆☆☆☆

سید مظفر علی شمسی

قامت میانہ، چہرہ روشن، رنگ گورا، آنکھیں متحرک ماتھے پر سلوٹیں، گفتار میں انیس کے لہجہ کی نفاست، چال میں عمر خیال کی رعنائیوں کا طنطنہ۔ سب کا دوست، عداوت کا لفظ گویا اس کے لغت میں نہیں۔ اس کا دل اور دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا رہتا ہے۔ اہل بیت کا حلقہ بگوش، دسترخوان رسالت کا خوشہ چیں، سید سجاد کی سنت کا وارث۔ عمر کا ایک تہائی حصہ قید و بند میں بسر کیا تب اور اب کربلا کی حکایتوں اور روایتوں کا نغمہ خواں، ذاکری میں نوجوانوں کا سرخیل۔ ناقہ خطابت کا حدی خواں، کربلا میں ہوتا تو حسین کے قدموں پر شہید ہو جاتا لیکن اب ماہنامہ "شہید" کا مدیر، اور اسد اللہیول کا سفیر ہے۔

مظہر علی

نسلاً نواب زادہ ہیں، عقلاً کامریڈ تقریر شستہ، تحریر رفتہ، قلم اشتمالی، پاکستان ٹائمز کے مدیر، سکندر حیات کے داماد مظفر خاں کے فرزند، بالابلند، کتابی چہرہ، شہابی رنگ، موٹی موٹی آنکھیں، کھلا ماتھا، ابھی تک کھدر پوش صرف اچکن ولایتی پہنتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر اقبال کے اس مصرع کہنہ کے معنی سمجھ میں آتے ہیں:

سپان مل گئے "کعبہ" کو صنم خانے سے

جیسا لکھتے ہیں ویسا ہی بولتے ہیں۔ طبعاً تخلیہ پسند ہیں۔ طبیعت میں شرافت اور لہجہ میں ملائمت ہے۔ ذاتیات سے بالا رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب تک میاں افتخار الدین سے نبھائے جارہے ہیں اور یہ ان کے متوازن دل و دماغ کی صحت پر دال ہے؟

مظہر علی کے شب و روز کافی ہاؤس یا میٹرو ہوٹل کی سیاسی کشاکش سے قطعاً خالی ہیں۔ وہ کسی کو اپنا موضوع نہیں بناتا اور نہ خود کسی کا موضوع بنتا ہے۔ اس کی دنیا گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر تک محدود ہے۔ یا انگریزی بولتا ہے یا پنجابی، اس کے علاوہ اردو سے اس کا اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ عبدالمجید سالک کو پنجابی سے ہے۔ القصہ مظہر علی اشتمالی سیاست اور پاکستانی صحافت کے درمیان ایک کوریڈور لائن ہے۔

سیّد مغیث الدین

ان کا دنیادی حلیہ تو یہ ہے کہ ایک زمانے میں فوج کے میجر تھے، آج کل مسلم لیگ (ایوبی) کی مغربی پاکستان شاخ کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ چہرے مہرے سے لے کر رہنے سہنے کی ہر چیز ماڈرن ہے۔ دولت ان کی باندی ہے، یعنی روپیہ پیسہ کی نسلاً بعد نسلٍ فکر نہیں۔ روپیہ ان پر ہن کی طرح برستا ہے۔ آج کے رئیس نہیں۔ پشتینی رئیس ہیں۔

روحانی حدود اربعہ یہ ہے کہ حسنی و حسینی سید ہیں اور واقعی سید ہیں بے عیب، خون بولتا ہے کہ نجابت ان کی خانہ زاد ہے۔ شرافت ان کی لونڈی، امارت کے پیکر میں فقر و استغنا کا جلال و جمال۔ ان سے گفتگو کیجیے، معلوم ہوگا کہ آپ کسی جاگیر دار سے بات نہیں کر رہے۔ بلکہ ایک ایسے انسان سے گفتگو کر رہے ہیں۔ جس کے پہلو میں دل ہے اور دل بھی مجذوب کا۔

بات بات میں قرآن کے حوالے، احادیث کا تذکرہ، صحابہ کے آثار، اہل بیت کی روایتیں۔ آپ نفرت باندھ کر ان کے سامنے جایئے، وہ آپ کو محبت سے اس طرح شکار کریں گے کہ خود گرفتار ہونے کی خواہش پیدا ہو جائے گی۔ قد درمیانہ ہے، لیکن بدن دوہرا، رنگ شفاف، آنکھیں ذوالفقار، ناک کٹار، داڑھی غائب، مونچھیں تاریخی، ماتھا کھلا، سینہ پورا، مصافے میں جمال شبیری، پنجہ آزمائی میں جلال حیدریؓ، ہر شخص کے خیر خواہ، نے خوف لشکر نہ خدشۂ سپاہ۔ سیاسیات میں خود آئے نہیں لائے گئے ہیں۔ پالیٹکس زبردستوں کی تلوار اور زیر دستوں کی ڈھال ہے، شاہ صاحب نہ زبردست ہیں نہ زیردست۔ ان کے لئے نانا کی سنت کافی ہے۔ اور صبح و شام اس کا ذکر و اذکار کرتے ہیں۔ اگر ہم ان کا حدود اربعہ جسمی و روحی کہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ دولت کے قبیلہ میں اس قسم کے زندہ دل لوگ بھی موجود ہیں۔ راقم کے بس میں ہو تو ان سے سیاسیات چھڑا لے کیوں کہ یہ میدان ان کے لئے نہیں اور نہ وہ اس میدان کے کھلاڑی ہو سکتے ہیں۔ ان کے لیے بوے اسد اللہی ہی کافی ہے۔

☆☆☆☆☆

دیوان سنگھ مفتونؔ

اُردو صحافت میں الہلال ایک علمی جریدہ تھا۔ اس کے مدیر کا قلم ایک عالم تبحر کا قلم تھا لیکن ریاست ایک عوامی اخبار ہے اور اس کے ایڈیٹر کا قلم ایک عوامی قلم ہے، دونوں میں جو فرق مراتب ہے، وہ ظاہر ہے، اور نہ ان کا موازنہ مقصود ہے لیکن الہلال کے بعد ہندوستانی اخباروں میں اگر کسی اُردو ہفت روزہ کو سب سے زیادہ شہرت نصیب ہوئی ہے، تو وہ ریاست ہے، ریاست اور مفتون، لازم و ملزوم ہیں، دونوں بسم و جان کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔

بظاہر کشیدہ قامت، لیکن جسم کی فربہی سے۔ توازن مختل ہو گیا ہے۔ رنگ کھلتا ہوا گندمی ہے۔ آنکھیں بولتی ہوئی، لیکن شیشوں میں محصور، گنجان داڑھی، گھنی مونچھیں، اور گنجلک بال، ہیئت کے اعتبار سے سکھ، اسلوب کے اعتبار سے مسلمان، مطالب کے اعتبار سے انگریز، قلم میں تلوار کی سی کاٹ، ایک عجیب الخلقت انسان، جس نے قلم کے زور سے ریاستوں کا اس وقت انجر پنجر پلا ڈالا، جب ان کا ٹھاٹھ عروج افق سے بھی پرے تھا۔

مفتون کی کمزوریاں عام انسان کی کمزوریاں ہیں۔ لیکن مفتون کی خوبیاں، عام انسانوں سے کہیں بلند ہیں، اس نے زندگی بھر لاکھوں روپے پیدا کیے، لیکن کبھی ایک کوڑی جمع نہیں کی۔ وہ زندگی کو عالم دوبارہ نیست کے آئینہ میں دیکھتا، اور بعیش کوش، کے صنم کدے میں بسر کرتا ہے، وہ ایک ہی وقت میں شہنشاہ بھی ہے، اور فقیر بھی، اس کے کئی دوست لاہور میں بھی اس کے تلطف سے متمتع ہوئے ہیں۔ وہ ہر دوست کی پریشانی میں شریک ہوتا اور اس کا ہاتھ بٹاتا ہے۔

اس نے زندگی کا آغاز ء حرف اعتذار ، کی حیثیت سے شروع کیا اور نالہ احتجاج تک پہنچا۔ یہاں تک کہ اب اس کی بے شمار باتیں آویزۂ گوش ہیں۔

وہ ذاتی ہمت و ایثار کی ایک تصویر ہے اس نے زندگی بنانے اور گزارنے کا فن اپنی قابلیت سے سیکھا ہے۔ ایک زمانے میں وہ محض پندرہ روپے ماہوار پر لکھنو کے کسی اخبار میں،

منشی تھا، لیکن ذاتی تگ و دو سے اس نے اتنی استعداد بہم پہنچائی کہ وہ بڑے بڑے ماراجوں ن
روح میں تیر و نشتر کی طرح بیٹھ گیا۔

وہ چپراسی سے لے کر جنرل منیجر تک اور مصحح سے لے کر مدیر سر دبیر تک کا کام خود
کرتا اور اپنے دفتر کی کرسی پر صبح و شام گوشت پوست کی طرح چپکا رہتا ہے، یہاں تک کہ
رات گئے اسی میز پر بستر بچھا کر سو رہتا ہے!

شبے سمور گذشت و شب تنور گذشت

☆☆☆☆☆

ممتاز حسن

بالمشافہ گفتگو کا شرف کبھی حاصل نہیں ہوا، دیکھا سنا نہ پڑھا۔ لہٰذا ان کا قلمی چہرہ قیاسی ہو سکتا ہے حقیقی نہیں، یعنی خال کی تصویر کھینچنا ذرا مشکل ہے۔ عادتیں کچھ حمید نظامی مرحوم بتا گئے تھے، کچھ اے ڈی اظہر کی بات چیت سے اخذ کی ہیں۔ کچھ ورق چودھری محمد علی کے لب و لہجہ سے اڑا لیے ہیں، جو باقی رہ گیا تھا، وہ پچھلے دنوں پنجاب یونیورسٹی کے دانشوروں سے معلوم ہو گیا، جنھوں نے علامہ اقبال کی فکری نشوونما پر "منوہر ویاکھیان" دینے کے لیے انھیں بلایا تھا۔ ویاکھیان کے لفظ سے ممکن ہے ان کی طبیعت منغض ہو، لیکن ہمارا خیال ہے کہ اپنے ان دو لیکچروں میں جو کچھ انھوں نے کہا وہ منوہر ویاکھیان ہی تھا جس قسم کے دانشور پنجاب یونیورسٹی کے مقدر میں ہیں (الا ماشاء اللہ) ان کی موجودگی میں انھیں دانشوروں کا سرخیل کہنا بے جا نہیں، اقبال پر ان کے خطبات پر داد و تحسین کے جو ڈونگرے برسائے گئے، وہ خطابت کی معنوی خوبی کے باعث نہیں تھے۔ ان کی ذات کی وجہ سے تھے ممتاز حسن صاحب کے پاس "بہت کچھ" ہے اور وہ ہمیشہ اس بہت کچھ میں کچھ دینے کو تیار رہتے ہیں۔ اور جو لوگ داد دے رہے تھے، ان میں سے ہم بیشتر کو کما حقہ جانتے ہیں کہ وہ کچھ لیے بغیر داد یا بیداد کے جذبات خفی و جلی کی طرف مائل ہی نہیں ہوتے ہیں۔

ان لیکچروں میں بہ روایت جاوید اقبال سبھی کچھ تھا، اقبال نہیں تھا۔ اقبال کا نام لینا اور بات ہے۔ اقبال کا فہم بالکل مختلف چیز ہے اور یہ بات شورش کاشمیری کامل یقین بلکہ ادعا کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اقبال کے مجاوروں میں اقبال کی تعلیمات کا فہم عشر عشیر بھی نہیں ہے، وہ صرف اقبال کو اپنی شخصیت جمانے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

ممتاز حسن ان ارکانِ ثلاثہ کے ایک رکن ہیں جو گورنمنٹ آف انڈیا (آنجہانی) کے حسابی میدانوں کے مسلمان کھلاڑیوں میں منفرد سمجھے جاتے تھے۔ محمد علی چودھری، اے ڈی اظہر اور ممتاز حسن یہ تینوں دوست مدۃ العمر اکٹھے رہے اور اپنے اپنے دوائر میں خوب نام پیدا

کیا۔ محمد علی چودھری کو اس تگڈم کا دماغ کہا جا سکتا ہے، اظہر کو دل، بعض لوگ زبان بھی کہتے ہیں البتہ ممتاز حسن کے بارے میں یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کیا ہیں؟ دماغ تو ویقیناً نہیں، دل بھی نہیں کہ دل کہ معاملات نازک ہوتے ہیں۔ زبان کہا جائے تو اختلاف پیدا ہونے کا امکان ہے دراصل وہ ریاضی کے آدمی ہیں، حساب کتاب خوب جانتے ہیں۔ علم وادب میں وہ آئے نہیں لائے گئے ہیں۔ اس کوچہ میں نہ ہوتے تو پہلوان ہوتے اور اتنے جگر دار ہوتے کہ بڑے بڑے رستم واسفندیار اُن سے پٹخنی کھا جاتے۔ قدرت نے اُن کا جثہ اسی لیے بنایا تھا۔ یہ ان کی گمشدگی ہے کہ وہ اس کوچے میں آنکلے ہیں۔

پاکستان بن جانے کے بعد اُن کا طوطی بولتا رہا، پھر ایک زمانہ ایسا بھی آگیا کہ وہ اپنی جگہ سے سرک گئے۔ یار لوگوں نے فنانس سیکرٹری شپ سے اٹھایا تو نیشنل بینک آف پاکستان کا مینجنگ ڈائریکٹر بنا دیا جو کسی طرح نواب آف بہاول پور کی جاگیر سے کم نہیں۔ حمید نظامی مرحوم زندہ ہوتے تو ان کی حق تلفی کا ازالہ ضرور ہوتا۔ اور نہیں تو پنجاب کی حق تلفی کا ماتم ہو جاتا۔ اب وہ دور لد چکا ہے۔ نظامی رہا نہ ان کے قدردان رہے۔ جہاں بیٹھے ہیں اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ایک زمانے میں وزیرِ خزانہ شعیب ان کے ماتحت یا معاون افسروں میں سے تھے اور یہ اُن کے سردار تھے۔ قدرت نے شعیب کو بالا کر دیا اور یہ نیشنل بینک کے "جزیرہ فارموسا" میں آگئے۔

عام روایتوں کے مطابق ممتاز حسن، چودھری محمد علی اور اے ڈی اظہر کا حدِ اوسط ہیں۔ بہ قولِ راجہ حسن اختر یار باش ہیں اور بہ قول خواجہ عبدالرحیم زندہ دل، پنجابی اور اکل کھرے پنجابی، محبت اُردو سے کرتے، بولتے انگریزی اور پڑھتے فارسی ہیں۔ مزید معلومات اے ڈی اظہر سے حاصل کریں۔ قد ضخیم ہے یعنی داغ کے چار دیوانوں میں سے تین کے برابر، چہرہ قصیدہ، ہے آنکھوں میں مسدس، ناک رباعی کے پہلے تین مصرعے، رنگ اپنا ہی ہے یعنی گندمی کہہ لیجیے، چال دیکھی نہ ڈھال، ان کی محبت کا محور اقبال ہے اور نفرت کا مرکز ابوالکلام، اور ظاہر ہے کہ محبت اور نفرت دونوں اندھی ہوتی ہیں۔

بہر حال ان کا دم اس دور میں غنیمت ہے کہ جہاں بھی ہوں ادیبوں کی ایک کھیپ ضرور ساتھ رکھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

محمد ممتاز دولتانہ

ایک ہی دفعہ ملے تھے اب دوبارہ ملنے کا شوق نہیں۔ البتہ سرِ راہے مل جائیں تو عذر نہیں۔ جو لوگ سیاست داں ہوتے ہیں۔ ان کی دوستی وقتی ہوتی ہے۔ اور دشمنی بھی، ان کی دوستی میں دل نہیں دھڑکتا، دماغ بولتا ہے اور دشمنی میں تو دونوں متحد العمل ہوتے ہیں۔

قامت نصفا نصف ہے، البتہ جسامت میں خان ممدوٹ کو دو سے ضرب دیں، تو ممتاز دولتانہ بنتے ہیں، کبھی چلتے نہیں دیکھا، لہٰذا چال پر کچھ کہنا محال ہے، ہاں ڈھال ضرور دیکھی ہے اس میں دائرے ہی دائرے ہیں، یہ روایت عام ہے کہ ذہین بھی ہیں اور فطین بھی، ممکن ہے کبھی حسین بھی ہوں، لیکن مشاہدہ اس کے برعکس ہے۔ راون کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کے شانے پر بیسیوں سر تھے، ان کی خوبی یہ ہے کہ دہن میں بیسیوں زبانیں رکھتے ہیں۔ انگریزی میں لکھتے ہیں، اردو سنتے ہیں اور پنجابی بولتے ہیں۔

مسلم لیگ میں سب سے پیچھے آئے تھے اب سب سے آگے ہیں۔ ممدوٹ، شوکت، ممتاز کبھی، اتحاد ثلاثہ تھے، اب بکھرے ہوئے دانے ہیں، ممتاز، نے ساتھیوں کو وہ پٹخنی دی ہے کہ اب صوبہ لیگ میں لاشریک ہیں۔ جس سے ملتے ہیں، ایک دفعہ تو موہ لیتے ہیں اور جب باتیں کرتے ہیں تو آنکھیں عموماً جھکی رہتی ہیں۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد ملاقاتی محسوس کرتا ہے کہ ڈھول دور کے ہوں یا نزدیک کے وہ سہانے ہی ہوتے ہیں۔

جو کوئی ان کے قریب جاتا ہے، اس کے کان میں ممدوٹ کی یہ مدھم سی آواز ضرور آتی ہے:

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

وہ مصافحہ پر سوچتا اور معانقہ سے تلملاتا ہے اور سب سے قطع نظر۔

وہ پاکستان کے صوبائی وزیر اعظم ہیں، سب سے زیادہ جمہوری ہے اس کو معلوم ہے کہ تاریخ کس موڑ پر آچکی ہے۔

☆☆☆☆☆
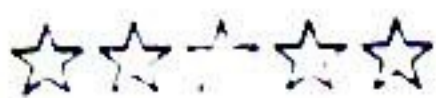
(۲)

بارِ خاطر نہ یارِ شاطر، خود ذہانت کی پھلجھڑی، خطابت جیب کی گھڑی، سیدھی بات کرنے سے گریزاں، میزان میں تلے ہوئے افکار، سیاست کے صرافے کا سنار، کھرے کھوٹے سے آگاہ، اقتدار ہو تو بے پناہ، اپنے نام کی رعایت سے بے شمار قافیوں کی معنوی صفات کا خزانہ المعروف ممتاز دولتانہ، ادراک کا شکاری، سیاست کا کھلاڑی، محفل آرا لیکن خانہ نشین، خلوت کا شیدائی، جلوت سے دامن کشاں، خلقتہً جاگیردار، فطرتاً شہریار، عادتاً خوش گفتار، مزاجاً خاکسار، فی الجملہ باغ و بہار، قولاً ترقی پسند، عملاً سب کچھ لیکن کچھ بھی نہیں۔ وسیع المطالعہ، وسیع الفکر، مشاہدے میں گہرائی، تجربے میں پہنائی، گفتگو میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے کا صناع، ہر لحاظ سے ذہین و طباع، جس کا دوست اس کا دوست، جس کا دشمن اس کا دشمن؟ یہ دوسری بات، غالباً محل نظر ہے کیوں کہ وہ دشمنی کا اہل نہیں، اتنا پڑھا لکھا آدمی عموماً دشمنی کے نااہل ہوتا ہے، بڑے آدمیوں کے لیے اس کے ہاں دستر خوان بھی ہے اور ایوان بھی بلکہ بادشاہوں کا سر و سامان بھی، لیکن چھوٹے لوگوں کے لیے وہ عموماً گھر میں ہو کر بھی گھر میں نہیں ہوتا۔ ان لوگون کی چھچھوری باتوں سے زیادہ اسے اپنے کتب خانہ کے نوادرات عزیز ہیں۔ وہ کتابوں کی خلوت کو ان لوگوں کی جلوت پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ غلطی کرے تو معافی مانگ لیتا ہے، بشرطیکہ مدمقابل کی ذہانت اس سے ٹکر لے سکتی ہو، دولت خانہ زاد، ذہانت ہمزاد، میدان میں ٹھہرنا اس کے بس کا روگ نہیں، ڈرائنگ روم کا کھلاڑی، چتے لگا سکتا ہے، کھیل نہیں سکتا وہ اپنی جماعت کا غالباً سب سے بڑا جمہوری نوجوان تھا، لیکن جمہوریت اس کی عادت ہے فطرت نہیں، وہ کسی اشتراکی ملک میں ہوتا تو داد جہانبانی دے کر بعجلت تمام رخصت ہو جاتا، کسی انسان یا فیصلے پر ٹکنا اس کی ذہانت کے خلاف ہے، اپنے سوا ہر شخص کے بارے میں اس کا خیال ہے کہ بے وقوف ہے، لیکن یہ ظاہر نہیں کرتا ظاہر یہ کرتا ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو کسی عظمت پر فائز کر رہا ہے۔

قد چینی، جثہ پنجابی، ماتھا بہاری، آنکھیں امریکی، ناک روسی، چہرہ عجمی، سینہ عربی

، چال فرانسیسی، ڈھال جرمنی، دماغ ان سب کے اجزائے ترکیبی کا نسخہ مجرب بلکہ تیر بہدف، دل میں ہر قسم کا خوف، اور زبان میں کئی زبانیں، قابلیت سے انکار کفر، ہر دور کا تماشائی، اس دور کا گمشدہ ورق، مرحوم پنجاب کے عناصر اربعہ میں سے ایک، تاش کے باون پتوں میں ترپ کا ایک پتا، لیکن دگی بھی اور ایکہ بھی روایت یہ ہے کہ آج کل اپنی سوانح عمری لکھ رہے ہیں حکایت یہ ہے کہ اچھے دنوں کی یاد میں متقدمین کے دیوان پڑھتے اور سر دھنتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

سید منیر حسین شاہ

نسب کی رو سے بھی سید اور حسب کی رو سے بھی سید، یعنی ایک زمانے میں کراچی کے سید (ڈپٹی کمشنر) تھے۔ کل تک محکمۂ اطلاعات مغربی پنجاب کے سید (ڈائریکٹر جنرل) ہو گئے ہیں گویا بتانِ آذری کے قبیلے پر اولادِ ابرہیم کی علم برداری قائم ہوئی ہے۔ ایک ایسا نوجوان جس کی رگوں میں خونِ بتول، جس کا وجود گلاب کا پھول۔ بہت ہی پیارا انسان، جس نے بھڑوں کے چھتے (لاہور کے اخبار نویس) کو موہ لیا۔ اخلاق کا خوب رو مجسمہ، شرافت کی جیتی جاگتی دستاویز، لہجہ میں قدرے تمکنت، لیکن سلوک میں حسن نپی تلی بات کرنے کا عادی، ہر لحظہ مسکرانے کی عادت۔ بالوں کی دونوں روشوں کے درمیان خطِ استوا چہرہ کتابی اور گلابی، ماتھا انجینئر کا، آنکھیں شاعر کی۔ ناک کٹار، قد بوٹا، جسم شاخچہ، چال کی رو سے سرو، ڈھال کے لحاظ سے نرگس کی ٹہنی، طبیعت میں شرافت کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے۔ مزاج شستہ و رفتہ ہے۔ قہر و غضب سی ایس پی ہونے کے باوجود نام کو نہیں۔ سادات کی خوبو وافر ہے اس لیے حادثوں سے اغماض برتتے اور خطاؤں سے درگذر کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے عہد میں اطلاعات کے شعبۂ مطبوعات کا ایک کٹ کھنا، ابو الفضل کی گدی پر بیٹھ کر قلم کترتا رہا، اور بزعم خویش اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا کہ جیسے داغ کا داماد ہے اور دلی والا ہے

معاف کیجیے بات مصرعۂ طرح سے نکل گئی۔ ریشم میں ٹاٹ کا پیوند آ گیا۔ شاہ صاحب اس نوعمری کے باوجود اُن لوگوں میں سے ہیں جو اپنی عزت کی محافظت کرتے اور دوسروں کی عزت سے چھیڑ خانی نہیں کرتے۔ جس مجلس میں جائیں اپنا نقش جماتے، جس محفل میں رہیں اپنی یاد چھوڑ جاتے۔ کئی محاسن ان کی ذات میں جمع ہو گئے ہیں، ان میں عفو و درگذر کا مادہ اتنا عام ہے کہ ریڈیو کے چونچلے اور چہلیں، ناز اور نخرے، ادائیں اور گھاتیں، یہ سب مل جل کر جس محاسبے کا مطالبہ کرتی ہیں، اُن کی بازپرس غفرلہ ہو جاتی ہے۔ بہر حال انھیں کوئی کھلنڈرا، کوئی لقندرا، کوئی گلا اور کوئی تلا دھوکا نہیں دے سکتا۔ حکومت کے احکام کو نافذ کرنا

اور محلے کے انتظام کو قابو میں رکھنا اسی طرح جانتے ہیں جس طرح خواجہ شہاب الدین پرانے سیاست دانوں کے داؤں پیچ سے آشنا ہیں۔

فی الجملہ منیر حسین اُن نوجواں افسروں میں سے ایک ہیں، جن کا اقبال قدرت کا نوشتہ ہوتا اور جو اپنے ساتھ گردوپیش کی دعائیں لے کر زندگی کے سفر کو نکلتے ہیں۔ پھر ہر سنگ میل پر شگفتہ آرزوئیں اور ہر موڑ پر پُر بہار امیدیں ان کا استقبال کرتی ہیں۔

☆☆☆☆☆

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

جس شخص نے مولانا ابوالکلام کو قریب سے دیکھا، قریب سے سنا اور انہاک سے پڑھا ہو، جس نے علامہ اقبال کے علم و نظر سے استفادہ کیا ہو، جس کو علامہ انور شاہ کی امامت میں نماز ادا کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہو، جس نے حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ مرحوم کے قدموں میں بیٹھنے کا فخر حاصل کیا ہو، جس کے شب و روز کا ایک بڑا حصہ سید عطاءاللہ شاہ بخاری کی "خطابت" میں بسر ہوا ہو، پھر جس نے اس عظیم دور کے ہر بڑے رہنما کی معیت حاصل کی ہو، اس کے لیے مولانا مودودی کے علم و فکر اور زہد و تقویٰ میں کشش نہ ہو تو چنداں عیب نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ مولانا شروع میں جچے نہیں، لیکن منٹگمری، سنٹرل جیل میں جب ان کی کتاب "الجہاد فی الاسلام" نظر سے گزری اور پھر "پردہ" کا مطالعہ کیا، تو یقین ہو گیا یہ شخص غیر معمولی ذہانت کا مالک ہے اور غالباً پہلا مصنف ہے جس نے جہاد کے نظریے کی توضیح کے لیے معذرت کا لہجہ اختیار نہیں کیا، بلکہ جو کچھ اسلام کے اندر ہے اس کو بلا کم و کاست پیش کر دیا ہے۔

رفتہ رفتہ ان کی "فکر" ایک تحریک ہوتی گئی۔ یہ عجیب اتفاق یا حادثہ ہے کہ ہر دور کے سیاسیین ہی میں ذہنی مغائرت یا قلبی تفاوت کی کش مکش نہیں رہی۔ بلکہ علماء نے ابھی ایک دوسرے کو تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ چناں چہ مولانا ابوالاعلیٰ بھی اس سانحہ کا شکار ہیں۔ جن علماء کے سروں پر فضیلت کی دستاریں بندھی ہوئی ہیں۔ انھوں نے عادتاً ناک بھوں چڑھائی، زبانیں قینچی کی طرح چلنے لگیں، خلوت و جلوت میں ابوالاعلیٰ کے باقاعدہ فارغ التحصیل نہ ہونے پر تبصرے شروع ہو گئے۔ مگر لوگوں کے ذہن ان کے دینی کے احترام سے خالی تھے۔ اس لیے ان کی باتیں طاقِ نسیاں کا گلدستہ ہوتی گئیں اور مولانا ابوالاعلیٰ فکری اعتبار سے علامہ اقبال کے بعد پاکستانی عوام کے محبوب راہنما ہو گئے۔

مولانا ابوالاعلیٰ سے آپ اتفاق کریں یا اختلاف، لیکن واقعہ یہی ہے کہ انھوں نے

نوجوانوں کے برگشتہ ذہن کو دوبارہ مذہب کی طرف راجع کیا اور پاکستان میں وہ پہلے شخص ہیں۔ جنھوں نے اسلام کو ایک تحریک، ایک تنظیم، ایک فکر اور عالمی انقلاب کی حیثیت سے پیش کیا۔ انھوں نے ریاضی کی طرح نقد و بحث کا اسلوب پیدا کیا اور ایک ایسی تحریک کے لیے وہ تمام سیاسی انداز اختیار کیے کہ جن سے معاشرے میں انقلاب کے برگ وبار رونما ہوتے ہیں۔

ان کی دعوت "الہلال" کی ابتدائی دعوت سے مختلف نہیں بلکہ بڑی حد تک اسی سے ماخوذ ہے۔ لیکن ان کا قلم ابوالکلام کا قلم نہیں۔ ابوالکلام کا قلم ذہن کو بے اختیار پرستش کی طرف لے جاتا ہے، مگر ابوالاعلیٰ اس کے برعکس پرستش کی دعوت دیتے ہیں۔ وہ اپنے نظریات میں انتہا پسند ہیں۔ اُن کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے متوسط طبقے کو انتہائی متاثر کرتے ہیں۔ لیکن جو جان اُن کی تحریروں میں ہے، وہ اس طبقے میں کبھی نہیں ہوئی۔ یہ طبقہ فکر کے ذہنی کھیل تو کھیل لیتا ہے۔ لیکن عملی لحاظ سے ہمیشہ ناکارہ ثابت ہوا ہے۔ اس سے کسی معاشری انقلاب کی توقع رکھنا ہی غلطی ہے۔ مولانا ایک راست گفتار اور نیک دل انسان ہیں، جو چیز ذہن میں ہو، وہی زبان پر آتی ہے۔ کبھی رو رعایت سے کام نہیں لیتے۔ اپنے انداز میں سوچتے اور اپنے انداز میں کہتے ہیں۔ کئی دفعہ نیاز حاصل ہو چکا ہے۔ لیکن "چٹان" کی بندش پر ملک نصر اللہ خاں عزیز نے "تسنیم" میں ایک ایسا اداریہ لکھ دیا تھا جس سے سرکاری نقطہ نگاہ کی حمایت ہوتی تھی۔ میں نے مولانا سے شکایت کی انھوں نے ہم دونوں کو طلب کیا مقدمہ سنا اور فیصلہ صادر کیا جو ننانوے فی صد میرے حق میں تھا۔ اور یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے مولانا کی ذہنی صداقت کو قریب سے محسوس کیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ اس شخص کے اندر کوئی چمک ضرور ہے۔

دہرا بدن۔ میانہ قامت، چمپی رنگ، بھوی آنکھیں، مسجع داڑھی، خوش پوشاک، زبان شستہ، لہجہ رفتہ، قلم کے دھنی۔ جماعت اسلامی کے قائد، سراپا اخلاق، عام لیڈروں سے مختلف، نہ زندہ باد کے تمنائی نہ مردہ باد سے خائف، دماغ بھی متوازن، دل بھی متوازن اور قلم بھی متوازن، لیکن یہ حسن اتفاق ہے یا سوء اتفاق کہ جو عجز ان میں ہے وہ ان کے ساتھیوں میں نہیں۔ اکثر وبیشتر میں تقویٰ کا زعم پرورش پا رہا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ نہ ہوتے تو سیاست میں

سید حسن ہوتے، صحافت میں مہر ہوتے، افسانہ نگاری کی راہ پر چلتے تو مسلمانوں میں پریم چند ہوتے، ناول نگاری میں نسیم حجازی کو پیچھے چھوڑ جاتے۔ وہ حکمراں ہو کر کیا بنتے ہیں پیش گوئی محال ہے، البتہ وہ ایک ایسے موڑ پر آچکے ہیں کہ اب بیچ کا راستہ عنقا ہے۔ عیب نہیں کہ جس تحریک کا آغاز پٹھان کوٹ سے ہوا تھا وہ بالا کوٹ پر ختم ہو۔ واللہ علم بالصواب!

رہے پر پیچ و راہی خستہ و زار　　　چراغ عشق مردہ و شب و در میان است

☆☆☆☆☆

(۲)

(راقم الحروف نے اس سے پہلے بھی تین چار دفعہ ان کا چہرہ لکھا ہے۔ مطالعے کی گرہیں تو کھلتی ہی رہتی ہیں' اب مزید حاشیہ آرائی عبث ہے۔ اضافی طور پر کچھ خطوط اور درج ذیل ہیں)

انسانوں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ بعض انسان اپنی شخصیت کے خطوط اتنے اُبھار لیتے ہیں کہ اکثر انسانوں کو تنقید کا راستہ مل جاتا ہے۔ بعض انسان دوسروں کے دل کا سرور اور حاسدوں کے دل کا کانٹا بنے رہتے ہیں۔ بعض انسان جب چھوٹوں کو کھینچ کھانچ کر سینائے شہرت پر لے جاتے ہیں تو وہی چھوٹے اُن کے لیے لن ترانی کی صدا دینے لگتے اور بزعم خویش نیابتِ الٰہی کے ٹھیکیدار بن جاتے ہیں۔ بعض انسان بڑے ہو کر دوسروں کی بڑائی کو بھول جاتے اور اپنی دھن میں لگے رہتے ہیں۔ بعض انسانوں کی عظمت کو ان کے پیروکار افسانہ بنا دیتے ہیں۔ بعض جیتے اس لیے ہیں کہ دوسرے ان کو گالی دیں اور وہ دعا کرتے رہیں۔ غرض یہ ایک عجیب کارخانہ ہے جس میں ہم رہ رہے ہیں۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی میں اَنا ہے تو یہ تبحر علمی کا فطری تقاضہ ہے۔ مولانا کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تو یہ بھی کوئی عیب نہیں، ان سے کئی گنا چھوٹے آدمی خاکروبوں کے جلسے کی صدارت کرتے وقت گرد و پیش کو خاطر میں نہیں لاتے۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی ہر حال میں مولانا ابو الاعلیٰ مودودی ہیں۔

ان کی جدائی کا نام مولانا امین احسن اصلاحی ہے۔ ان کے وصال کا نام میاں محمد طفیل ہے۔ ان کے قاصد کا نام مولانا نعیم صدیقی ہے اور ان کی غزلہائے رواں سے جو مصرعے لوٹ کر عام شاعروں کے ہتھے چڑھ گئے تاکہ وہ ان پر گرہ لگاتے رہیں اتنے ہیں کہ

میں گنانے پہ جو آؤں تو گنا بھی نہ سکوں

خود ہی تلاش کر لیجیے آپ کو جماعت اسلامی کے سوا ہر محاذ پر مل جائیں گے۔

☆☆☆☆☆

غلام رسول مہرؔ

آپ علم میں سے عمل کو حذف کر دیں تو مولانا مہر بنتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مہرؔ جیسی قابلیت کے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے مولانا ظفر علی خاں صحافت میں پیشرو ہونے کے باوجود مدیر نہیں ادیب تھے، لیکن مہرؔ واقعی مدیر تھا۔ اس نے اُردو افتتاحیہ نویسی میں حسن پیدا کیا۔ اخبار نویسی کو محض جذبات پر قائم نہ رکھا۔ بلکہ اس میں استدلال کا عنصر سمویا۔ اور واقعات و حالات کے تجزیہ پر افکار و نظریات کی بنیاد رکھی۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کہا کرتے تھے۔ مہرؔ کے افتتاحیے ایک دفعہ دماغ کو فتح کر لیں تو پھر ان کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں ہے۔

ہندوستانی مسلمانوں میں سیاسی علیحدیت کے سبب سے بڑے مبلغ کا نام غلام رسول مہرؔ ہے۔ وہ قلم کے دھنی ہیں۔ انھیں اردو، فارسی، عربی، انگریزی، میں جو مہارت حاصل ہے، وہ پاکستان میں شاید ایک دو آدمیوں ہی کو میسّر ہو۔ ان کا محبوب مضمون تاریخ ہے۔ بلکہ وہ خود بھی ایک تاریخ ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کی فکری تاریخ بنانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ ان کے قلم سے "زمیندار" اور انقلاب میں ہزاروں صفحے نکل چکے ہیں۔ ممکن ہے کبھی ان صفحوں کی کوئی قیمت ہو۔ لیکن ان کا ادبی کارنامہ "غالب" ہے۔ اور تاریخی کارنامہ "سید احمد شہید" جس کی ضخامت ہزار صفحوں سے اوپر ہے۔ اور طاعت کے متعلق کچھ معلوم نہیں کہ کس منزل میں ہے۔

مہر نے عالمی ملکوں کی سیاحت بھی کی ہے۔ علامہ اقبال کابل گئے تو انھیں ہمراہ لے گئے۔ سر محمد شفیع گول میز کانفرنس میں گئے تو انھیں لندن لے گئے۔ مولانا ظفر علی خاں حجاز گئے تو آپ ان کے ساتھ تھے۔

جہاں تک ذہنی معتقدات کا تعلق ہے۔ ہمیشہ مولانا ابو الکلام سے رشتۂ مودت قائم رکھا۔ لیکن سیاسی سفر میں عموماً اُن فرزندانِ سلطنت کا ساتھ دیا، جن کا ضمیر و خمیر برطانوی مقاصد کی ضرورتوں کے تابع تھا۔

قد لانبا ہے، رنگ گندمی ہے لیکن جھریوں نے قدرے جھریا دیا ہے۔ آنکھوں پر عموماً شیشے رہتے ہیں ہمیشہ شلوار اور اچکن پہنتے ہیں۔ ابھی تک سر پر ترکش کیپ ہوتی ہے، کبھی کبھار جناح کیپ بھی اوڑھ لیتے ہیں۔ لہجہ ٹھیٹھ پنجابی ہے۔ لیکن گفتگو میں شاذ ہی ان کے سامنے کوئی ٹھہر سکتا ہے۔ اب طبیعت میں غصے کے آثار زیادہ اُبھر آئے ہیں۔ لیکن کسی سے بدلہ نہیں لیتے، کسی سے لڑتے نہیں۔ جب واقعات کی سنگین تصویریں سامنے آتی ہیں تو آہ سرد بھر کر خموش ہو رہتے ہیں۔

پاکستان ان سے فائدہ نہیں اٹھا رہا۔ لیکن اس میں ذرّہ بھر غلو نہیں کہ ہندستان میں مسلمانوں کی سیاسی تاریخ مہؔر سے بہتر کوئی شخص نہیں لکھ سکتا۔ وہ ان واقعات کے شاہد ہی نہیں معمار بھی ہیں۔

مولانا محمد علی نے ایک دفعہ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا مہؔر سے مخاطب ہو کے کہا تھا۔ ظفر علی خاں۔ بھئی تم صحافی نہیں انشا پرداز ہو، اور صحافی یہ مہؔر ہے مہؔر:

☆☆☆☆☆
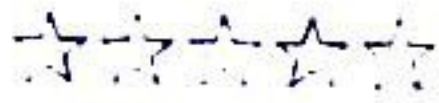
مرتضیٰ احمد میکش

ان کے متعلق بہت رائیں ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ انھیں "درویش" کہتے ہیں۔ کچھ انھیں "فرعون" سمجھتے ہیں۔ بعض کے نزدیک آٹھوں گانٹھ کمیت ہیں اور بعض اسے بے پیندے کا لوٹا خیال کرتے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں؟ لیکن یہ ضرور ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہمعصروں سے ماورا سمجھتے ہیں۔ کبھی سلام میں پہل نہیں کرتے، کبھی عوام میں خلط ملط نہیں ہوتے۔ ان کے تحت الشعور میں یہ خیال ضرور رہا کہ وہ اخبار نویسوں میں محمد علی جوہر ہیں۔ لیکن انھیں جلد ہی معلوم ہو گیا کہ ان کا یہ زعم نقش بر آب ہے۔

راقم الحروف کو ان کے متعلق دو باتیں ذاتی طور پر معلوم ہیں:

اولاً یہ کہ وہ اپنے ہمعصروں کی طرح اپنے قلم کو جا و بیجا بیچنے کے عادی نہیں ہیں۔

ثانیاً یہ کہ جب ان پر فاقے ٹوٹتے تو انھوں نے پنجاب گورنمنٹ کی ہزاروں روپے کی پیشکش کے باوجود امان اللہ خاں کے خطوط بیچنے سے انکار کر دیا تھا۔

ان کی اردو امراؤ القیس کی گود میں کھیلتی رہی ہے اور حاجی بابا اصفہانی کا دودھ پی پی کو جوان ہوئی ہے۔ انھوں نے میر انشا کے بعد کی اردو کو صحافت میں رواج دینا چاہا۔ جس سے ان کی قابلیت کا اظہار تو ہو گیا۔ لیکن صحافت کا عمومی مزاج غتر بود ہو گیا۔

انا ان کی غذا ہے، تخلیہ اوڑھنا بچھونا۔ وضعدار بھی ہیں اور خوددار بھی۔ میں نے انھیں نہ تو کبھی ہنستے دیکھا ہے اور روتے، بس ایک صابر و شاکر انسان ہیں۔ ملا تو کھا لیا، نہ ملا تو صبر و شکر کیا۔ ان کا پنجاب کے صحافیوں میں وہی مرتبہ ہے جو پنجاب کے سیاسیوں میں غازی عبدالرحمٰن کا ہے۔ حسرت کی طرح انھوں نے بھی مختلف روزناموں کا سفر کیا ہے۔ لیکن کہیں ٹھہرے نہیں

دن کہیں رات کہیں، صبح کہیں شام کہیں

صحافت میں ان کے دو بچے تھے۔ ایک لے پالک تھا۔ ''احسان'' جب اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ تو ملک نور الٰہی نے مناسب نہ سمجھا کہ ان کی سر پرستی میں رہنے دے انھیں اس کے کھلنڈرا ہونے کا وہم ہو گیا تھا۔ دوسرا بچہ اپنا تھا۔ ''شہباز'' وہ لنڈورا ہو گیا تو بردہ فروشوں کے ہتھے چڑھا۔ اور وہ پشاور لے گئے۔ اب اس کی نگہداشت ملک نور الٰہی کرتے ہیں۔ اور ادارات ہمارے عزیز محمد شریف فاروق کے سپرد ہے۔ مانخیر شما بسلامت۔

☆☆☆☆☆

سردار عبدالرب نشتر

مولانا ابوالکلام آزاد نے وزارتی مشن کے زمانے میں راقم الحروف سے کہا تھا، اگر مسلم لیگ کا مزاج عبدالرب نشتر کی سطح پر ہوتا تو مفاہمت کے دروازے پر دستک دینے میں زیادہ آسانی ہوتی، لیکن پھر انھوں نے خود ہی ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا:

"میرے بھائی! سیاسیات کے جھمیلے انسانی دلوں کے درمیان کچھ ایسی دیواریں چن دیتے ہیں کہ ان کی سنگینی کو عہد عتیق کی دیوار چین بھی نہیں پہنچتی ہے۔"

وہ مزید کچھ کہنا چاہتے تھے کہ اجمل خاں (مولانا کے پرسنل سیکرٹری) آگئے اور کہا "جے پرکاش آئے ہیں"۔

اور اس طرح ایک اچھی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ خواجہ حسن نظامی نے کسی دوست سے کہا تھا، نشتر قد و قامت کے اعتبار سے "قطب صاحب کی لاٹھ" اور رنگ و روغن کے لحاظ سے تاج محل ہیں۔ دراز قامت، گورا رنگ دوہرا بدن، خوش پوشاک، اور خوش گفتار، موج کی طرح چلتے اور صبا کی طرح بولتے ہیں۔ ایک دوست کا خیال ہے، ان کی گھنی اور لمبی مونچھیں ان کے کتابی چہرے پر "قرارداد مقاصد" کی طرح خوشنما معلوم ہوتی ہیں۔

طبعاً شاعر، لیکن عادتاً شعر کہنے سے محترز، قلم میں بانکپن اور زبان میں لوچ ہے۔

قدرت نے ان میں بہت سی خوبیاں بیک وقت جمع کر دی ہیں، شاعر ہیں، ادیب ہیں، خطیب ہیں سیاست داں ہیں۔ قائد اعظم زندہ تھے تو ان کے معتمد علیہ تھے، بلکہ صحیح تو یہ ہے کہ آج کی قیادت میں کوئی شخص یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ وہ ان سے زیادہ قائد اعظم کے قریب رہا ہے، لیکن جدید کابینہ کی کوئی تصویر چھپتی ہے تو بالا بلند نشتر کے چہرے کی مسکراہٹ سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے غیر مرئی حروف میں کہہ رہی ہو، ع

دراز دستیٔ ایں کوتاہ آستیناں بیں

نواب بہادر یار جنگ کے بعد وہ مسلم لیگ کے واحد عوامی مقرر ہیں۔ ان کی خطیبانہ

استعداد کو حاکمیت کی بعض منولیتوں نے کسی قدر گزند ضرور پہنچایا ہے لیکن اب بھی، ع

شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

نشتر نے سیاست کے سفر میں بہت سی وادیاں قطع کی ہیں، انھیں مولانا محمد علی جوہر سے ذہنی تلمذ ہے، وہ تحریکِ خلافت میں اُن کے ہمنوا تھے، باد شاہ خاں سے اختلافات پیدا ہو گئے، تو کانگرس کو چھوڑ دیا، اس زمانے میں انھوں نے جیل یاترا بھی کی۔ خاکساروں سے دلچسپی کو قائم رکھا، اتحاد ملت کے دوستوں سے بھی تعلق استوار رہا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے ذاتی مراسم کو عمر بھر مجروح نہیں ہونے دیا جب قائدِ اعظم نے ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا بیڑہ اٹھایا تو سرحد میں قائد اعظم کے نائب سمجھے جاتے تھے۔ "پرتاپ" نے ایک دفعہ لکھا تھا۔ "پنجاب کے جناح کا نام برکت علی ہے اور سرحد کے جناح کا نام.... عبد الرب نشتر"۔

آج بھی مسلم لیگ کے نو ساختہ راہنماؤں میں اگر کسی شخص کے لیے ملک کے عوام میں قدر و منزلت کے جذبات بقای ہیں تو وہ صرف نشتر کے لیے ہیں۔ ان کی اس مقبولیت پر ان کے ساتھی حسد کرتے، ان کے دوست خوش ہوتے ہیں۔ن

نشتر خدا پرست ہی نہیں، پیر پرست بھی ہیں، اُن کے روحانی مرشد حضرت شاہ محمد غوث علیہ الرحمتہ کا مزار، دہلی دروازے کے باہر دفتر احرار کے بالمقابل، واقع ہے۔ اور ان کے مزار پر تاریخ وصال کا جو سنگی قطعہ لگا ہوا ہے وہ نشتر ہی کی فکر کا نتیجہ ہے۔ نشتر نے اپنے اس احساس کو کبھی ترک نہیں کیا کہ وہ عوام کے لیے ہے۔ اور عوام کی ہمراہی کے بغیر جمہوریت کا ہر دعویٰ غلط ہے۔ نشتر سب کا دوست ہے اور اس کا کائی دشمن نہیں سوائے اُن لوگوں کے جو اس سے اپنی ناگفتہ بہ مصلحتوں کے کے باعث عناد رکھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

نواب زادہ نصر اللہ خاں

نواب زادہ نصر اللہ خان کا تخلص تو ناصر ہے اور فارسی کے اشعار بھی خوب کہتے ہیں، لیکن اپنے ذوق کے لیے، سنانے یا چھپوانے کے لیے نہیں۔ سیاسیات میں ان کا تخلص حُقہ ہے۔ حقے کے بغیر یہ مکمل ہی نہیں ہوتے۔ سفر و حضر میں بھی ان کے غم گسار کا نام حقہ ہے۔ خدا معلوم گرامی صاحب زیادہ حقنی ہیں یا نواب زادہ، بہر حال رہنے والے دونوں ایک ہی ضلع کے ہیں اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ مظفر گڑھ کے ضلع میں آم اور حقہ کثرت سے کاشت ہوتے ہیں۔ میر تقی میرؔ نے زندگی بھر پری چہرہ لوگوں کی یاد میں اتنی آہیں نہیں بھری ہوں گی، جتنا دھواں نواب زادہ صاحب نے جمہوریت کی یاد میں اڑایا ہے۔ وضع دار، شریف، متواضع، خلیق، ذہین، مدبر، دُھن کے پکے، قول کے سچے، طبیعت میں درویشی، مزاج میں دور اندیشی، خاندانی اعتبار سے رئیس ابن رئیس، لیکن رعونت نہ تکبر، جیسا ملا پہن لیا، جو ملا کھا لیا، شکایت کسی کی نہیں کرتے، حکایت بھولتے نہیں، ہشتہ ناز، سراپا نیاز، دل میں گداز، سینہ پر راز، پرانے لباس میں نیا انسان، ٹوپی تحریک خلافت کی یادگار، اچکن مسلم لیگی، کرتا اور شلوار دونوں جاگیر دار، جوتی نوابی، چوری ہو جائے تو دعا دیتے ہیں رہزن کو، ناک کھچا ہوا، دہن کھلا ہوا، لیکن خطاطت کے نزدیک سے نہیں گزرتے، سیاسی تاش میں ترپ کے پتے لگاتے وقت کھلاڑیوں کی ذہانت سے آنکھیں چار کر لیتے ہیں۔ احرار کی پرانی نسبتوں کے باعث خوش مہم، نہ عیب جُو نہ عیب چین، مغربی پاکستان میں سہروردی کے سب سے زیادہ معتمد، زبان میٹھی، لہجہ شستہ، گالی کے نام ہی سے ناآشنا، فارسی کے رسیا، اردو کے شیدائی، انگریزی میں اُتارو، سواد خط انتہائی خوبصورت۔ ماتھے پر قصیدے کی تمکنت، آنکھوں میں غزل کا سرور، دل آئینہ، نہ کسی کو مرعوب کرتے نہ کسی سے مرعوب ہوتے ہیں۔ جاگیر داروں کی ایک بھی روایتی برائی ان میں نہیں، نہ اُس بازار کے مسافر، نہ اُس بازار کے راہی، شب و روز سیاسیات ہی کا سفر کرتے ہیں۔ خان گڑھ ان کی اور ان کے خاندان کی "ریاست" ہے۔ صوبائی اسمبلی کے

ممبر وہیں سے منتخب ہوئے تھے، پھر قومی اسمبلی کے رکن بھی اسی حلقے انتخاب سے چنے گئے، اب کے ان کے مقابلے میں جو نوجوان کامیاب ہوا ہے، وہ منتخب نہیں ہوا بلکہ کروایا گیا ہے دونوں میں کوئی نسبت بھی نہیں ہے۔

غرض نواب زادہ نصراللہ خاں ہر لحاظ سے ایک مکمل انسان ہیں، لیکن اپنی تمام خوبیوں اور دل کشیوں کے باوجود اپنی کلاس کی بہت زیادہ چاہ کرتے ہیں۔ اس وقت انھیں شورش کاشمیری سے زیادہ مخدوم زادہ حسن محمود اور حمید نظامی سے زیادہ نواب زادہ ولایت علی عزیز ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

میاں نظام الدین حیدر

سرو قامتی میں سے دو تہائی نکالیں تو نظام الدین حیدر کی قامت بنتی ہے۔ چھریرا بدن، کھلتا ہوا رنگ، گول آنکھیں۔ ہنستا ہوا چہرہ، ستواں ناک، گفتگو طرازی سے مجتنب، لیکن دھن کے پکے، ہٹ پہ قائم، خوش پوشاک، خوش خوراک۔ پہلے ریاست بہاول پور میں ملازم اور ایک بڑے عہدے پر مامور تھے، لیکن اب وہاں کی حزبِ اختلاف کے قائد ہیں۔ بہاول پور کی جناح عوامی لیگ انھی کے دم قدم سے ہے۔ طبعاً وفاداری بشرط استواری کے قائل ہیں۔ ایک ثقہ روایت کے مطابق دھوکا دیتے نہیں البتہ دھوکا کھاتے ضرور ہیں۔ ایک بڑے ریاستی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ امیرِ بہاول پور سے قرابت داری ہے۔ لیکن جاگیری طنطنہ نام کو نہیں، ایک طرح کی درویشی کے قائل ہیں۔

یورپ کے ملکوں بلکہ شہروں تک کی سیر کی ہے۔ اپنا سیاحت نامہ لکھتے تو خاصا دلچسپ ہوتا۔ لیکن جب سناتے ہیں تو ذہن خود بخود ان کی طرف کھنچا جاتا ہے۔ انگریزی بڑے رکھ رکھاؤ سے بولتے ہیں۔ اردو بولنے میں بھی قاف شین درست ہوتا ہے البتہ جب بہاول پور کی میٹھی بولی بولتے ہیں تو انگوری شراب کی سی مستی پیدا ہوتی ہے۔

(۲)

نظام الدین حیدر کبھی "عزیز ملت" شہید سہروردی کے "معتمدین" میں سے تھے اور دل سے قریب، آج کل "معتوبین" میں سے ہیں اور دل سے دور۔

کہ آئین جہاں، گاہے چنین، گاہے چناں باشد

ثنات لیتر ہے۔ قیمت بہتر، کتابی چہرہ، چھریرا بدن، کھلا ماتھا، روشن آنکھیں۔ مسکراتے ہوئے خدوخال، رنگ سانولا، سراپا شرافت، چلتی پھرتی تصویر، احباب سے زخمی۔

عوامی لیگ کے "زوال" میں اس کے ہمراہ تھے۔ گھر پھونک کر تماشا دیکھا، اب "اقبال" میں اس سے باہر ہیں اور

زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن

ڈاکٹر خان صاحب کی دعوت پر ری پبلکن میں شامل ہو گئے ہیں۔ اب کے یہ عقدہ ری پبلکن کی کنونشن میں کھلا کہ ایک سلجھے ہوئے مقرر بھی ہیں۔ الفاظ ڈھلے ڈھلائے اور ترشے ترشائے بولتے ہیں۔

بہاولپور میں اس وقت حزب اختلاف کی بنیاد اٹھائی، جب تمام ملک میں خان لیاقت علی خان مرحوم و مغفور کا طوطی بولتا تھا اور اپوزیشن کو غداری قرار دیا جاتا تھا۔

شہید سہروردی کو آپ کی اس ادا نے متاثر کیا، دونوں ایک دوسرے سے قریب ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ جن دنوں عوامی لیگ پر کڑاکے کے فاقے تھے۔ آپ نے پانی کی طرح روپیہ بہایا۔ واقفانِ حال کو معلوم ہے کہ عوامی لیگ اور اس کے قائدوں پر پونے تین لاکھ کے قریب روپیہ صرف کر چکے ہیں۔ لیکن

یک حرفِ کاش کہ بصد جا نوشتہ ایم

آج کل دوستوں کی "زد" میں ہیں۔ جو پھول تھے، وہ خار ثابت ہو رہے ہیں۔ کسی سے شکایت نہیں کوئی گلہ نہیں

مے ویم بہ راہے کہ کارواں رفتست

☆☆☆☆☆

نعیم صدیقی

جماعت اسلامی کے معنوی چشم وچراغ بلکہ "چراغ راہ" ہر فن مولیٰ۔ شاعری میں ماہر القادری کا چربہ۔ اقبال کے جذبے جوش کے الفاظ، احسان کے موضوع، فیض کی لٹک، ظفر علی خان کی کھٹک اور قاسمی کی رمق کو بقدر استطاعت اکٹھا کیا۔ اخبار کے چٹو میں گوٹا پھر شرع کے پانی میں جوش دے کر ایک جوشاندہ تیار کیا اور عرق ماء اللحم کے طور پر پیش فرمایا جس پر اسلام پسند مصنفین کے سرخیل کی مہر لگی ہوئی ہے۔

نثر کے ہر پھٹے میں ٹانگ اڑاتے ہیں۔ مثلاً صحافی ہیں لیکن مرحوم اظہر امرت سری کا عکس، مصنف ہیں لیکن مولانا عبدالسلام ندوی کا ثنیٰ، ناول بھی لکھتے ہیں لیکن نسیم حجازی بننے کا شوق کہیں رکنے ہی نہیں دیتا، ڈرامہ بھی لکھتے ہیں، لکھتے کیا فرماتے ہیں۔ لیکن مرزا ادیب کی صدائے بازگشت ہیں۔ تنقید بھی فرماتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ اپنے مدرسۂ فکر کے عبادت بریلوی ہیں۔ افسانے میں بھی پیچھے نہیں دت بھارتی کے جنسی افسانوں کا صحیح توڑ ہیں۔ مقرر بھی ہیں اور بہت اچھے مقرر، لیکن اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ خطابت میں نئے مدرسۂ خیال کے داعی ہیں۔ اپنے آپ کو اسلام کا "فرزند دلبند" سمجھتے ہیں۔ حضرت مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے "عشرۂ مبشرہ" میں سے ہیں۔ زعم یہ ہے کہ۔

دامن نچوڑ دوں تو فرشتے وضو کریں

لیکن تردامنی سے عار ہے۔ جو ان کے حلقہ میں نہیں۔ انھیں غیر شعوری طور پر خارج از اسلام ہی سمجھتے ہیں۔ قاضی احسان احمد شجاع آبادی کے الفاظ میں:

"خدا نے گنجے کو ناخن دے دیے ہیں۔"

مذہب کی خصوصیت یہ بیان کی جاتی ہے۔ کہ وہ انسان کے دل میں گداز پیدا کرتا اور طبیعت میں عجز لاتا ہے۔ لیکن ان کا معاملہ نمایاں طور پر مختلف ہے۔ گداز تو خیر ان کے ہاں سے رخت سفر باندھ کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو چکا ہے۔ البتہ عجز کی جگہ کبر نے لے لی

ہے۔

نام نعیم بروزنِ لئیم۔ کام فنکاری کے طور پر قلمکاری۔ عمر کے اس حصے میں ہیں، جس حصہ میں "فریب" جیسی پُر فریب نظمیں لکھی جاتی ہیں۔ قد حضرت کوثر نیازی کو کھینچ کر دوگنا کردیں تو ساڑھے پانچ فٹ بنتا ہے، بدن کاغذی، ناک کھجوری، آنکھیں شیشوں کے جزدان میں ڈھکی ہوئی۔ ماتھا تنگ، موری کے پاجامے کی طرح چوڑی دار، زبان دیکھی نہیں پڑھی ہے۔ لہجہ کہیں نسخ کہیں نستعلیق ٹھوڑی پر مٹھی بھر ڈاڑھی، مونچھیں غالباً نظم معریٰ میں ہیں۔

الغرض سراپا باغ و بہار :

ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

☆☆☆☆☆

ملک فیروز خاں نون

سنا تو نہیں دیکھا ضرور ہے، چوں کہ صورت پر کبھی غور نہیں کیا، لہذا چہرے مہرے کی باتیں مشاہدہ میں نہیں آئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب تقدیر بانٹی تھیں تو ان کے خانے میں کرسی در کرسی لکھ دیا تھا، جب تک انگریز رہا، آنریبل رہے جب انگریز نکل گیا تو ہز ایکسی لنسی لازمی ہو گئے ان کے خطابات حروف تہجی سے زیادہ ہیں، آپ نے مسلم لیگ کی تحریک میں "جیل یاترا" بھی کی ہے اور اس کی دلچسپ کہانی شوکت حیات کی زبانی اقدام میں چھپ چکی ہے۔

سر فضل حسین کی تخلیق اور سر سکندر حیات کی یادگار ہیں، لیکن ان کے جانشیں نہیں۔ ان لوگوں کے پاس جو کچھ تھا اپنے ساتھ قبروں میں لے گئے، اگر کچھ رہ گیا ہے تو وہ ان کی فراست کے پنجر ہیں۔

فیروز خاں نون "قلم و زبان" دونوں کے "دھنی" ہیں، ان کی شاہکار تصنیف خوشبو دار مٹی "(SCENTED DUST.)" ہے اور ان کا کلام فرحت التیام وہ شہ پارہ ہے، جس پر دہلی کے بانکے اب تک سر دھنتے ہیں۔

قد آور ہیں، بدن چھریرا ہے، آنکھوں پر شیشے چڑھے رہتے ہیں، لہذا کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کیا سوچتے اور کیا بولتے ہیں۔ اس سن میں بھی جوان ہیں، اور سچ تو یہ ہے کہ دولت اور طاقت کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ مولانا ظفر علی خاں نے جن افراد پر "خامہ فرسائی" کی ہے ان میں آپ بھی ہیں۔ سرحد میں پیدا ہوتے۔ تو یوسف خٹک ہوتے، بلوچستان میں جنم لیتے تو قاضی عیسیٰ ہوتے، سندھ میں ظہور ہوتا، تو قاضی فضل اللہ ہوتے، بنگال میں ہوتے، تو ممکن ہے ابوالفضل حق ہوتے۔ بحمد اللہ پنجابی میں ہیں، اس لیے فیروز خان نون ہیں۔

ہزاروں خوبیاں ایسی کہ ہر اک خوبی پر دم نکلے

☆☆☆

نیر واسطی

نیر واسطی یوں تو حکیم بھی ہیں۔ اور شائد پاکستان بھر میں کوئی حکیم ان سے بہتر نباض یا معالج نہیں ہے، لیکن وہ نرے حکیم ہی نہیں بلکہ دشمنوں کے بھی دوست ہیں۔ ان کا سراپا ایک جاندار قہقہہ ہے۔ اقبال پارک کے نکڑ پر، مستی دروازہ سے باہر، بسنتی رنگ کی ایک سفید عمارت میں جب کوئی قہقہہ گونجے تو سمجھیے کہ حکیم نیر واسطی مسکرا رہے ہیں۔ وہ ایک زبردست قہقہہ میں معاشرے کے خلاف، بیماریوں کیخلاف اور ان لوگوں کے خلاف جو سمجھتے ہیں کہ دوستی کی قدریں مر چکی ہیں۔ ان کے مطب کا دروازہ شاعروں، ادیبوں، مدیروں اور سیاسیوں کے لیے ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ وہ دوستوں پر جان چھڑکتے ہیں۔ انھیں اپنی جان سے کہیں زیادہ دوستوں کی جان عزیز ہوتی ہے۔

لانبا قد، اکہرا بدن، گندمی رنگت، ستواں ناک، تیز آنکھیں، آواز میں دھماکا، سادہ لباس، سادہ طبیعت، مزاج ان دونوں سے سادہ۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

(۲)

نام علی احمد، ذات سید، کام طبابت، تخلص نیر، واسطی کی وجہ کیا ہے؟ چہرہ لکھتے وقت اب خیال آرہا کہ اس کی وجہ کوئی تو ضرور ہوگی۔ فی الحال یہ خیال کر لیجیے کہ نیر کی تانیث کا نام ہے۔ حکومت پاکستان نے ستارۂ خدمت کا خطاب پانچ چھ سال ہوئے عطا کیا تھا لیکن واقعتہ وہ ستارۂ خدمت سے کہیں بڑے اعزاز کے مستحق ہیں، انھوں نے جب وہ خود اونے پونے زندگی بسر کرتے تھے، یعنی لاہور میں قدم رکھا تھا، پچاس برس پہلے اور آج جب وہ ہر گوشہ زندگی میں انعامات سے ایزدی سے بہرہ یاب ہیں اور دولت ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ نہ تو

اپنی خو بو بدلی ہے، نہ اپنی درویشی کو ترک کیا ہے، اور نہ فقر و استغنا کو تلانجلی دی ہے ان کے چشمۂ فیض سے بے شمار لوگ جامِ صحت حاصل کرتے ہیں۔ ان کے مطب کا دروازہ شاعروں، ادیبوں، جرنلسٹوں، سیاستدانوں اور اس کے بالواسطہ وبلاواسطہ دوستوں کے لیے ہر لحظہ کھلا رہتا ہے ان لوگوں کا علاج وہ اپنی اگر سے کرتے، اپنے مطب میں کرتے، مطب سے باہر کرتے اور جانکاہی سے کرتے ہیں اور یہ ان کا پچاس سال سے شعار ہے

نباض اس پاے کے ہیں کہ جس پاے کے سید عطاء اللہ شاہ بخاری خطیب تھے، قدرت نے ان کے ہاتھ میں شفا رکھی ہے۔ شاعر وہ شروع ہی سے تھے۔ نیر واسطی اور اختر شیرانی کوچۂ عشق میں اکھٹے نکلے تھے۔ اختر رسوائی کی شاہراہ پر چلے گئے، نیر واسطی دانائی کی شاہراہ پر آ گئے۔ لیکن اختر کی موت کے بعد نیر کا ملخۂ شعر سلمٰی کے تخیل کی طرح جوان ہو گیا۔ اب نیر واسطی پیکر ہیں شعر و حکمت کے علاوہ سیاحت و سیاست کا، ادب ان کا ہم سفر ہے، شاعری ہم زبان، طبابت خانہ زاد، سیاست روزمرہ، خود ایک جاندار قہقہہ ہیں، مستی دروازے سے باہر اقبال پارک کے نکڑ پر جب کوئی جاندار قہقہہ گونجے تو سمجھیے کہ حکیم نیر واسطی مسکرا رہے ہیں وہ ایک زبردست قہقہہ ہیں، معاشرے کے خلاف، بیماریوں کے خلاف اور ان لوگوں کے خلاف جو یہ سمجھتے ہیں کہ دوستی کی قدریں مر چکی ہیں۔

پچھلے کئی سال سے ان کے پاؤں میں چکر ہے وہ تقریبا دو تہائی دینا پھر چکے ہیں صبا کی طرح جاتے اور خیال کی طرح لوٹ آتے ہیں، انھوں نے اپنے سفر کو برباد نہیں کیا بلکہ اس سے ملک و قوم کو بالا کیا ہے۔

قرشی صاحب کی عمر کی طرح ان کی عمر کا پتہ لگانا بھی مشکل ہے ہم تو انھیں ابھی اپنا ہی ہم عمر سمجھتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ جس زمانے میں ہم چوتھی جماعت کے طالب علم تھے ان کا پہلا مجموعۂ کلام خاص و عام سے خراج تحسین حاصل کر رہا تھا۔ کیا بہتر نہ ہو گا کہ ہم ان کے لیے "جہاں گرد" کا لقب تجویز کریں اور وہ قبول فرمالیں لیکن فقیر کی آواز چوں کہ بالا بلندوں تک شاذ ہی پہنچتی ہے اس لیے اپنی کوتاہ قامتی کے اندیشے سے یہ تجویز خود ہی واپس لے رہے ہیں، بلکہ اس پر خط تنسیخ کھینچے۔

بوٹا قد، اکہرا بدن، گندمی رنگت، ستواں ناک، آواز میں دھماکہ بلکہ کڑاکا تمام
آسایشوں کی فراوانی کے باوجود فقیر منش انسان، غرور کا شائبہ تک نہیں، شرافت و نفاست اور
عجز و نیاز کے عناصر اربعہ کی مورتی

چھپاتا کوئی سی چیز نہیں، لیکن جب سے یونان و ترکی اور ایران و عراق کا سفر کیا ہے
تب سے سلمیٰ کی ہجولیوں کے افسانہ ہائے ناز و نیاز:

ترس رہے ہیں نواہائے دلکشا کے لیے

اور اس کا دوسرا مصرع ان کے ذوق سلیم کی گرہ کشائی کا منتظر ہے۔

☆☆☆☆☆

وجے لکشمی پنڈت

موتی لال کی بیٹی جواہر لال کی بہن، وجے بھی اور لکشمی بھی!

مائیں بچے جنتی ہیں ایسے بہادر خال خال

موتی لال زندہ ہوتے تو بیٹے اور بیٹی کے اس عروج پر ان کی بوڑھی ہڈیاں مسکرا اٹھتیں۔ کبھی موتی لال ہندوستان کے عظیم ترین رہنماؤں میں سر فہرست تھے۔ آج ان کا بیٹا اور ان کی بیٹی واقعی عظیم ہیں اور ان کا نام عالمی سیاسیات میں ایک دل فریب شہنائی کی طرح گونجتا ہے۔ ہندوستانی راہنماؤں میں دو شخص ایسے تھے جن سے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان کی آواز ریشم سے زیادہ باریک ہوتی ہے۔ ایک آصف علی، دوسرے وجے لکشمی۔ وجے لکشمی کو پہلے پہل لکھنؤ میں دیکھا۔ تو ان کی بات چیت میں "چپ چاپ کا رنگ غالب تھا۔ گویا ان کے ہاں ایک خاص زاویے سے بلند آواز کا تصور ہی ناپید ہے۔ وہ بول نہیں رہی تھیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مینا برج میں کوئی دلکش نغمہ دھیرے دھیرے کروٹ لے رہا ہے۔

دوسری دفعہ عبوری حکومت کے پہلے ہی دن پنڈت جواہر لال کے سرکاری بنگلے میں دیکھا۔ پنڈت جی، سروجنی نائیڈو، اندرا گاندھی اور وہ کانگرس کے ترنگے جھنڈے کو اپنے لان میں نصب کر رہے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے عقبی باغیچہ میں اذان بلند کی تو وہ بچوں کی طرح ہمک کر باہر آگئیں اور پھر مسکرا کر اندر چلی گئیں!

ان کے بال ان کے رنگ کی طرح سفید ہو چکے ہیں اور بھائی کی طرح ان کے چہرے پر جھریوں کے آثار نمودار ہے ہیں۔ لیکن ان کا دل ابھی تک جوان ہے۔ ان کی عالمی آواز بڑی توجہ سے سنی جاتی ہے۔ وہ بھائی کی بہ نسبت زیادہ ڈپلومیٹ ہیں۔

بعض خلوتیان راز کا بیان ہے کہ ایک زمانے میں ان کا کامریڈ مولوٹاف سے سیاسی گٹھ بندھن نہ ہوتا تو ممکن تھا کہ ہندوستانی سیاسیات کا نقشہ مختلف بنتا۔

وہ روس اور امریکہ دونوں جگہ ہندوستان کی سفارت کر چکی ہیں اور ان کا نام بھائی

کے نام کی طرح تاریخ کے صفحوں میں محفوظ ہو چکا ہے۔

جواہر لال لڑکی ہوتے تو ممن ہے وجے لکشمی نہ ہوتے لیکن وجے لکشمی جواہر لال ہوتیں تو پنڈت جی کی طرح جذباتی نہ ہوئیں۔ بلکہ محض سیاستدان ہوتیں، پراسرار!

☆☆☆☆

وقار انبالوی

عمر ستر برس سے اوپر، لیکن آثار چالیس اور پچاس کے درمیان، آواز کھنکتی ہوئی، لہجہ گرجتا ہوا۔ شورش کاشمیری ساتویں میں پڑھتا تھا جب وقار انباری کا نام شاعرانہ محفلوں میں گونج رہا تھا۔ اُن دنوں وہ ادبی دینا، ہمایوں اور "شاہکار" کے شاعر غرا تھے کہ ان کا قلم مصور کا مؤقلم تھا۔ پرتاپ، ملاپ وغیرہ کے شاعر خاص تھے کہ روزمرہ کے حوادث و وقائع پر ان کے قلم کی اُڑانیں پھریروں کی اڑانوں سے کم نہ تھیں۔ ارتجال میں ظفر علی خاں کی مثال تھے، زود نویسی اور بدیہہ گوئی میں انھیں قدرت تامہ حاصل ہے۔ لوگوں کے لیے گفتگو کرنا مشکل ہوتا ہے، ان کے لیے شعر کہنا مشکل نہ تھا اور یہی حال عمر کے اس دور میں ہے۔ ان کے لیے شعر کہنا اتنا ہی آسان ہے جتنا گھنگھور گھٹا کے لیے برسنا، ہوا کے لیے فرائے بھرنا، یا بلبل کے لیے موسم بہار میں چہچانا، پھر ان کے اشعار محض اشعار نہیں ہوتے کھرا سونا ہوتے ہیں۔ جس میں سبھی قسم کے زیور ڈھالے جاتے اور دلہن کا سولہ سنگھار ہو سکتا ہے۔ ان کا قلم ہر صنفِ سخن پر حاوی ہے۔ غزل وہ کہہ لیتے، قصیدہ ان کے ہاں سر سجدہ رہتا، ہجو ان کی غلام، نظم پر انھیں قدرت، سیاسی شاعری سے لے کر رومانی شاعری تک جتنے پیچ و خم ہیں، وقار انبالوی ان سب سے آشنا ہے۔ کبھی شاعری کے کسی دروازے سے وہ سر جھکا کے نہیں گزرے، وہ سینہ تان کر نکلنا جانتے ہیں۔ ناانصافی ان کے ساتھ یہ ہوئی ہے کہ صحافت کی سیر و سیاحت کے باعث ادبی کھلنڈروں نے اپنے تذکروں میں ان کا ذکر نہیں کیا، ورنہ رسالوں کے شاعر ان کے قلم کی ادنیٰ جنبشوں سے تیار ہوتے رہے ہیں۔ نثر ان کی چھوٹی رانی ہے، جس طرح انھوں نے زندگی بھر بہت سے نکاح کیے یعنی کوئی سات بیویاں رحلت کر چکی ہیں اور دو بفضل تعالیٰ بقیدِ حیات ہیں۔ اسی طرح بہت سے روزناموں کے ساتھ ان کا عقد رہا۔ کئی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کئیوں کو طلاق دے دی۔ اب دل کے انکاؤ کا سامان کر رکھا ہے، یعنی عادت کے لیے لکھتے لکھاتے یا زندگی گزارنے کے لیے قلم اٹھاتے ہیں۔

قد میں کوئی خم نہیں اڑتا ہی چلا جاتا ہے۔ چہرے پر بہت سے مصرع ہائے طرح ہیں۔ آنکھوں پر شیشے جڑے رکھے ہیں۔ لوگوں کے دل سیاہ ہوتے ہیں، ان کا رنگ سیاہ ہے، سیاہ نہیں گہرا گندمی، چال ڈھال میں اب بھی وہی تیزی و طراری ہے۔ حکمرانوں میں اہل علم ہوتے تو لازماً ان کی قدر افزائی ہوتی، لیکن کسی دور میں بھی ان کی پذیرائی نہ ہوئی، چناں چہ کے صاحبِ دیوان بڑھاپے پر طنز کرتے ہوئے سیکڑوں ہی آوارہ مصرعے مسندِ اختیار پر دو غزلہ ہو گئے ہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار!

☆☆☆☆☆

چہرے

آزاد ہند فوج کے آفیسروں اور نوجوانوں کے چہرے

”دہلی چلو، جدوجہد انقلاب کی سرگذشت“ سے ماخوذ
آغا شورش کاشمیری مرحوم کی یہ تاریخ ”اردو اکیڈمی لاہور“ سے ستمبر ۱۹۴۶ء میں پہلی بار
شائع ہوتی تھی۔ اب یہ نایاب ہے۔

کپتان احسان قادر

خوش رو، خوش گفتار اور خوش کردار نوجوان ہیں، سر عبدالقادر، سابق جج لاہور ہائی کورٹ کے فرزند ہیں، آپ کے والد پنجاب کی بزرگ ہستی اور اردو ادب کے خوش نما ادیب ہیں۔

کیپٹن احسان قادر "آزاد ہند فوج" میں آرگنائزر کے عہدے پر مامور تھے۔ مفتوحہ علاقوں کا انتظام آپ ہی کے سپرد ہوتا تھا۔

علامہ اقبالؒ نے آپ کے والد کو بانگ درا میں ان الفاظ سے خطاب کیا ہے:

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں
اہلِ محفل کو دکھا دیں اثر صیقلِ عشق
سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں
اس چمن کو سبق آئین نمو کا دے کر
قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہ عالم میں
خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

احسان قادر شاعر مشرق کی اس شگفتہ آرزو کا دلآویز نکھار ہے۔

کپتان ارشاد

سیکنڈ پنجاب رجمنٹ کی پانچویں بٹالین میں ملازم تھے۔ آزاد ہند فوج میں شامل ہو کر مختلف محاذوں پر داد شجاعت دی، آپ نے رنگون میں اتحادی فوجوں کے داخلہ تک سبھاش بابو کے حسب الحکم بحالی امن کے فرائض ادا کیے آپ نے پہلے مقدمے میں جس بے خوفی سے صفائی کی شہادت دی، وہ یادگار اور معلومات کے اعتبار سے تاریخی سرمایہ ہے۔

کپتان برہان الدین

مہتر آف چترال کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ آزاد ہند فوج میں اُس جاں نثار گروپ کے انچارج آفیسر تھے جو دشمن کی فوج میں گھس کر اطلاعات فراہم کرنے اور ہندوستان میں بغاوت پیدا کرانے کے فرائض سرانجام دیتا تھا۔

آپ ایک اُجلے دماغ کے دراز قد نوجوان ہیں، ارادہ چٹان کی طرح مضبوط اور دل آبشار کی طرح صاف ہے، ہر وقت چہرے پر سپاہی کی سنجیدگی تبسم کے ساتھ بکھری رہتی ہے، علامہ اقبال نے آپ ایسے نوجوانوں کے لیے ہی دعا کی تھی:

حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی !
خدا کرے کہ جوانی رہے تری بے داغ

آپ کا عدالتی بیان صاف گوئی کی نورانی موج ہے۔ آپ کی سزا سات سال ہے۔ معلوم نہیں آپ کو کونسی جیل میں رکھا گیا ہے، البتہ آپ کی یاد بہت سے دلوں کی عزیز متاع ہے۔

کرنل پریم سہگل

ہوشیارپور میں ۲۵ر مارچ ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد مسٹر جسٹس اچھرو رام لاہور ہائی کورٹ کے جج ہیں۔ زندگی کا آغاز جالندھر میں ہوا۔ ۱۹۳۰ء آپ کے اقربا لاہور آگئے۔ سنٹرل ماڈل اسکول لاہور سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج لاہور سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ پھر ملٹری کالج ڈیرہ دون کے امتحانی مقابلے کے لیے منتخب ہوگئے۔ ۲۹ر جنوری ۱۹۳۹ء کو کمشنڈ آفیسر بنادیے گئے۔ اور پانچویں بلوچ رجمنٹ میں تقرری ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو ملایا بھیجے گئے۔ وہاں سے سنگاپور اور پھر ملایا کے جنوب مشرقی ساحل کی طرف منتقل ہوگئے نومبر کے اخیر میں آپ کو قائم مقام کپتان بنادیا گیا۔ ۱۴ر فروری

۱۹۴۲ء کا جاپان کی حراست میں آگئے اور پندرہ فروری کو سنگاپور جاپانی قبضہ ہو گیا پھر ن ئیہ کیمپ میں نظر بند کے طور پر رہے، پھر آزاد فوج میں شریک ہو گئے، مختلف محاذوں پر لڑے، فوجی ہیڈ کوارٹر رنگون کے انچارج آفیسر اور ہیڈ کوارٹرز سپریم کمانڈ میں ملٹری سکریٹری کا عہدہ حاصل کیا۔ اسی طرح مختلف اوقات میں مختلف فرائض انجام دیے۔ جنگی مورچوں پر نہایت قابلیت کا ثبوت بہم پہنچایا اور بالآخر ۲۸/ اپریل کو اتحادی کمانڈر کے روبرو بحیثیت جنگی قیدی ہتھیار ڈالے۔ آزاد ہند فوج میں آپ کو کرنل کا رینک حاصل تھا۔

دراز قد کا یہ خوبصورت نوجوان کسی شاعر کی شگفتہ آرزو ہے جس کو میدان جنگ کی آب و ہوا نے اپنی طرف کھینچ دیا تھا۔

کرنل پھونسلے

پورا نام جگن ناتھ راؤ بھونسلے ہے، مشہور مرہٹہ شاہی خاندان بھونسلے کی یادگار ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں مہاراشٹر کے نیرودنامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ۱۴ برس کی عمر میں ڈیرہ دون کے پرنس آف ویلز کالج میں داخل کیے گئے۔ یہاں سے تعلیم ختم کرلی تو انگلستان میں اعلیٰ فوجی تعلیم کے لیے بھیجے گئے۔ ۱۹۲۸ء میں کمشنڈ آفیسر کا عہدہ ملا اور لنکا شائر رجمنٹ میں مامور ہوئے۔ ایک سال بعد رائل مرہٹہ انفنٹری میں تبدیل ہو گئے۔ ۱۹۳۷ء میں کپتان بن گئے۔ اسی سال حکومتِ ہند نے آپ کو شاہ جارج ششم کی تاجپوشی میں شامل ہونے کے لیے چنا اور والیان ریاست کے ساتھ بکھنگم محل کی شاہی تقریب میں شریک ہوئے۔

انگلستان سے واپسی پر آپ نے مہاراجہ گائیکواڑ آف بڑودہ اور دوسرے ساتھیوں کے ساتھ یورپ کے بڑے بڑے شہروں کی سیاحت کی۔ روس بھی گئے اور جاپان و امریکہ میں بھی پھرے واپسی پر آپ پہلے ہندوستانی تھے، جنھیں، جنرل اسٹاف ٹریننگ کورس کے لیے منتخب کیا گیا اور تربیت کے بعد لفٹیننٹ کرنل بنا دیے گئے۔ اس جنگ میں آپ کو سنگاپور میں گورکھا رائفلز انفنٹری کے ساتھ بھیج دیا گیا جب برطانوی فوجوں نے ہتھیار ڈال دیے تو آپ

پہلی ''آزاد ہند فوج'' میں شامل ہو گئے۔ سبھاش بابو نے جب عارضی حکومت قائم کی تو آپ و بھی وزیر بنایا گیا۔ آپ نے اس فوج میں چیف آف دی اسٹاف کا سب سے اعلیٰ عہدہ پایا، لفٹیننٹ ناگ نے کرنل حبیب الرحمٰن اور آپ کے حکم ہی سے ''آزاد ہند فوج'' کا ایکٹ تیار کیا تھا، آپ نے مختلف معرکوں میں اپنی دھاک بٹھادی۔

آپ کی بیوی سیواجی مرہٹہ کے دوسرے بیٹے راجارام کی اولاد میں سے تھی۔ آپ تمباکو نوشی سے پرہیز کرتے ہیں۔ آپ کی اولاد تین لڑکیاں ہیں بڑی کا نام لیلا، منجھلی کا اوشا اور چھوٹی کا رتنا ہے،

ایک شعلہ جو ۱۸۵۷ء بجھ گیا تھا، تاریخ کے عمل نے اس شعلہ کو آپ کے انسانی پیکر میں متحرک کردیا۔

کرنل حبیب الرحمٰن

میر پور جموں کے ایک ممتاز راجپوت خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے افراد خاندان ریاست کشمیر اور برطانوی ہند میں مختلف ممتاز عہدوں پر مامور ہیں، جن میں میجر جنرل سردار بہار، راجہ فرمان علی خاں، خان بہادر راجہ محمد افضل خان سابق ہوم منسٹر کشمیر و حال کمشنر ملتان ڈویژن، راجہ عبدالرحمان خاں قائم مقام چیف منسٹر ریاست راجہ محمد سرور وزیر وزارتِ جموں کے اسما قابل ذکر ہیں۔ آپ دسمبر ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے۔ پرنس آف ویلز کالج جموں سے بی اے کا امتحان اعزازی طور پر پاس کیا، پھر ڈیرہ دون ملٹری کالج میں داخل ہو گئے کامیابی کے بعد صوبہ سرحد میں تقرر ہوا پھر پنجاب آگئے۔ لاہور سے اپنی رجمنٹ کے ساتھ سکندرآباد چلے گئے۔ وہاں سے مارچ ۱۹۴۱ء کو سمندر پار بھیج دیا گیا۔ ملایا میں بریگیڈ انٹیلیجنس آفیسر کے طور جنگی خدمات انجام دیں۔ برطانوی فوج میں کرنل ڈھلون آپ کے اسسٹنٹ تھے۔ جاپانیوں کے خلاف جی جان سے لڑے۔ سقوطِ سنگاپور ہو گیا تو آزاد ہند فوج سے وابستہ ہو گئے۔ بنکاک کانفرنس میں اسیر ہندوستانی فوج کی نمائندگی کی سپریم ہیڈ کوارٹر کی۔ ایڈمنسٹریشن برانچ

کے انچارج آفیسر مقرر کیے گئے، پھر آپ کو آفیسرز ٹریننگ اسکول کا کمانڈر مقرر کر دیا گیا، بلکہ اس اسکول کی بنیاد رکھنے والے ہی آپ تھے۔ میدان کارزار کے دشوار مرحلوں میں اپنی ہمت کا لوہا منوالیا، اور سبھاش بابو کے معتمد علیہ بن گئے۔ عارضی حکومت میں منسٹر بنائے گئے۔ کئی دفعہ چیف آف دی سٹاف کا عہدہ سنبھالا۔ جب نیتاجی برما کو چھوڑنے لگے تو آپ اُن کے پرنسپل اسسٹنٹ کی حیثیت سے ہوائی طیارے میں ساتھ گئے اور جب اس طیارے کو حادثہ پیش آیا تو آپ بھی شدید زخمی ہوئے۔ مئی ۱۹۴۶ء دہلی سے رہا کر دیے گئے آپ کو آزاد ہند فوج میں کرنل کا عہدہ حاصل تھا۔ اقبال نے آپ ایسے نوجوانوں کے لیے ہی کہا ہے:

ضرورت مجھے اُن جوانوں کی ہے
ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند

لفٹینٹ کرنل ڈھلون

پورا نام گورنجش سنگھ ڈھلون ہے۔ آپ کے والد سردار ٹھاکر سنگھ ڈھلون نے ۳۲ برس تک فوجی ملازمت کی۔ تین بھائی اور ہیں، دو فوج میں اور ایک محکمۂ جنگلات میں ملازم ہے۔ آپ کا آبائی وطن چک نمبر ۳۲، ڈاکخانہ چھانگا مانگا، تحصیل چونیاں، ضلع لاہور ہے۔ مارچ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے تو مختلف مدرسوں میں، دسویں تک تعلیم پائی، پھر گارڈن مشن کالج راولپنڈی میں داخل ہو گئے۔ یہاں مختلف مذاہب سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور روایتی تعصب جاتا رہا۔ طبیعت کا میلان، میڈیکل تعلیم کی طرف تھا، لیکن ایف ایس سی کے امتحان میں کامیاب نہ ہو سکے۔ والد نے دوبارہ مجبور کیا۔ کامیابی کا رشتہ پھر بھی ہاتھ نہ آیا۔ آخر فوج میں بھرتی ہونے کی، خواہش ظاہر کی والد مان گئے۔ ۲۹ر مئی ۱۹۳۳ء کو بطور سپاہی بھرتی ہوئے۔ آپ کی پلٹن کا کمانڈر ایک سکھ صوبیدار تھا، جو ضلعی تعصب میں مبتلا تھا اور ان پڑھ ہونے کے باعث آپ سے خار کھاتا تھا۔ ایک مسلمان صوبیدار ہیڈ کلرک نے آپ کی اعانت کی ... سے ترقی کا راستہ مل گیا، لیکن شخصی کانٹوں نے بھی دامن نہ چھوڑا۔ اِدھر غریبی نے دنیا

اداس کر دی، ارادہ ہوا نوکری چھوڑ دی جائے، لیکن والد نے ڈھارس بندھائی۔ حالات کی انھی ٹھوکروں میں ڈیرہ دون ملٹری کالج تک رسائی ہو گئی اور کمشنز آفیسر بن گئے۔ انھی ایام میں آپ کو تجربے سے یہ معلوم کر کے دکھ ہوا کہ برطانوی اور ہندوستانی آفیسروں میں امتیازی حدیں قائم ہیں۔

جنگ چھڑ گئی تو آپ کو جاپانی محاذ کی طرف بھیج دیا گیا جہاں مختلف مہمات میں جان توڑ حصہ لیا، اتحادی فوجوں کو شکست ہو گئی تو آپ بھی دوسروں کی طرح جنگی قیدی بنائے گئے، یہاں جنرل موہن سنگھ کے ساتھ ہو گئے اور پہلی آزاد ہند فوج میں شرکت کر لی، پھر یہ فوج خاص مشکلات میں محصور ہو کر جاپانی آفیسروں کی رائے کے تصادم سے ٹوٹ گئی وہ مشکلات آپ کے الفاظ میں حسب ذیل تھیں۔

(۱) احساس ہزیمت اور فقدان ایثار۔

(۲) اخلاق اور نظم کی کمی۔

(۳) فرقہ وارانہ اثرات۔

(۴) موہن سنگھ کا چھوٹا فوجی درجہ۔

(۵) جاپانی دخل اندازی۔

(۶) برطانیہ کے حامی افراد۔

(۷) خود غرض اور موقعہ پرست لوگ۔

سبھاش بابو کی آمد پر اپنے نمایاں کارناموں سے اور بھی نمایاں ہو گئے اور مختلف معرکوں میں عظیم الشان پامردی کا ثبوت بہم پہنچایا، نہرو بریگیڈ کے کمانڈر بھی رہے اور آزاد ہند فوج میں ترقی کر کے لفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر پہنچ گئے۔ آپ کی زندگی پر اس سلسلے میں جنرل موہن سنگھ کا گہرا اثر ہے اور ہمیشہ گفتگو میں ان کی خوبیوں کو سراہتے ہیں۔

۱۷ مئی ۱۹۴۵ء کو پیگو میں گرفتار ہو گئے اور وہاں سے ۵ / جولائی ۱۹۴۵ء کو دہلی کے لال قلعے میں لایا گیا۔

ڈھلون ایک معیاری سپاہی ہے، جو بہادری کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ اس کا ذوق رزم آرائی مہابھارت کی جنگ کے اجلے تصور سے تیار ہوا ہے۔

میجر جنرل شاہنواز

جنوری ۱۹۱۴ء کو، جنجو راجپوت خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی وطن موضع مٹور ضلع راولپنڈی ہے، آپ کے والد لفٹیننٹ ٹکا خاں نے تیس برس تک فوجی ملازمت کی، آپ کا خاندان ہندوستان بھر میں، اپنی فوجی روایات کے باعث یگانہ ہے۔ اس وقت بھی آپ کے ساٹھ رشتہ دار فوجی ملازمت کی سلک میں منسلک ہیں۔ ۱۹۲۳ء میں آپ کے والد رحلت کر گئے اور آپ دادا چچا کی سرپرستی میں آ گئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں پائی اور ۱۹۲۶ء میں ملٹری کالج ڈیڑھ دودن میں داخل ہو گئے۔ ۳۲ء میں فوجی امتحان پاس کر لیا اور مختلف انعام پائے۔ ۳۵ء میں انڈر آفیسر بن گئے، فروری ۱۹۳۷ء میں ۱۴ ارجمنٹ جہلم کے ماتحت آفیسر مقرر ہوئے اور پھر جلد ہی وزیرستان کی جنگ کو چلے گئے۔ وہاں سے ۱۹۳۹ء میں فیروز پور آ گئے اور کمپنی کمانڈر بنائے گئے۔ ۲۹ جنوری ۱۹۴۲ء کو سنگاپور بھیجے گئے، یہاں ایک دو معرکوں میں جاپان سے تصادم ہوا، پندرہ فروری کو اپنے آفیسر کے حکم سے جاپانی حراست قبول کر لی، پھر ایک عرصے کے غور و فکر کے بعد آزاد ہند فوج میں شامل ہو گئے۔ سبھاش بابو کی آمد نے آپ کے خیال پر گہرا اثر ڈالا۔ سبھاش رجمنٹ کے کمانڈر رہے، عارضی حکومت میں آپ کو وزیر بنا دیا گیا، مختلف محاذوں پر لڑتے رہے اور خوب خوب داد شجاعت دی۔ سبھاش بابو اور جاپانی ہائی کمان نے آپ کو مبارک باد کے تار بھیجے آپ نے آزاد ہند فوج میں مختلف مدارج و مناسب حاصل کیے آپ کو سبھاش بابو نہایت عزیز رکھتے تھے۔ برطانوی فوج میں آپ کا عہدہ کپتان کا تھا آزاد ہند فوج میں لفٹیننٹ سے میجر جنرل کے عہدے پر پہنچ گئے۔

آپ نے انتخابی مہم میں کانگرس کو بےحد فائدہ پہنچایا ہے، آج کل آزاد ہند فوج کی ریلیف کمیٹی کے انچارج ہیں۔ آپ کی تقریر میں خطیبانہ شکوہ نہ ہونے کے باوجود ایک رس ہوتا ہے، جس کو آپ بیتی کی سرامتی جرعہ کشوں کے لیے شراب دو آتشہ بنا دیتی ہے، سبھاش بابو کا نام آتے ہی آپ کی پلکیں بھیگ جاتی ہیں اور طبیعت مضطرب سی ہو جاتی ہے، یہ خلوص و فطرت کا تقاضہ ہے۔

کانگرس نے آپ کو اپنی رضا کارانہ تنظیم کا جنرل آفیسر کمانڈنگ [illegible] ہے آپ ان دنوں ملک کی آیندہ جنگ آزادی کا دیباچہ تیار کرنے میں مشغول ہیں۔ شا[illegible] تلو[illegible] ی شوخی ہے جو انسانی قامت ڈھلی ہوئی ہے۔

میجر جنرل عزیز احمد خاں

آپ کپور تھلہ ریاست میں بیگووال کے باشندے ہیں۔ آپ کا خاندان امارت اور شکوہ کے اعتبار سے راجپوتوں میں یگانہ سمجھا جاتا ہے۔ آپ بہت بڑے زمیندار ہیں۔ آپ کے والد اخلاق اسلاف کی شمع فروزاں ہیں۔ آپ کے ایک بھائی ریاست میں سشن جج ہیں، دوسرے بڑے بھائی چودھری عبدالعزیز بیگووالیہ انتقال کر چکے ہیں۔ وہ ریاستی پنجاب کے ایک مایہ ناز راہنما تھے۔ کپور تھلہ میں بہت سی اصلاحات مرحوم ہی کی مساعی کا نتیجہ ہیں۔

آپ ریاستی فوج میں کپتان کے عہدے پر تھے، جاپان کی لڑائی میں خاصی ناموری حاصل کی، سقوط سنگاپور کے نتائج نے آپ کو بھی ''آزاد ہند فوج'' میں شمولیت پر مجبور کر دیا۔ آزادیِ ہند کا ذوق موروثی تھا، موج مضطر کی طرح آگے بڑھے اور اپنی بہادری و کارگذاری کے طفیل سبھاش بابو کے معتمد علیہ بن گئے اور میجر جنرل کا عہدہ پالیا، آپ آزاد ہند فوج کے ان گنے چنے آفیسروں میں سے تھے، جن سے یہ سارہ ڈھانچا عبارت تھا۔ آپ کو [illegible] ما کی [illegible] ندو[illegible] انی آبادی کا گورنر مقرر کیا گیا۔

وقت کی ارزاں بخشیوں نے حالات کی جدید رو میں بعض ناموں کو آگے پیچھے کر دیا ہے، ورنہ آپ کا درجہ آزاد ہند فوج میں اُن دو تین لوگوں کے ساتھ تھا، جن کی بصیرت پر سبھاش بابو کو بھروسا تھا۔ آپ عارضی حکومت کی کابینہ کے ممبر بھی تھے۔ ۵ رمئی ۱۹۴۶ء کو دہلی سے رہا کر دیا گیا۔ آپ ایک رعنا جوان اور دلکش سیرت کے مالک ہیں۔

قدرت نے آپ کے انسانی لبادے میں ایک برق بے امان بھر دی ہے، جو قصرِ غلامی پر کو[illegible] لیے ہر لمحہ بیتاب رہتی ہے۔ اقبال نے ایسے نوجوان ہی کے متعلق کہا تھا:

اگر ہو جنگ تو شیرانِ خاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

کیپٹن لکشمی

صبا کالوچ جو تلوار کی دھار بن گیا ہے۔ کیپٹن لکشمی لوکاناتھن مدراس کے ایک ایسے گھرانے کی بیٹی ہے، جس کے صبح و شام نغمہ و شعر کی بہتی ہوئی آگ سے گداز ہوتے رہے ہیں۔ آپ کے والد مدراس کے ایک کامیاب بیرسٹر تھے، جو آپ کی کم سنی کے زمانے ہی میں رحلت کر گئے۔ قدرت نے دولت سے ان کا دامن بھر دیا تھا، آپ کی والدہ شریمتی رمولا بائی، جو اب مرکزی اسمبلی کی ممبر ہیں، جدید تہذیب کی انتہائی دلدادہ تھیں، آپ کا محل نما مکان، بہترین شاعروں، مصوروں، موسیقاروں اور فن کاروں، کی خاطر مدارات کے لیے مشہور تھا، لکشمی، انھیں میں کھیلی، پلی اور بڑھی، کہا جاتا کہ آپ کی طفولیت کا زمانہ ایسے دریا کی طرح گزرا جو خاموشی سے بہتا ہو، جوانی میں دلکشی چودھویں کے چاند کی طرح نکھری گئی ساحل کناروں پر موٹر چلاتی، اور شانوں پر سیاہ گیسو لہراتے ہوئے یوں گزر جاتی، جیسے کوئی ابر پارہ مے خانہ سے ہو کر گزر گیا ہو۔ حصولِ تعلیم کا ذوق فطرت کا جزو تھا انٹر میڈیٹ کے امتحان میں کامیابی حاصل کر کے میڈیکل کالج میں داخل ہو گئیں بہت سے لوگوں نے شادی کی خواہش ظاہر کی، لیکن آپ نے در خود اعتنا نہ سمجھا اسی اثنا میں منگلور کے ایک ماہر پرواز برہمن زادے سے آنکھیں چار ہوئیں، دونوں طیاروں کی سیر کا حظ اُٹھاتے آہستہ آہستہ تعلقات پھیل کر ازدواجی زندگی میں محصور ہو گئے۔ اتنے میں آپ نے مدراس میڈیکل کالج سے ڈاکٹر کی سند حاصل کر لی۔ اور پھر جب ازدواجی زندگی کا شیشہ مکدر ہو گیا تو سنگاپور چلی گئیں اور وہاں ڈاکٹر کے طور پر پریکٹس شروع کر دی۔ اس سے پہلے آپ انگلستان بھی ڈاکٹری تعلیم کے خیال سے گئیں، لیکن اس آباد ویرانے میں طبیعت نہ لگی اور لوٹ آئیں۔

جب سنگا پور جاپانیوں کی دستبرد میں آگیا تو آپ نے شہر کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ عام طور پر یہ سمجھا گیا کہ آپ جاپانیوں کی قید میں ہیں، لیکن جب سی گاؤں سے عارضی حکومت کی خبر نشر کی گئی تو آپ کا نام بھی کیبنٹ میں تھا۔

آپ کو رانی جھانسی رجمنٹ کا کمانڈنگ آفیسر بنایا گیا۔ آپ نے ہندوستانی عورتوں کی ایک بہت بڑی فوجی جمعیت تیار کی، ہسپتال میں زخمیوں کا علاج کیا اور میدان جنگ میں کندھے پر بندوق لٹکا کر اتحادی سپاہ کا رخ پھیرا۔

فوجی وردی میں آپ کی جو تصویریں، مختلف اخباروں میں چھپی ہیں، ان میں ایک تصویر رانی جھانسی رجمنٹ کے مارچ کرنے کی بھی ہے۔ پیچھے پیچھے نوجوان لڑکیاں بندوق اُٹھائے اور قدم بڑھائے آرہی ہیں۔ آگے آگے آپ خنک چشمہ لگائے فوجی سلام کرتے ہوئے دکھائی دیتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی خوش خرام ندی، طوفانی ارادہ لیے بڑھ رہی ہے اور خوشبو کا آبشار بہہ رہا ہے، ترنگے جھنڈے کی اُڑانیں اس پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔

کپتان لکشمی! معلوم ہوتا ہے کسی یونانی شاعر کا خواب، موسیقی کی رنگت اڑا کر عورت کے لباس میں منتقل ہو گیا ہے۔

اتحادی فوجیں رنگون میں داخل ہوئیں، تو آپ وہیں تھیں۔ رانی جھانسی رجمنٹ کو کچھ دن پہلے توڑ دیا گیا تھا اور بیشتر عورتیں ملایا روانہ کر دی گئی تھیں۔ آپ کو بھی برطانی سرکار نے گرفتار کر لیا، لیکن آخر کار رہا کرنا پڑا۔ اپریل ۱۹۴۶ء کے تیسرے ہفتے میں آپ طیارے پر ہندوستان آگئیں اور اجکل اپنی ماتا کے پاس مدراس میں مقیم ہیں۔ پچھلے دنوں اخباروں میں یہ خبر آئی تھی کہ آپ کی شادی کرنل سہگل سے ہونے والی ہے مگر آپ نے اس کی تردید کر دی ہے۔

ہندوستان اپنی تاریخ کے اس سرمایہ کو آسانی سے نہیں بھلا سکتا۔

کرنل لوگاناتھن

آپ صوبہ دہلی میں ہیلتھ آفیسر تھے۔ جنگ شروع ہوئی تو فوج میں طبی خدمات پر چلے گئے۔ ۱۵؍ فروری ۱۹۴۲ء کو سنگاپور بھیجا گیا۔ ہسپتال کے انچارج رہے اور لفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر کام کیا۔ ستمبر ۱۹۴۳ء میں "آزاد ہند فوج" میں شامل ہو گئے اور عارضی حکومت کے منشور، پر کابینہ کے رکن کی حیثیت سے دستخط کیے، بنکاک کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ آپ کو آزاد ہند حکومت میں ڈائریکٹر آف میڈیکل سروسز بنایا گیا۔ انڈیمان کے جزائر جب آزاد ہند حکومت کی تحویل میں دے دیے گئے تو آپ کو وہاں کا پہلا چیف کمشنر مقرر کیا گیا جب سبھاش بابو نے آخری دفعہ برما کو چھوڑا تو آپ کو برما کمانڈ کا جنرل آفیسر کمانڈنگ بنایا گیا۔

جنرل موہن سنگھ

سرو قد نوجوان، جس کی پیشانی پر یقین کا خلوص، اور آنکھوں میں "ٹوٹ تو سکتا ہوں لیکن میں لچک سکتا نہیں" کی جھلک بشرے پر تلوار کی ہنسی، سیالکوٹ پنجاب کے ایک گاؤں کا باشندہ برطانوی امتیازات کا پہلا باغی اور آزاد ہند فوج کا بانی

اگر آپ کو ملک میں سبھاش بابو کا سا مرتبہ حاصل ہوتا تو آپ کا نام اسی طرح گونجتا۔ آپ کی اٹھائی ہوئی نیو، جس پر کچھ جزدی حصے بھی بن گئے تھے، ایک پوری عمارت کے لیے راستے کی مشعل بن گئے۔ راش بہاری بوس کی پرو جاپان پالیسی سے اختلاف کیا اور جاپانی آفیسروں کی رائے کی مزاحمت کی، تو آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔

کرنل ڈھلون آپ کی شخصیت کو بے حد سراہتے ہیں۔ میں نے ان سے ایک سفری ملاقات میں دریافت کیا تھا کہ سبھاش بابو نے جنرل موہن سنگھ کی رہائی کے لیے کوشش کیوں

نہیں کی، وہ پہلے تو چپ ہو رہے اور پھر بکھرے ہوئے الفاظ میں ایک فقرہ کہہ گئے جو غالباً اس طرح ترتیب پاتا تھا، بیشتر آفیسر ذاتی رقابت کے خیال سے ایسا نہیں چاہتے تھے۔

آپ کو مئی ۱۹۴۶ء میں دہلی سے رہا کر دیا گیا۔ اکالیوں نے آپ کے معاملے کو فرقہ وارانہ رنگ دینا چاہا، لیکن آپ نے ہندوستان کی آزادی کے لیے غیر متحدہ اشکال کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

لفٹیننٹ ناگ

پورا نام ڈی سی ناگ، آغازِ جنگ سے پہلے بنگال میں مجسٹریٹ تھے، پھر فوج میں بھرتی ہو گئے۔ سقوط سنگاپور سے پہلے ہوائی حملے کے سبب زخمی ہو گئے، پھر قید کر لیا گیا۔ آپ نے کپتان مارتھر کی مدد سے کرنل بھونسلے اور کرنل حبیب الرحمن کے حسب الحکم آزاد ہند فوج کا ضابطہ تیار کیا۔

☆☆☆☆☆

۳۲۰۰ء

فیضانِ اقبال

علامہ اقبال کے افکار کا افشردہ اختصار
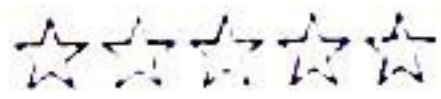
تالیف

آغا شورش کاشمیری (مرحوم)

تدوین

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

متن کی تصحیح، حوالہ جات و اقتباسات کی تخریج، شخصیات کے تعارف، مصادر کی تکمیل، سوانح مؤلف اور اہم اور بیش قیمت اضافہ جات

دوسرا ایڈیشن۔ بڑا سائز

پیش کش

مجلس یادگارِ شورش، پاکستان

کراچی

مجلس یادگارِ شیخ الاسلام پاکستانؒ

کی

چند یادگار مطبوعات

(۱) شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ - ایک سیاسی مطالعہ

(۲) شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ - ایک سیاسی مطالعہ

تالیفات

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

شیخ الاسلام کے مناقب و مقامات اور شخصیت و سیرت کے مطالعے کے لئے

(۳) مناقب شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

ترتیب

مولانا افضال الٰہی دیوبندی

تقدیم

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

قیمتیں: (۱)۔ ۹۰ روپے (۲)۔ ۱۰۰ روپے (۳)۔ ۹۰ روپے

ملنے کا پتا

مکتبہ رشیدیہ، عائشہ منزل، نزد مقدس مسجد، اردو بازار۔ کراچی

دار الکتاب، عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ فون ۷۲۳۱۱۸۰

"قلمی چہرے": شورش کاشمیری / ترتیب و تقدیم: ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری / قیمت ۲۲۵ روپے